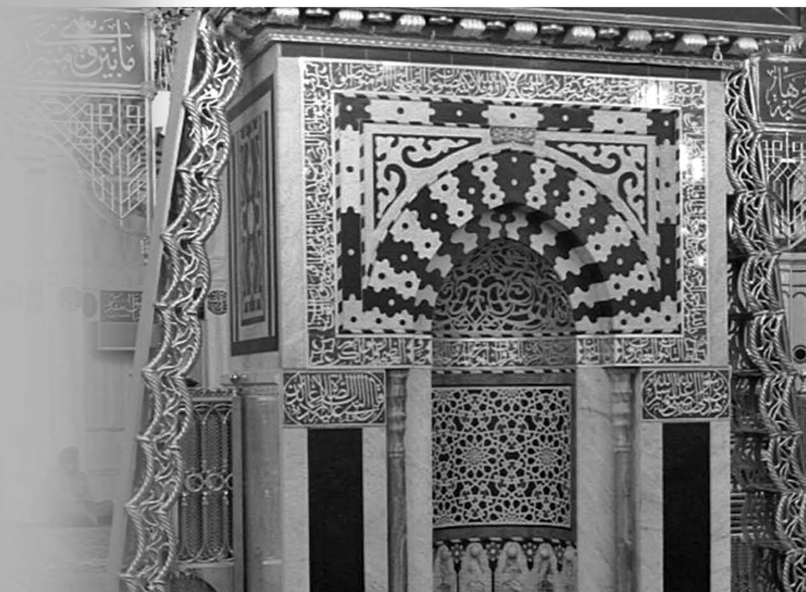
محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

قرآن وتاریخ کے آئینے میں

(اختصار کے ساتھ)



محدث کبیر، مورخ اسلام، مجاہد ملت

حضرت مولانا سید محمد میاں رح

مکّہ

محل وقوع۔۔۔۔اہمیت

دنیا کے وہ مقام جن کو بین الاقوامی تعلقات کے بارہ میں درمیانی کڑی (جنکشن) کی حیثیت حاصل تھی مکہ ایسے ہی مقامات میں ایک ممتاز مقام تھا۔

مکہ شہر بعد میں آباد ہوا مگر اس کے محل وقوع کی یہ حیثیت اس وقت سے تھی جب سے ہند، سندھ، افغانستان، ایران، یمن اور شام کے ممالک تمدن سے آشنا ہوئے تھے اور ابن آدم کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں نے اجناس و مصنوعات کے تبادلہ کا سلسلہ ایجاد کیا تھا۔

عرب کا یہ صوبہ جس میں مکہ شہر ہے اس کو حجاز کہا جاتا ہے کیونکہ یہ صحراءِ اعظم کے ریگ و بالو اور دو سمندروں (بحر احمر و بحر قلزم) کی موجوں کے درمیان قدرتی آڑ[1] (حجاب) ہے۔ حجاز نے بے شک سمندر کو صحراء عرب اور اس کے شمال مشرقی شہروں سے کئی سو میل دور ہٹادیا، مگر سمندر کا یہ قدرتی احسان ہے کہ اس نے حجاز کے ساتھ علیحدگی پسندی کا سلوک نہیں کیا۔ بلکہ پہلے تو عربوں کو جہاز رانی سکھائی پھر ان کے جہازوں کو اپنے سینہ پر چڑھا کر نہ صرف یمن، سندھ، مصر، افریقہ اور ایران بلکہ دنیا کے مشرقی کناروں (جزائر شرق الہند) تک پہنچایا۔ حجاز جس کا قلب مکہ ہے اس کی یہی اہمیت تھی جسکی وجہ سے اس پر قبضہ کے لئے تین ہم عصر سلطنتوں میں رقابت چلی آئی تھی (رومی، ایرانی اور حبشی) یہ تینوں اس پر قبضہ کے خواہشمند رہیں۔

روایت ہے کہ سکندر ذوالقرنین نے ضروری خیال کیا تھا کہ اس شہر کے معبد "خانہ کعبہ" کی زیارت کرے[2]۔ جدہ جو مکہ سے صرف پچاس میل کے فاصلہ پر حجاز کی بندرگاہ ہے جو فی زمانہ حجاج ہند کے استقبال کا عادی ہے۔ کہتے ہیں کہ جب نوع انسان کا گلہ وجود و حیات کی پہلی منزل میں تھا تو جدہ نے حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی اہلیہ محترمہ (حضرت حوا) کا استقبال بھی اسی شان سے کیا تھا جب وہ لنکا سے

---

[1] حجاز کے معنی آڑ ہیں۔

[2] البدایہ والنہایہ ص۱۰۵، ج۲۔

روانہ ہو کر ہندوستان سے گزرتے ہوئے سرزمین حجاز میں فروکش ہونے کے لئے مکہ جارہے تھے۔ جہاں انہوں نے پہلی بار خانہ خدا کعبہ کی بنیاد رکھی۔ یہ کعبہ طوفان نوح میں اٹھالیا گیا تھا پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہی بنیادوں پر دوبارہ تعمیر کیا۔(بحوالہ عہد زرین جلد اول)

بناء مکہ، بانی مکہ اور کعبہ

تقریباً ساڑھے چار ہزار سال پہلے کی بات ہے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام [1] نے شام سے آکر علاقہ حجاز کی ایک وادی غیر زرع (بنجر میدان) میں اپنے جگر گوشہ اسماعیل علیہ السلام کو آباد کیا۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد خدا کے گھر کی مٹی ہوئی بنیادیں ابھاریں۔ اس خانہ خدا کا نام کعبہ ہے اور جو شہر یہاں آباد ہوا وہ مکہ ہے۔

اس نونہال (حضرت اسماعیل علیہ السلام) کے ساتھ صرف اس کی ماں تھی۔ وہی اس چشمہ کی مالک تھی جو یہاں ان کی سکونت کے ساتھ ساتھ [2] بر آمد ہوا تھا۔

یہ چشمہ بر آمد ہوا تو ہاجرہ علیہا السلام سے اجازت لے کر یہاں قبیلہ جرہم [3] بھی آباد ہو گیا تھا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام جوان ہوئے تو ان کی شادی بھی اسی قبیلہ میں ہو گئی۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ہوئی تو عرب قدیم میں ایک نئی نسل کا اضافہ ہو گیا جس کو عرب مستعربہ [4] اور بنو اسماعیل کہا گیا۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام یہاں تنہا تھے۔ ایک ماں کے علاوہ نہ ان کا کوئی دادھیالی رشتہ دار تھا نہ نانھیالی۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام خدا کے نبی تھے۔ نبی کی اخلاقی اور روحانی تربیت خود قدرت کی جانب سے ہوتی ہے اور نظر بظاہر حضرت ابراہیم علیہ السلام مربی تھے وہ یہاں آتے رہتے تھے۔ بنو جرہم سے ان کو سماجی

---

[1] ہندوستان کی جنتا برہم کو پوری عظمت کے ساتھ مانتی ہے۔ مگر یہ نہیں بتا سکتی کہ "برہم" کون تھے۔ کوئی انسان تھے تو کہاں کے رہنے والے تھے اور ان کا مذہب و مسلک کیا تھا۔ مگر بائبل برہام، اور ابرہام کو موجودہ نسل انسانی کا باعظمت انسان، توحید کا علم بردار اول اور ان مذاہب کا ہادی اعظم مانتی ہے جو الہام، وحی اور نبوت رسالت کے قائل ہیں۔ قرآن حکیم نے بھی حضرت ابراہیم کو یہی حیثیت دی ہے۔

[2] حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی بیوی اور لخت جگر کو یہاں آباد کیا تو تھوڑے سے کھجور اور پانی کا ایک مشکیزہ توشہ میں دیا تھا چند روز بعد پانی ختم ہو گیا ماں سے پہلے بچہ پیاس کی وجہ سے لب دم ہو گیا تو قدرتی طور پر ایک چشمہ بر آمد ہو گیا اسی کا نام "زمزم" ہے جو اب خانہ کعبہ کے قریب کنویں کی شکل میں ہے۔

[3] اس قبیلہ کا اصل وطن یمن تھا۔ اب وہ الگ سرزمین اپنی آبادی کے لئے چاہتا تھا۔ یہ میدان اور چشمہ اس کے لئے نعمت غیر مترقبہ تھا جس نے اس قبیلہ کی مراد پوری کر دی۔

[4] یعنی جو پہلے عرب نہیں تھے اب عرب بن گئے۔ اور واقعہ بھی یہی ہے۔ کیوں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اگرچہ عربوں کی طرح اولاد سام میں سے تھے۔ مگر ان کا اصل وطن عراق تھا۔

راہ ورسم کی مدد ملی اور ادھر بنو جرھم پر حضرت اسماعیل علیہ السلام کے اخلاق کا یہ اثر ہوا کہ وہ ان کے معتقد ہوگئے پھر ان کا مسلک قبول کر لیا۔ توریت کی روایت کے بموجب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عمر ایک سو سینتیس ۱۳۷ سال ہوئی۔ ❶ اس عرصہ میں مکہ چند گھر کی آبادی کے بجائے پورا شہر بن چکا تھا اور کعبہ نے بھی مرکزی عبادت گاہ کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام اپنی قوم کے مقتدا بھی تھے اور کعبہ کے متولی بھی۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بارہ لڑکے ہوئے۔ ❷ اگر وہ سب مکہ میں رہتے تو بہت ممکن تھا مکہ میں ان کی اکثریت ہو جاتی مگر یہ صاحبزادگان جو اولوالعزم نبی کی اولاد تھے ان کا مطمح نظر اور نصب العین دعوت الی اللہ اور اصلاح خلق تھا۔ وہ اسی مقصد کو لے کر مکہ سے نکلے اور ملک کے مختلف علاقوں میں آباد ہوگئے۔ جہاں جہاں وہ پہنچے وہاں اس زمانہ کی گمراہیوں یعنی کواکب پرستی اور اصنام پرستی وغیرہ کے مقابلہ میں خدا پرستی کا علم بلند ہو گیا۔ ❸

مکہ میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کے صرف ایک فرزند قیدار قیام پذیر رہے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد وہی خانہ کعبہ کے متولی ہوئے۔ پھر ان کی اولاد متولی ہوتی رہی اور سیاسی اقتدار ان کے ننھیال "بنو جرھم" کو حاصل رہا۔ کئی صدی تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر وہ وقت آیا کہ بنو جرھم اپنے اقتدار کے نشہ میں ایسے مست ہوئے کہ ان کو اولاد اسماعیل علیہ السلام کی اتنی مداخلت بھی گوارہ نہ ہوئی کہ وہ خانہ کعبہ کے متولی رہیں چنانچہ ان کو مکہ سے نکال دیا۔ اور اب مرکز توحید یعنی خانہ کعبہ پر بھی انہیں کا اقتدار ہو گیا۔

قریش اور قصی بن کلاب مصلح قریش

قریش کا تعارف:

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں تقریباً بیس پشت کے بعد ایک شخص مُضَر ہوا ہے۔ باپ کا نام "کنانہ" اس کی اولاد کو "قریش" کہا جاتا ہے۔

مضر کی آٹھویں پشت میں ایک شخص ہوا جس کا عُرفی نام قصی تھا (اصل نام زید، باپ کا نام کلاب، ماں کا نام فاطمہ بنت سعد) قصی بن کلاب کو قوم نے مُجَمِّع کا خطاب دیا۔ اس کی پانچویں پشت میں فخر

---

❶ توریت (بائیبل قدیم) باب پیدائش ب ۲۵، فقرہ ۱۶، ۱۷

❷ ایضاً

❸ سیرۃ ابن ہشام ص ۷۲، ج ۱

موجودات، سید الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کا ظہور اقدس ہوا۔ سلسلہ نسب یہ ہے: محمد ﷺ بن عبد اللہ بن عبد المطلب بن ہاشم بن عبد المناف بن قصی۔

قصی اور تولیت کعبہ:

قصی بچپن ہی میں باپ کے سایہ سے محروم ہو گیا تھاماں نے قبیلہ بنی عذرہ کے ایک شخص سے جس کا نام ربیعہ بن حرام تھا دوسرا نکاح کر لیا۔ بنو عذرہ، شمال عرب کے حدود میں شام کے قریب سرغ میں آباد تھے۔ قصی نے ماں کی آغوش میں یہیں پرورش پائی۔ ہوش سنبھالا تو وطن اور نسل کی جستجو ہوئی ۔کچھ سراغ لگا تو یہ مکہ پہنچا۔ وہاں بڑے بھائی سے ملاقات ہوئی جس کا نام زہرہ تھا۔ جو بوڑھا ہو چکا تھا اس کی بصارت بھی جاتی رہی تھی۔ ❶

مکہ پر بنو جرھم کے بعد اب قبیلہ خزاعہ کا قبضہ تھا۔ قصی نے یہیں بودوباش شروع کر دی اور یہاں تک تعلقات بڑھائے کہ خانہ کعبہ کے متولی ❷ نے اپنی لڑکی کا نکاح قصی سے کر دیا۔

قصی نے قریش کے انتشار کو ختم کر کے ان کو ایک مرکز پر جمع کیا، اس لئے اس کا لقب ❸ مجمع ہو گیا۔ ❹ قص بنو خزاعہ کے مقابلہ پر ایک مضبوط محاذ قائم کر کے چند ایک مقابلوں کے بعد قریش کا مکہ پر تسلط قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا اور اس طرح کئی ہزار سال کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ بنو اسماعیل کو مکہ پر سیاسی اقتدار حاصل ہوا۔

سیاسی رابطہ:

شام کے قریب جو عربی قبائل آباد تھے اگرچہ وہ خود مختار تھے مگر بازنطینی شہنشاہیت (سلطنت روم) کے زیر اثر تھے۔ کچھ قبیلوں نے عیسائی مذہب بھی قبول کر لیا تھا۔ قصی اس علاقہ میں بڑھ کر جوان ہوا تو اس کی بلند پرواز فطرت نے اس کو شہنشاہ روم تک پہنچا دیا۔ بنو خزاعہ کی جنگ میں قیصر روم (بازنطینی شہنشاہ) کی حمایت بھی قصی کو حاصل تھی اور بقول ابن قتیبہ قیصر روم نے اس کو کمک بھی پہنچائی تھی ❺ یہ بھی ایک گٹھ جوڑ تھا۔

بین الاقوامی سیاست کبھی بھی اپنے مفادات کے تحفظ سے آزاد نہیں رہی ہے۔ بظاہر منشاء یہ بھی

---

❶ ابن سعد ص ۷۳، ج ۱

❷ حلیل بن حبشیہ خزاعی، لڑکی کا نام جبی، البدایہ والنہایہ ص ۲۱۰، ج ۲

❸ معارف ابن قتیبہ

❹ ابن سعد ص ۴۰، ج ۱

❺ داعانہ قیصر علیہا، معارف ابن قتیبہ ص ۲۱۵ ملوک الشام

تھا کہ عرب کے اندر اپنے اثرات بڑھائے اور ہندوستان سے خشکی کی راہ سے ہونے والی تجارت کے گذر گاہ کو اپنی نگرانی اور حفاظت میں لے لے۔

قصی نے مکہ پر قبضہ کیا تو شہر مکہ کی تعمیر جدید کا منصوبہ بھی تیار کیا۔ کعبہ کے اطراف میں موجود اس جنگل کو صاف کرایا جو خانہ کعبہ کے احترام میں جھاڑیوں کی صورت میں صدیوں سے موجود چلا آرہا تھا۔ لوگوں کے وہم کو دور کرنے کے لئے سب سے پہلے خود کلہاڑا چلایا اور اعتراض کا جواب یہ دیا کہ ہمارا مقصد آبادی ہے۔ بربادی مقصود ہو تو بے شک درخت کاٹنے ممنوع ہیں۔ ❶ پھر ایک خاص نقشہ کے ساتھ مکہ کو آباد کرنا شروع کیا۔ خالی اراضی کے پلاٹ بنائے اور قریش کے ہر ایک خاندان کو ایک پلاٹ دے دیا۔ یعنی ہر قبیلہ کی الگ کالونی آباد کر دی۔ انہیں کالونیوں کے محل وقوع کے لحاظ سے قریش ظواہر اور قریش بطاح کی اصطلاحیں ایجاد ہوئیں۔ ❷

اس عقیدے کو بھی ختم کیا کہ خانہ کعبہ کے قریب مکان نہ بنائے جائیں بلکہ قریش کے کچھ خاندان یہاں آباد کئے اور کچھ خاندان شہر کے بیرونی حصہ میں۔ البتہ یہ ہدایت کر دی کہ کعبہ کے قریب دوسری منزل تعمیر نہ کی جائے۔ ❸

اس جدید نقشہ میں خانہ کعبہ وسط میں رہا۔ خانہ کعبہ کے گرد بہت وسیع میدان چھوڑ دیا گیا۔ محلوں (کالونیوں) کے بیچ میں راستے رکھے گئے۔ یہ راستے (سڑکیں) خانہ کعبہ کے میدان پر آکر ختم ہوتے تھے۔ ان میں وہ سڑک بھی تھی جس کو "طریق ابی شیبہ" کہا جاتا تھا۔ یہ سڑک بہت وسیع اور سب سے زیادہ چالو تھی۔

وہی قصی جس کا بچپن یتیمی میں گذرا تھا اس انقلاب کے بعد اپنی قوم کا سب سے بڑا شخص تھا۔ وہ گویا پوری قوم کا مالک تھا جس کی عظمت دلوں کی گہرائیوں تک پہنچی ہوئی تھی۔ ❹ یہاں تک کہ لوگ اس سے برکت حاصل کیا کرتے تھے۔

قوم کے پاس پہلے سے کوئی دستور العمل یا قانون نہیں تھا تو اسی کا قول قانون ہوتا تھا۔ اور نہ صرف زندگی میں بلکہ بقول ابن سعد اس کے مرنے کے بعد بھی اس کے قول کی ایسی ہی تعظیم کی جاتی تھی جیسے کسی مذہبی حکم کی ❺ مگر نہایت عجیب اور دور حاضر کے سیاست دانوں کے لئے بہت زیادہ قابل

---

❶ ابن سعد ص ۰ ۴ ج ۱

❷ ابن سعد ۰ ۴ ج ۱

❸ احمد السباعی ص ۴۴

❹ ابن سعد ص ۰ ۴ ج ۱

❺ ابن سعد ص ۳۹ ج ۱

قدر اور سبق آموز بات یہ ہے کہ اس تمام عظمت اور اقتدار کے باوجود قصی نے نہ تاج شاہی سر پر رکھا نہ اپنے آپ کو بادشاہ کہلوانا پسند کیا۔ اس نے اپنے رسمی اعزاز اور اپنی وجاہت و عظمت کے مقابلہ میں ابراہیمی عظمت توحید اور قوم کی روایات اور ان کے اطوار کا احترام کیا۔ حریت اور آزادی اس قوم کا وہ جوہر تھا جس نے کبھی بھی کسی شاہ یا شہنشاہ کے سامنے اس قوم کی گردن نہیں جھکنے دی تھی۔ قصی نے تخت سلطنت اور تاج شاہی کے مقابلہ میں اس جوہر کو محفوظ رکھنے اور ترقی دینے کی کوشش کی۔ اس سے بڑھ کر اپنی قوم کے ساتھ اخلاص کیا ہو سکتا ہے کہ اس نے دربار شاہی کے بجائے دارالندوہ تعمیر کیا اور اس کا ایسا نظام بنایا جس کے لئے جمہوری کے علاوہ اور کوئی لفظ مناسب نہیں ہو سکتا۔ جس میں فرد یا شخص کی نہیں بلکہ نظام کی تعظیم تھی اور ملوکیت یا شخصی اقتدار سے یہاں تک اجنبیت تھی کہ نہ دارالندوہ کا کوئی صدر (چیئرمین) تھا نہ اس جمہوری نظام میں صدر کا کوئی عہدہ تھا۔ بہت سے فرائض، پورٹ فولیو تھے جو مختلف قبائل پر تقسیم کر دیئے گئے تھے۔ قبیلہ کا سربراہ اس فریضہ کا ذمہ دار ہوتا تھا۔

مکہ کی شہری ریاست

جدید تنظیمات

نادی۔ دارالندوہ۔ شعبے اور منصب

دیہات میں اور قصبات کے محلوں میں ایسے مکانات ہوتے ہیں جن کو چوپال کہا جاتا ہے۔ یہ عموماً محلہ یا گاؤں کے بڑے آدمی کی حویلی کا مردانہ حصہ ہوتا ہے جس میں گاؤں یا محلہ والوں کو اجازت ہوتی ہے کہ وہ کوئی تقریب منائیں کوئی مشاورتی اجتماع یا تفریحی مجلس کریں۔ چوپال میں وعظ کے جلسے بھی ہوتے ہیں بیاہ شادی کی تقریبات بھی۔ مشاعرے اور ادبی مجلسیں بھی ہوتی ہیں اور کبھی رقص و سرود کی رنگین محفلیں بھی جمتی ہیں۔ (جدید دور میں کمیونٹی سینٹر اس کے متبادل بنے ہیں۔)

چوپال ایک بڑا ہال ہوتا ہے اور موجودہ زمانہ میں بھی عموماً دیہات میں یہ ہال خام ہوتا ہے یعنی دیواریں مٹی یا کچی اینٹوں کی ہوتی ہیں اور چھت کڑیوں کی۔ بیچ میں شہتیر (اور دور حاضر میں گاڈر) رکھ دیا جاتا ہے اور اس کے اوپر دو طرفہ کڑیاں ہوتی ہیں اس وجہ سے اس کو دو کڑیہ بھی کہتے ہیں۔ غالباً اسی وجہ سے مدینہ والے اس کو سقیفہ کہتے تھے مگر مکہ معظمہ میں اس کے لئے نادی [1] کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔

نادی (مقاصد اور فوائد)

جو کام ہمارے یہاں چوپالوں میں ہوتے ہیں وہ ان اندیہ (نادیوں) میں بھی ہوا کرتے تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ:

(۱) سلسلہ نسب کے بارے میں کوئی اعلان ہوتا تھا تو وہ ان نادیوں میں کیا جاتا تھا۔

---

[1] نادی۔ ندیٰ سے ماخوذ ہے۔ نَدی کے معنی ہیں رطوبت، تراوٹ اسی سے نداء بمعنی آواز بھی ماخوذ ہے کہ جس کے حلق میں تراوٹ زیادہ ہوتی ہے اس کی آواز بلند ہوتی ہے۔ نادی، میں جام و سبو کی تراوٹ بھی رہا کرتی تھی اور داد و دہش کی سیرابی بھی اور جس طرح بحث و مباحثہ میں آوازیں بلند ہوتی تھیں، شعراء کے ترنم اور مغنیوں کے طرب انگیز نغمے بھی ہوتے تھے۔ یہی مناسبتیں وجہ تسمیہ ہی۔

(۲) قبیلہ میں داخل کر لینے کا ایک خاص قاعدہ اور رواج تھا۔ جس کو داخل کرتے تھے وہ مولی کہلاتا تھا اور جو معاہدہ اس سے ہوتا تھا اس کو عقد موالات کہا کرتے تھے۔ یہ عقد موالات نادیٰ ہی میں ہوتے تھے۔

(۳) عقد موالات کے برعکس خلع یا طرد کا اعلان بھی اسی نادیٰ میں ہوتا تھا یعنی جس کو مولیٰ بنایا گیا تھا اگر وہ معاہدہ کی پابندی نہ کرتا یا اپنے عمل اور کردار میں غلط ثابت ہوتا تو اس کو قبیلہ سے خارج بھی کیا جاسکتا تھا۔ اس کو خلع کہتے تھے (الگ کر دینا)۔ اور طرد کا لفظ بھی اس کیلئے استعمال کرتے تھے (دھکے دے کر نکال دینا)۔ یہ شخص خلیع، مخلوع یا مطرود کہلاتا تھا۔

(۴) خرید و فروخت کے اہم معاملات تجارتی کاروانوں کا استقبال اور ان کی روانگی کی تقریب۔

(۵) تفریحی مجلسیں، رات کو قصہ خوانی (مسامرہ) رقص و سرود اور سوانگ (ڈرامے) بھی نادیٰ میں ہوا کرتے تھے۔

نظم و نسق کے لحاظ سے یہ نادی قبیلہ کی ہیئت حاکمہ اور شیخ قبیلہ کی اجتماعی طاقت ہوتی تھی۔ ہر ایک نادی کے ساتھ ایک اعلانچی بھی ہوتا تھا جس کو موذن، منادی یا نقیب کہا کرتے تھے۔

دارالندوہ:

قبیلہ وار نظام کی طرح پورے شہر کا کوئی مرکزی نظام نہیں تھا۔ ضرورت کے وقت عام اجتماع ضرور ہو جاتے تھے مگر ان کا کوئی ضابطہ تھا، نہ کوئی جگہ ان کے لئے متعین تھی۔ مصلح قصی کا قابل فخر کارنامہ یہ تھا کہ اس نے شہری اجتماع کا ایک نظم اور ضابطہ مقرر کیا۔ اپنا مکان جو اس نے کعبہ کے شمالی میدان میں اس طرح بنایا تھا کہ اس کا دروازہ مسجد حرام کی طرف تھا، مرکزی نظام کے لئے عام کر دیا اور دارالندوہ اس کا نام رکھا۔

دارالندوہ کے ضابطے:

ندوہ کمیٹی یا مجلس کو کہتے ہیں۔ یہ کمیٹی جس کے نام پر یہ دارالندوہ تھا اس کی تشکیل کا ضابطہ ہمارے علم میں نہیں ہے۔ قیاس یہ ہے کہ قبائلی مجالس (نادیٰ) کے شیوخ اور سربراہ اس کے ارکان ہوتے تھے۔ البتہ ارزقی نے اخبار مکہ [1] میں اور ابن درید نے کتاب الاشتقاق [2] میں تصریح کی ہے کہ دارالندوہ کے اجلاس میں صرف وہی لوگ شریک ہو سکتے تھے جن کی عمر کم سے کم چالیس سال ہوتی

---

[1] اخبار مکہ ص ۷۰ اج ۱

[2] کتاب الاشتقاق ص ۹۷

تھی۔ صرف دارالندوہ کے بانی (قصی) کی اولاد اس شرط سے مستثنیٰ تھی [1]

اجلاس کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا جب ضرورت ہوتی اجلاس کر لیا جاتا تھا۔ دارالندوہ کا منتظم اجلاس کا داعی ہوتا تھا، صدر کوئی مقرر نہیں تھا۔

دارالندوہ میں انجام پانے والے کام:

(۱) شہر مکہ اور قوم قریش سے تعلق رکھنے والے معاملات کے متعلق مشورے اور فیصلے [2] (۲) کسی قبیلہ یا گروہ سے جنگ یا صلح کے فیصلے (۳) مدافعتی تدابیر (۴) جنگ کے وقت علمبردار کا تقرر (۵) تجارتی معاہدات (۶) بیرونی مہمانوں کا استقبال (۷) قصی کی شخصیت سے برکت حاصل کرنے کے لئے شادی کی تقریبات بھی یہاں ہوا کرتی تھی (۸) قافلوں کی روانگی اور واپسی پر ان کا استقبال بھی یہاں ہوتا تھا۔ (۹) ایک خاص رسم رائج تھی کہ جب لڑکی سن بلوغ کو پہنچ جاتی تھی تو اس کو درع پہنایا جاتا تھا (بڑا کرتا) اور چھوٹا کرتا اتروادیا جاتا تھا۔ یہ رسم بھی یہاں انجام دی جاتی تھی [3] (۱۰) قومی ملکیت کی چیزیں بھی یہیں محفوظ کر دی جاتی تھیں۔ [4]

مختلف شعبے اور منصب

مکہ جو صرف ایک شہر یا ایک آزاد ریاست نہیں بلکہ پورے عرب کا متبرک مرکز بھی یہی تھا، جہاں عرب کا مرکزی معبد کعبہ تھا۔ اس کے انتظامات کی جو صورتیں پہلے تھیں قصی نے ان کو باقی رکھا۔ ان کے علاوہ اور بہت سے شعبے قائم کئے، ان کے منصب اور منصبدار (عہدہ دار) مقرر کئے، کچھ شعبے اپنے پاس رکھے۔ تفصیل یہ ہے:

(۱) دارالندوہ۔ اس کا نظم و نسق مستقل شعبہ تھا جو قصی سے متعلق تھا اس کے بعد عبدالدار سے متعلق ہوا۔

(۲) مشورہ۔ یعنی مشاورتی اجتماع کا انتظام

(۳) حجابت۔ کلید برداری یعنی کھولنے اور بند کرنے کی ذمہ داری اور خانہ کعبہ کے اندر داخل ہونے کی

---

[1] کتاب الاشتقاق ص ۹۷

[2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کر دینے کا فیصلہ بھی یہیں کیا گیا تھا۔

[3] سیرۃ ابن ہشام ۱۷۹، ابن سعد ص ۳۹، ج ۱

[4] مثلاً غزوہ احد کی تیاری کے لئے جو تجارتی مال لایا گیا تھا اس کا نفع مصارف جنگ میں صرف کیا جائے گا وہ مال یہیں جمع رکھا گیا تھا۔ (ابن ہشام وغیرہ)

اجازت دینے کا اختیار۔

(۴) سدانت۔ دربانی، کھولنے بند کرنے اور صاف رکھنے کی خدمت۔ یہ کوئی مستقل منصب نہیں تھا بلکہ منصب حجابت ہی سے متعلق تھا۔

(۵) حرم کعبہ کا عام انتظام اور نگرانی۔ اس منصب کا ذمہ دار یہ نگرانی بھی رکھتا تھا کہ حرم میں شور و غل یا جھگڑا فساد نہ ہو۔

(۶) ایسار[1]۔ بتوں سے استخارہ یعنی فال لینا جس کا قاعدہ مقرر تھا۔

(۷) اموال محجرہ۔ یعنی محفوظ مال۔ خانہ کعبہ کو جو چڑھاوے چڑھائے جاتے تھے ان کی حفاظت کا شعبہ

۔

خانہ کعبہ میں ایک پختہ گڑھا کنوئیں کی طرح تھا۔ چڑھاوے کی طلائی اور نقرئی چیزیں اس کنوئیں میں ڈال دی جاتی تھیں۔ اسی کنویں کے کنارہ پر صنمخانہ کعبہ کا سب سے بڑا بت ہُبل تھا۔

حج سے متعلق:

رفادہ۔ حجاج کے کھانے کا انتظام:

قصی کا ایک کارنامہ یہ بھی تھا کہ جب اس نے قریش کو مکہ میں آباد کیا تو ان کے ذہن نشین کرایا کہ آپ محافظ اور خادم کعبہ ہیں۔ زائرین جو عرب کے کونہ کونہ سے آتے ہیں یہ آپ کے مہمان ہونے چاہئیں اور ان کے خوردونوش کا انتظام آپ کو کرنا چاہیے۔ یہ قریش کی عالی حوصلگی تھی کہ انہوں نے اس تجویز کو منظور کیا۔ اور پھر یہ طے ہوگیا کہ اپنی آمدنی کا ایک حصہ اس مقصد عظیم کے لئے جمع کرادیا کرینگے۔ تجارتی مال میں یہ حصہ کم سے کم عشر (دسواں حصہ) ہوتا تھا۔ بعض باحوصلہ اس سے بھی زیادہ دیدیا کرتے تھے۔ اس تجویز کی سیاسی مصلحت یہ تھی کہ:

(۱) عام عرب بنو خزاعہ کو بھول گئے جن سے قصی نے اقتدار چھینا تھا۔

(۲) قریش کے تسلط کو نعمت اور رحمت سمجھنے لگے۔

(۳) شہر مکہ اور حرم کعبہ میں قصی نے جو انقلاب برپا کیا تھا کہ عرب کے عقیدے کے خلاف جھاڑیاں اور درخت کٹوا کر قریش خاندان آباد کردیئے۔ عرب نے اس کو برداشت کیا۔ فریق مخالف (خزاعہ) جو اس کے خلاف پروپیگنڈہ کرکے عرب کو مشتعل کرسکتے تھے اس کے راستے بند

---

[1] اس کا ماخذ میسرہ ہے۔ میسرہ کے معنی قمار اور جوا (قاموس) چھوٹے چھوٹے تیر جن کو ازلام کہا جاتا تھا۔ وہ جوا کھیلنے کے کام میں آتے تھے۔ انہیں کے ذریعہ فال بھی نکالا جاتا تھا۔

ہو گئے۔ اس طرح خطرات ختم ہو گئے۔

(۴) نہ صرف سرزمین مکہ میں بلکہ پورے عرب میں قریش کے لئے کوئی خطرہ نہیں رہا۔ چنانچہ عام عرب کے لئے صرف چار ماہ حرم میں ان کو کہیں آنے جانے میں خطرہ نہیں ہوتا تھا اور قریش کے لئے پورے بارہ مہینے حرم ہو گئے۔ اس سے بسل کی اصطلاح ایجاد ہو گئی۔ یعنی باقی آٹھ ماہ کا بھی حرام ہونا۔

یہ قریش کا اعلیٰ درجہ کا تدبر تھا کہ رفادہ کے باعث انہوں نے خرچ سے زیادہ منافع کی صورتیں پیدا کرلیں اور ان کے عظمت واحترام میں بھی چار چاند لگ گئے۔ پھر احرام کا انتظام بھی قریش نے اپنے ذمہ لے لیا۔ یعنی جب عرفات سے واپس ہو کر طواف کعبہ کریں جو ۱۰ تا ۱۲ ذی الحجہ کو ہوا کرتا تھا تو یہ طواف ان کپڑوں میں نہ ہونا چاہئے جو سال بھر پہنے جاتے ہیں، جن کو پہن کر سینکڑوں گناہ کئے جاتے ہیں۔ بلکہ اس طواف کے لئے احرام کا کپڑا قریش دینگے اور اگر کوئی شخص کسی وجہ سے قریش کا یہ عطیہ حاصل نہ کر سکے تو وہ برہنہ بدن طواف کرے۔ [1]

سقایہ:

حجاج کے لئے پانی کا انتظام۔ یہ شعبہ بھی رفادہ کی طرح بہت اہم اور بہت کٹھن تھا۔

خزاعہ سے شکست کھا کر جب بنو جرھم مکہ سے فرار ہوئے تو ان بھاگنے والوں نے سب کچھ تباہ کر دینے کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے زمزم کو بھی (جو پہلے چشمہ تھا پھر یہاں کنواں بنالیا گیا تھا اور چشمہ کنویں کا سوت ہو گیا تھا جس کی وجہ سے کنویں کا پانی کبھی کم نہیں ہوتا تھا) نہ صرف بند کر دیا تھا بلکہ لاپتہ کر دیا تھا۔ قصی نے جب کعبہ کا حرم بنایا اور اس کے قریب قریش کو آباد کیا تو یہاں کوئی کنواں نہیں تھا تو زائرین کے لئے پانی کی سخت دشواری ہوتی تھی۔ شعبہ سقایہ کا کام یہ تھا کہ مکہ کے مختلف محلوں میں جو کنویں تھے وہاں سے پانی لاتے اور حوضوں میں بھر دیتے تھے۔

زائرین صرف حرم کعبہ ہی میں نہیں رہتے تھے بلکہ عرفات اور مزدلفہ بھی جاتے تھے۔ اور منیٰ میں تو کئی روز تک جشن رہا کرتا تھا۔ پانی کا انتظام سب جگہ کیا جاتا تھا۔ واٹر پروف قسم کی چیز اس وقت نہیں تھی البتہ چمڑہ ان کے یہاں ہوتا تھا جو حبش وغیرہ بھی بھیجا جاتا تھا۔ بڑے بڑے حوض چمڑے [2] ہی کے بنائے جاتے تھے یہ سب انتظام شعبہ سقایہ سے متعلق تھا۔

---

[1] ابن سعد ص ۱۴۱ ج ۱

[2] ابن سعد ص ۱۴۱ ج ۱

وقادہ[3]:

۹ذی الحجہ کی شام کو حاجی عرفات سے روانہ ہو کر مزدلفہ پہنچتے ہیں۔ رات کو مزدلفہ میں قیام رہتا ہے۔ صبح کو وہاں سے منیٰ آتے ہیں۔ یہی دستور زمانہ جاہلیت میں تھا۔ یہ رات اگرچہ چاندنی ہوتی ہے مگر پھر بھی قصی نے یہ انتظام کیا تھا کہ مزدلفہ کے ٹیلوں پر آگ جلائی جاتی تھی جس سے میدان مزدلفہ روشن رہتا تھا اور آنے والوں کو سہولت ہوتی تھی[1] اس کو وقادہ کہا جاتا تھا۔

اجازہ یا افاضہ:

روانگی کا پروگرام بنانا۔ پہلے گزر چکا ہے کہ یہ اختیار "صوفہ" کو حاصل تھا کہ وہ طے کیا کرتے تھے کہ مثلاً عرفات سے کونسا قبیلہ پہلے اور کونسا بعد کو روانہ ہوگا۔

قُبَّہ

حج کے موقع پر ہر ایک قبیلہ کا قیام گاہ (پڑاؤ) الگ ہوتا تھا جس کو منزل کہا جاتا تھا۔ کمبلوں کے خیمے ہوتے تھے۔ مگر قریش کے خیمے سرخ چمڑے کے ہوتے تھے۔ ایسے خیمہ کو قبہ کہا جاتا تھا (جمع قباب) ان کے انتظام کا ایک شعبہ تھا، اس کو قبہ ہی کہتے تھے۔

عدالت اور فصل خصومات:

حکومت۔ عام مقدمات کی سماعت اور فیصلہ اس شعبہ سے متعلق تھا۔

اشناق۔ قتل کے سلسلہ میں بعض صورتیں ایسی ہوتی تھیں جن میں دیت واجب ہوتی تھی۔ دیت کی ایسی صورت ہوتی تھی کہ اس کو اجتماعی جرمانہ کہا جاسکتا ہے۔ پوری دیت کے سو اونٹ[2] ہوتے تھے جو مقتول کے وارثوں کو دیئے جاتے تھے۔ مگر یہ اونٹ قاتل نہیں دیتا تھا۔ بلکہ اسکی ادائیگی عاقلہ کے ذمہ ہوتی تھی۔ یعنی وہ سوسائٹی جس میں یہ رہتا تھا۔ پھر قبائل کے جو معاہدات ہوتے تھے ان میں ایک دفعہ یہ بھی ہوتی تھی کہ اگر کسی قبیلہ پر دیت ادا کرنی لازم ہو تو اس کا اتنا حصہ وہ قبیلہ ادا کرے گا اور اتنا

---

[3] وقادہ: آگ روشن کرنا بمعنی وقود

[1] ابن سعد ص ۱۴۱ج ۱

[2] پہلے ایک انسان کی دیت دس اونٹ ہوا کرتی تھی جب عبدالمطلب کی منت ماننے کے مشہور واقعہ مین عبداللہ کے فدیہ میں سوا اونٹ پر قرعہ نکلا اور عبدالمطلب نے عبداللہ کے فدیہ میں سو اونٹ ذبح کئے تب سے ایک انسان کی دیت سو اونٹ قرار دی گئی جس کو اسلام نے بھی باقی رکھا۔ ابن سعد ۴۵

حصہ اس کا حلیف اور معاہد قبیلہ ادا کرے گا۔

پھر اگر جان ہلاک ہوئی ہے تو پوری دیت لازم ہوتی تھی اور اگر ناک، کان یا کوئی عضو کاٹ دیا ہے تو بعض صورتوں میں پوری دیت اور بعض صورتوں میں دیت کا ایک حصہ لازم ہوتا تھا۔ چونکہ اسلام نے بھی دیت کے طریقہ کو (جزوی اصلاحات کے بعد باقی رکھا) تو اس کے احکام کتب فقہ میں بھی ہیں۔ بہرحال قتل و دیت کے مقدمات نہایت اہم ہوتے تھے اور ان میں فیصلہ طلب امور یہ ہوتے تھے کہ پوری دیت لازم ہوتی ہے یا دیت کا جزو۔ اور جو بھی صورت ہو اس کی ادائیگی صرف قاتل کے قبیلہ اور اس کے عاقلہ پر لازم ہوگی یا اس قبیلہ کے حلیف قبائل پر بھی۔ اور اگر حلیفوں پر بھی لازم ہوتی ہے تو بروئے معاہدہ کتنی۔ اور اس کی ادائیگی کی کیا صورت ہوگی۔ اس شعبہ کا نام (جس کے ذریعے ان مقدمات کا فیصلہ کیا جاتا تھا) اشناق [1] تھا اور اس کا ذمہ دار وہی ہو سکتا تھا جو اونچے درجہ کا معاملہ فہم ہو اور صحیح فیصلہ کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اسلام سے پہلے یہ شعبہ ابوبکر بن قحافہ کے سپرد تھا، جن کو اسلام نے صدیق اکبر کا خطاب دیا۔

فوجی نظام

غیر موزوں نہ ہوگا اگر "بے ضابطہ فوج" کا لفظ استعمال کیا جائے۔ بے ضابطہ فوج سے مراد قبائل کے وہ جنگجو ہیں جو کسی بھی مقابلہ کے وقت میدان میں آجاتے تھے۔ ان کے اسلحہ [2] خود اپنے ہوتے تھے۔ ان کا کوئی کمانڈر مستقل نہیں ہوتا تھا۔ اس کا انتخاب [3] وقت پر ہوتا تھا۔ ہر قبیلہ کا جھنڈا الگ ہوتا تھا اس کو لواء کہا جاتا تھا اور ایک علم پوری فوج کا ہوتا تھا اس کو عقاب کہتے تھے۔ پوری فوج کے سالار اعظم کو قائد۔ اس منصب کو قیادت اور اس کے کیمپ کو قبہ کہا کرتے تھے۔

خاص خاص سرداروں کے ساتھ یہ عہدے اور جھنڈے سپرد کئے جاتے تھے سپرد کرنے والے بھی خاص سردار ہوتے۔

---

[1] اشناق شنق سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں جزو دیت اور زکوۃ کے جو نصاب اسلام نے مقرر کئے ہیں تو دو نصابوں کے درمیان جو کسر ہوتی ہے اس کو بھی شنق کہا جاتا ہے۔ مثلاً چالیس بکریوں پر ایک بکری زکوۃ میں ادا کرنی ہوتی ہے اور ایک سو بیس پر دو بکریاں، تو چالیس سے زائد اور ایک سو بیس سے کم تعداد شنق ہوئی۔

[2] تلوار، نیزہ، اور حفاظت کے لئے ڈھال، فدہ (درع) اور خود (بیضہ) خود کے آہنی جھالر جن سے گردن کی حفاظت ہوتی تھی مغفر کہلاتے تھے۔

[3] جو عموماً قرعہ کے ذریعہ ہوتا تھا قبائل کے سردار امیدوار ہوتے تھے۔ جنگ فجار کے موقع پر حضرت عباسؓ کا نام نکل آیا۔ یہ اس وقت بچے تھے تو ان کو ایک ڈھال پر بٹھا کر لے گئے۔ العقد الفرید ۴۶، ج ۲۔

قسمیں:

فوج کی چند قسمیں ہوتی تھیں۔ تیر انداز، رماۃ جمع رامی، پیادہ رجالہ، سوار، خیل۔
سوار فوج کے لئے اعنہ کا لفظ بھی استعمال ہوتا تھا۔
فتح کے وقت لوٹ کے مال کو غنیمت کہا جاتا تھا۔ اس کا اتنا نظام تسلیم شدہ تھا کہ ایک چوتھائی قائد فوج یا سردار اعظم کا ہوتا تھا اس چوتھائی کو مرباع کہتے تھے (چوتھ)۔ [1] باقی تین حصے مختلف طریقوں سے تقسیم کئے جاتے تھے۔ [2] اس خاکہ کے بموجب فوج کے منصب دار یہ ہوتے تھے:
(۱) قائد اعظم (۲) علمبردار جس کے پاس عقاب رہتا تھا (۳) کیمپ یعنی قبہ کا منتظم اور محافظ (۴) سوار فوج کا سردار، صاحب اعنہ، اس کو مختصر کر کے اعنہ کہتے تھے۔

باضابطہ فوج یا پولیس:

قریش نے حفاظتی مقاصد کے لئے ایک مستقل نظام بھی بنایا تھا اس کو قائم کہتے تھے۔ مگر اس کی حیثیت تنخواہ دار پولیس کی تھی۔ لڑائیوں کے وقت قبائل کے جنگجو بھی اپنے مفاخر کے ترانے گاتے ہوئے میدان میں آیا کرتے تھے اور مقابلہ بھی ان سے کرتے تھے جو ان کے ہمسر ہوتے تھے۔ غزوہ بدر میں سرداران قریش نے انصاری مجاہدین کو مقابلہ پر دیکھا تو لڑنے سے انکار کر دیا کہ یہ کاشتکار اور کسان ہیں۔ قریش کے ہم پلہ نہیں ہیں۔ یہ بھی ایک ضابطہ تھا۔
قصی نے اپنے بعد عبد الدار کو جانشین کر دیا اور جو شعبے قصی کے پاس تھے وہ سب عبد الدار کے حوالہ کر دیے۔ لیکن قصی کے موت کے بعد اس کے دوسرے بیٹے عبد مناف کی اولاد نے مکہ کی ریاست کے شعبوں کا انتظام تقسیم کرتے ہوئے ریاست پر اپنی گرفت مضبوط کر دی۔

کارنامہ:

قصی نے اگرچہ بادشاہت کا دعویٰ نہیں کیا مگر قریش پر اور قریش کے ذریعہ پورے عرب پر اس کا اقتدار کسی بادشاہ سے کم نہیں تھا اور اس لحاظ سے اس کی اولاد کی حیثیت وہی تھی جو شہزادوں اور راج

---

[1] عجیب بات یہ ہے کہ ہندوستان بھی چوتھ سے ناآشنا نہ تھا۔ شیواجی عالمگیر سے اس پر لڑتا رہا کہ وہ چوتھ مانگتا تھا یعنی یہ کہ عالمگیر یہ تسلیم کرے کہ شیواجی کو اپنے میں چوتھ حاصل کرنے کا حق ہوگا۔ سلطان عالمگیر اس کے لئے تیار نہیں ہوئے۔
[2] عموماً تین چوتھائی باقی ساتھیوں پر اگر کچھ مال دشمن کی شکست اور عام لوٹ سے پہلے مل جاتا تھا۔ اس کو نشیطہ کہا جاتا تھا۔ فضول سے مراد ناقابل تقسیم کسرات ہوتے تھے اور صفی کسی ایسی منتخب چیز کو کہتے تھے جو مہم کا سردار اپنے لئے منتخب کر لیا کرتا تھا، مثلاً کوئی تلوار یا کوئی گھوڑا وغیرہ۔ سردار کو اس انتخاب کا حق ہوتا تھا۔

کماروں کی ہوا کرتی تھی۔

عبد مناف کی اولاد نے اپنی شخصیت اور اپنی اس حیثیت کو پہچانا اور اس سے کام لیا۔ چنانچہ انہوں نے پڑوسی ممالک کے بادشاہوں اور شاہنشاہوں سے تعلقات پیدا کئے اور ان کو بڑھایا۔ اور قابل قدر بات یہ ہے کہ ان تعلقات کے فوائد کو صرف اپنی ذات تک محدود نہیں رکھا بلکہ ان تعلقات سے کام لے کر اپنی قوم کے لئے تجارتی مراعات اور سفروں میں آسانیاں پیدا کیں۔ چنانچہ مطلب نے جو سب سے بڑا تھا شاہ حبش نجاشی اور یمن کے ملوک (ملوک حمیر) سے، ہاشم [1] نے بازنطینی شہنشاہ ہرقل سے اور نوفل نے شہنشاہ ایران کسریٰ سے اپنی قوم کے لئے آزاد تجارت کے فرامین حاصل کر لئے کہ قریش تاجر جو ان کے ملکوں میں جائیں گے ان سے کوئی محصول یا ٹیکس نہیں لیا جائے گا۔ [2] ظاہر ہے تجارت پیشہ قوم کے لئے اس سے بڑی نعمت کیا ہو سکتی ہے۔ اسی لئے ان کو مجیرون کہا جاتا تھا۔ [3]

تقسیم مناصب [4] جب آفتاب اسلام طلوع ہوا تو مناصب کی تقسیم اس طرح تھی:

شعبے	نمبر شمار	منصب	خدمات و فرائض	قبیلہ	منصب دار
نظم و حفاظت کعبہ مکرمہ	۱	حجابہ و سدانہ	خانہ کعبہ	بنو عثمان بن عبدالدار بن قصی	عثمان بن طلحہ
	۲	عمارت	حرم کعبہ کا عام انتظام اور نگرانی		
	۳	ایسار	فال نکالنے کی خدمت جس کا قاعدہ مقرر تھا	بنو جمح	صفوان بن امیہ
	۴	اموال محجرہ	بتوں کے نام پر حاصل شدہ نذرانوں کی حفاظت اور ان کا انتظام	بنو سہم	حارث بن قیس
حج اور ضروریات حجاج	۵	سقایہ	حاجیوں کے لئے پانی کا انتظام	بنو ہاشم	ابو طالب
	۶	رفادہ	حاجیوں کے لئے کھانے اور احرام کے کپڑوں کا انتظام		
	۷	اجازہ یا افاضہ	عرفات سے واپسی میں ترتیب قائم کرنا	صوفہ	
	۸	وقادہ	مزدلفہ میں روشنی کا انتظام	بنو عبد مناف	
	۹	نسی	لوند کا مہینہ معین کرنا	صوفہ	ابو ثمامہ جنادہ بن عوف
	۱۰	قبہ	حج کے موقع پر قبائل کے لیے قیام گاہوں نیز جنگ کے وقت خیموں اور خرگاہوں کا انتظام		

---

[1] البدایہ والنہایہ ۲۵۳، ج ۲

[2] طبقات ابن سعد ۴۳ج ۱، البدایہ والنہایہ ۲۵۳ ج ۲

[3] ایضاً

[4] ماخوذ از طبقات ابن سعد ج ۱، اخبار مکہ العقدان، وسیرت ابن ہشام ج ۱

عدل وانصاف اور اجتماعی امور	۱۱	ندوہ	سماعت مقدمات اور درع وغیرہ کی تقریبات کا انتظام	بنو عبد الدار	عثمان بن طلحہ
	۱۲	مشورہ	اہم امور میں مجلس مشاورت کا انتظام	بنو اسد	یزید بن زمعہ
	۱۳	اشناق	خون بہا، جرمانہ اور مالی تاوان کا فیصلہ اور نظم	بنو تمیم	ابو بکر (الصدیق)
	۱۴	حکومت	مقدمات کی سماعت وفیصلہ	بنو سہم	حارث بن قیس
فوج وجنگ	۱۵	قیادت	فوجوں کی کمانداری	بنو امیہ	ابو سفیان بن حرب
	۱۶	لوار	علم برداری	بنو عبد الدار	
	۱۷	اعنہ	سواروں کے رسالہ کی سپہ سالاری	بنو مخزوم	خالد بن الولید
امور خارجہ	۱۸	سفارت	دوسرے ملک یا دوسرے فریق جنگ سے جنگ یا صلح کی گفتگو اور پیغام رسانی	بنو عدی	عمر فاروقؓ

بلند حوصلہ ہاشم بن عبد مناف

رفادہ اور سقایہ سب سے اہم شعبے تھے جن کے لئے دولت کی ضرورت بھی تھی اور محنت کی بھی ۔ یہ اگرچہ عبد مناف کے چاروں بیٹوں کے سپرد ہوئے تھے مگر ان میں پیش پیش ہاشم رہا۔ یہ سب بھائیوں میں سب سے زیادہ بلند حوصلہ، باسلیقہ، صاحب الرائے اور رسا آدمی تھا۔ رفادہ اور سقایہ کو جس قدر رقم کی ضرورت تھی ہاشم کا حوصلہ اس سے بہت زیادہ بلند تھا۔

پہلے گزر چکا ہے قصی نے قریش کو سمجھایا تھا کہ زائرین (جو حج کو آتے ہیں) وہ قریش کے مہمان ہونے چاہئیں۔

حجاج کی خدمت کیلئے دعوتوں کا یہ سلسلہ ۷ ذی الحجہ (یوم الترویہ) سے ایک دن پہلے سے شروع ہو کر ۱۴ تک رہتا تھا۔ عرفات، منیٰ اور مزدلفہ جہاں جہاں حاجی جاتے تھے یہ دعوتیں ہوتی تھیں۔ ❶

ہاشم کا ذریعہ آمدنی تجارت تھی۔ شہنشاہ روم (ہرقل) سے تعلقات بہت اچھے تھے۔ ایسے ہی شاہان ایران ویمن اور حبش سے تعلقات تھے۔ اس نے ان تمام فرامین کی تجدید کرائی جو پہلے ہو چکے تھے اور رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَ الصَّيْفِ (القریش۔۲) کا طریقہ اسی نے ایجاد کیا کہ قریش کا تجارتی قافلہ سردیوں میں یمن اور حبش جاتا تھا اور گرمیوں میں شام سے غزہ تک اور کبھی انقرہ تک پہنچ جاتا تھا۔ یہاں کے بادشاہ اور امراء ان قافلوں کا اعزاز کرتے تھے۔ ❷

---

❶ ابن سعد ص ۴۵ جلد ۱

❷ ابن سعد ص ۴۳ جلد ۱

مطلب ہاشم سے بڑے تھے۔ ہاشم کے بعد رفادہ اور سقایہ انہیں کے سپرد رہا مگر یہ زیادہ عرصہ زندہ نہ رہے۔ کچھ دنوں بعد یمن گئے وہیں "روان" میں ان کا انتقال ہو گیا۔[3] مطلب کے بعد عبد المطلب جانشین ہوئے۔ یہ ان کی خداداد صلاحیت تھی کہ ہاشم کے صحیح جانشین ثابت ہوئے اور چند کام ایسے کئے جن سے نہ صرف قریش یا عرب کی تاریخ متاثر ہوئی بلکہ تاریخ اسلام بھی ان سے متاثر ہے۔ مثلاً: (۱) چاہ زمزم کی بر آمدگی (۲) خزاعہ سے معاہدہ (۳) دیت کے اونٹوں کی تعداد میں اضافہ (۴) اصحاب فیل کے واقعے میں اہل مکہ کو محفوظ کر لینا۔

عبد المطلب کے بعد خواجہ ابو طالب اور حق سقایہ

آنحضرت ﷺ کی عمر تقریباً ۸ سال تھی جب عبد المطلب کا انتقال ہوا۔ عبد المطلب کے جانشین ابو طالب قرار دیئے گئے۔ خدمت سقایہ ان کے سپرد ہوئی۔ ابو طالب اخلاق اور کمالات میں سب بھائیوں سے ممتاز تھے مگر دولت میں کم تھے۔ حج کا زمانہ آیا تو ہاتھ خالی تھے اور خدمت سقایہ کے لئے دس ہزار کی ضرورت تھی۔ انہوں نے یہ رقم اپنے بھائی عباس سے ایک سال کے وعدہ پر قرض لی۔ دوسرا سال آگیا قرض ادا نہ ہو سکا اور مزید خرچ کی ضرورت پیش آگئی تو بھائی عباس سے پھر ایک سال کے لئے چودہ ہزار قرض لئے۔ مگر اس مرتبہ عباس نے یہ طے کر لیا کہ اگر آئندہ سال تک یہ رقم ادا نہ ہو سکے تو آپ خدمت سقایہ میرے حوالہ کر دیں۔ خواجہ ابو طالب نے یہ شرط منظور کر لی۔ پھر یہ اتفاق ہوا کہ ابو طالب ادائیگی قرض کا انتظام نہ کر سکے تو حسب وعدہ خدمت سقایہ عباس کے حوالے کر دی۔[1] آنحضرت ﷺ نے اس کا احترام فرمایا۔ چنانچہ فتح مکہ کے بعد بھی یہ خدمت سقایہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے نام پر ہی باقی رکھی۔

پورے عرب پر قریش کا ہمہ گیر اثر

نظام بت پرستی:

پورے عرب کو چند منطقوں پر تقسیم کیا گیا تھا۔ ہر ایک منطقہ کا بت الگ ہوتا تھا۔ اس کا مندر الگ ہوتا تھا جس کے ساتھ اس کے تمام لوازمات ہوتے تھے۔ مثلاً بنو ثقیف نے "لات" کو اپنا دیوتا بنا رکھا تھا۔ طائف میں اس نام کا بت تھا۔ باشندگان یثرب (قبائل اوس اور خزرج) اور جو ان کے ہم مشرب و پیرو تھے ان کا مخصوص دیوتا "منات" تھا جو ساحل سمندر پر مشلل کے ایک جانب قدید میں تھا

---

[3] ابن سعد ص ۴۵ جلد ا

[1] البدایہ والنہایہ ص ۲۴۷ ج ۲

جو ایک مقام کا نام تھا۔ ❷

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے جو دیوتا بنا رکھے تھے جب عرب میں بت پرستی کا رواج ہوا تو احیائی ذہنیت نے ان فراموش شدہ دیوتاؤں کو پھر یاد دلا دیا۔ پھر کسی طرح وہ مورتیاں بھی برآمد کرلی گئیں تو مختلف قبائل ان دیوتاؤں کے بھگت (پوجاری) ہو گئے۔ سیدنا حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے ان کی تفصیل یہ بیان کی ہے۔ ❶

وُدّ: بمقام دومتہ الجندل۔ قبیلہ کلب اس کا بھگت تھا۔

سواع: بمقام رہاط، ساحل سمندر کے قریب۔ قبیلہ ہذیل اس کا بھگت تھا۔

یغوث: بمقام جرف (یمن) پہلے قبیلہ مراد اس کی خدمت کیا کرتا تھا پھر بنو غطیف اس کے خادم اور بھگت بن گئے۔

یعوق: اہل ہمدان اس کے پجاری تھے۔

نسر: ذی الکلاع (جو علاقہ حمیر) کا مشہور خاندان تھا اس کا بھگت تھا۔ یہ تمام صنم اور ان کے مندر اگرچہ علاقائی حیثیت رکھتے تھے مگر طواف، نذرانہ اور قربانی وغیرہ کی رسومات جو کعبہ میں انجام دی جاتی تھیں وہ یہاں بھی پوری کی جاتی تھیں۔ اور خانہ کعبہ کے خدام کے جو منصب تھے، کلید برادری، دربانی اور ایسار وغیرہ یہ تمام منصب ان علاقائی کعبوں کے خدام کے بھی ہوا کرتے تھے۔ اس طرح پورے عرب میں مندروں یا چھوٹے بڑے کعبوں کا ایک جال پھیلا ہوا تھا۔ خدام اور پوجاریوں کے سیکڑوں خاندان اس نظام سے وابستہ تھے۔ اس پورے نظام کا مرکز کعبہ تھا۔ ❷ اس کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بنایا ہوا "بیت اللہ" سمجھا جاتا تھا اور اسی کے گرد طواف کر کے حج کا مقدس فرض انجام دیا جاتا تھا۔ پس جو یہاں کے خادم تھے وہ پورے عرب کے مخدوم تھے اور جب کہ یعمر بن عوف کا یہ فیصلہ تسلیم کر لیا گیا تھا کہ وراثت ابراہیمؑ اور تولیت کعبہ کا حق قریش کو ہے تو قریش پورے عرب کے مخدوم اور مذہبی مقتدا تھے۔

سیاسی قیادت

بت پرستی کے اس نظام نے قریش کو پورے عرب کا مذہبی پیشوا ضرور بنا دیا تھا مگر قریش کی عظمت صرف اس نظام پر موقوف نہیں تھی، بلکہ اس زمانہ کے بین الاقوامی سیاسی گٹھ جوڑ نے بھی قریش

---

❷ بخاری شریف ۳۲۲

❶ بخاری شریف ص ۷۳۲

❷ سیرت ابن ہشام ص ۵۴ ج ۱

کو ایسی حیثیت دیدی تھی کہ پورے عرب کا اس سے متاثر ہونا ضروری تھا۔

روم (بازنطینی)، ایران اور حبش تینوں سلطنتوں کے بیچ میں عرب حد فاصل تھا۔

تینوں سلطنتیں عرب پر نظر رکھتی تھیں۔ قریش اس حیثیت کو پہنچانتے تھے اور اس سے کام لینا بھی جانتے تھے۔ قصی نے بنو خزاعہ کا مقابلہ کیا اور ان کو مکہ سے نکالا تو نہ صرف یہ کہ شہنشاہ روم (بازنطینی شہنشاہ) کی حمایت اس کو حاصل تھی بلکہ ابن قتیبہ کی شہادت یہ ہے کہ اعانہ قیصر علیھا ❸ (قیصر روم ❶ نے اس کو کمک بھی پہنچائی تھی)

قصی کے پوتوں نے ان تعلقات کو وسیع کیا اور لطف کی بات یہ ہے کہ ایران، روم، حبش اور ملوک یمن آپس میں ایک دوسرے کے حریف تھے مگر آل عبد مناف (قصی کے پوتوں) نے سب سے قریش کے لئے یکساں حقوق اور رعایتیں حاصل کرلیں۔ چنانچہ مطلب نے شاہ حبش (نجاشی) اور اس کے حریف شاہان یمن (ملوک حمیر) سے، نوفل نے شہنشاہ ایران (کسریٰ) سے اور ہاشم نے بازنطینی شہنشاہ ہرقل سے قریش کے لئے آزاد تجارت کے فرامین حاصل کرلئے۔ ❷

ابن سعد کا بیان ہے: ہاشم ایک شریف آدمی تھا۔ یہی ہاشم ہے جس نے قیصر (شہنشاہ روم) سے یہ حلف لیا تھا (فرمان حاصل کرلیا تھا) کہ اس کے حدود مملکت میں قریش کو آزادی ہوگی۔ ان کے جان ومال کو کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ قیصر روم نے یہ فرمان اپنی مملکت کے لئے دیا اور اپنے دوست ملک (حبش) کے بادشاہ نجاشی کو بھی لکھ دیا کہ وہ اپنے ملک میں قریش کو آمد ورفت اور کاروبار کی اجازت دیں۔ ❸

ہاشم نے فرامین سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قریش کی تجارت کو منظم کیا۔ تجارتی قافلوں کا ایسا پروگرام بنایا کہ وہ سال بھر رواں رہتے اور جہاں جاتے موسم کی خوشگواری ان کا استقبال کرتی۔ سردیوں میں یمن کی طرف جاتے اور حبشہ تک تجارتی قافلے پہنچتے اور گرمیوں میں شام کی طرف غزہ تک اور کبھی انقرہ تک تجارتی قافلے پہنچتے تھے۔ بسا اوقات ہاشم خود ان کی قیادت کرتا تھا۔ ❹

دیگر قبائل کے لئے مراعات:

ان طویل راستوں میں جو قبائل پڑتے تھے ان کے لئے مراعات یہ تھیں کہ قریش کے قافلے ان

---

❸ معارف ابن قتیبہ ۲۱۵ ملوک الشام

❶ بازنطینی شہنشاہ کو عرب قیصر کہا کرتے اور ایران کے شہنشاہ کو کسریٰ اور شاہ حبش کو نجاشی کہا کرتے تھے۔

❷ طبقات ابن سعد ۴۳ جلد ۱

❸ ابن سعد ۴۵ ج ۱

❹ ابن سعد ۴۳، ۴۵، ج ۱

کا سامان بھی لے جاتے۔ مزید احسان یہ کرتے کہ سامان لیجانے لانے کا محصول تو در کنار بار برداری کا خرچ بھی نہ لیتے تھے۔ ⁵

مکہ مکرمہ پورے عرب کا مرکزی شہر (ام القریٰ) تھا۔ سیاسی قیادت کے لئے یہی کافی تھا کہ قریش ام القریٰ پر قابض اور اس کے مالک تھے۔ مزید بر آں آل مناف نے پڑوسی ممالک سے یہ رعایتیں حاصل کرکے قریش کے آسمان قیادت کو ماہ و پروین اور کہکشاں سے آراستہ کردیا۔ اب پورا عرب قریش کا کلمہ گو اور اس کے احسانات کا ممنون تھا۔

عرب کا تجارتی نظام اور قریش کی سربراہی

بت پرستی کے منطقوں کی طرح عرب کے ایسے علاقے بھی ہوگئے تھے جن کو تجارتی منطقہ کہا جاسکتا تھا۔

قصبوں اور شہروں میں چھوٹے بڑے بازار بھی تھے۔ ہفتہ وار بازار بھی جگہ جگہ لگا کرتے تھے۔ لیکن ہر ایک منطقہ کے مرکزی مقام پر ایک میلہ سالانہ ہوتا تھا جس میں نہ صرف عرب بلکہ قریب کے (غیر عرب) علاقوں کے تاجر بھی مال لاتے، دوکانیں لگاتے اور نفع کماتے تھے۔ یہ پہلے سال کے بارہ مہینوں میں دائر سائر رہتے۔ مورخین نے ان میلوں کی تفصیل و ترتیب یہ بیان کی ہے۔

(۱) دومتہ الجندل میں جو شام و حجاز کے مابین ہے۔ یکم ربیع الاول کو میلا لگتا جو پورے مہینہ رہتا۔

(۲) یہاں سے لوگ چل کر بحرین میں مشقر آتے۔ یہاں یکم سے آخر جمادی الاخریٰ تک میلہ لگتا اور دومتہ الجندل کی طرح یہاں بھی مقامی حکمران کو عشر (دس فیصدی) (چنگی یا کسٹم) دیا جاتا۔ ایران تک کے تاجر سامان لے کر یہاں آتے۔

(۳) یکم رجب کو مشقر سے بازار اجڑتا تو صحار کے لئے روانگی ہوتی جو عمان کا پر رونق شہر تھا۔ تقریباً بیس دن راستہ میں صرف ہوتے۔ یہاں پانچ دن کا میلہ ہوتا اور بادشاہ جُلندی کو عشر دیا جاتا تھا۔

(۴) رجب کے آخر میں دبا کا میلہ شروع ہوتا۔ یہ عرب کی دو بڑی بندرگاہوں میں سے ایک تھا۔ یہاں سندھ، ہند، چین اور مشرق و مغرب کے لوگ آتے اور خشکی اور سمندر کے راستوں سے سامان لاتے، یہاں کا عشر بھی بادشاہ جلندی کو ملتا۔

(۵) اس کے بعد مہرہ کے شہر شجر میں وسط شعبان سے میلہ لگتا جہاں بری اور بحری جہاز دبا سے چل کر آتے۔ یہ کھالوں اور کپڑے کی خاص منڈی تھی۔ مقامی پیداوار کی جنسیں ایلوا، لوبان وغیرہ بھی

---

⁵ ابن سعد ۴۵ قرآن حکیم نے اس سلسلہ کو ایلاف سے تعبیر کیا ہے (یعنی مانوس کرنا) تشریح آگے آئے گی۔ انشاءاللہ۔

یہاں سے خریدی جاتیں۔

(۶) پھر یکم رمضان سے عدن میں میلا لگتا۔ عدن میں جو عطر بنتا تھا اس کی دور دور تک شہرت تھی۔ بحری راستہ سے آنے والے سندھ اور ہند تک اور خشکی کے راستہ سے آنے والے ایران اور روم تک یہاں کا عطر لے جاتے تھے۔ یہاں کا عشر ایران کے نو آباد کار افسر لیتے تھے۔

(۷) عدن کے بعد صنعاء (یمن) کا میلہ لگتا جو وسط رمضان سے آخر رمضان تک رہتا۔ یہاں روئی، زعفران، مختلف قسم کے رنگوں اور لوہے کی منڈیاں تھیں یہاں کا عشر بھی شاہ ایران کا گورنر لیتا تھا۔

(۸،۹) وسط ذی تعدہ سے آخر ماہ تک دو میلے لگتے:

(الف) رابیہ میں جو علاقہ حضر موت کا ایک شہر تھا۔

(ب) عکاظ میں جو مکہ اور عرفات کے درمیان شہر تھا۔

(۱۰) عکاظ کے قریب ذی المجاز ہے۔ یہاں یکم ذی الحجہ سے میلہ لگتا جو دس ذی الحجہ تک رہتا۔

(۱۱) زمانہ حج میں (۱۰ ذی الحجہ سے ۱۵ ذی الحجہ تک) منیٰ میں میلا لگتا۔

(۱۲،۱۳) منیٰ سے فارغ ہو کر لوگ خیبر یا یمامہ جاتے جہاں محرم کی دسویں سے میلے لگتے۔

(۱۴،۱۵) اس کے بعد جنوبی فلسطین میں بصریٰ اور اذرعات کے میلے لگتے۔ [1]

ان تمام میلوں میں سب سے زیادہ اہمیت عکاظ اور ذوالمجاز کے میلوں کو تھی۔ کیونکہ (الف) یہ میلے شہر حرم میں لگتے تھے۔ جو پورے عرب کے لئے امن و پناہ کے مہینے تھے۔ اس لئے سب طرف سے بڑی بڑی تعداد میں تاجر اور زائرین امن کی بانسری بجاتے ہوئے یہاں آتے، رسومات حج ادا کرتے، مال خریدتے اور عیش و تفریح کی مجلسیں جماتے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس میلہ میں عام نگرانی، حفاظت اور جو ہنگامے ہو جاتے ان کے مقدمات کی سماعت اور ان کا فیصلہ کرنا "قبیلہ تمیم" کے متعلق ہوتا تھا۔ جبکہ قبیلہ تمیم کا مسکن عرب کی انتہا، مشرق تھا اور مکہ و عکاظ انتہا مغرب میں تھے۔ مطلب یہ ہے کہ ان میلوں سے پورے عرب کا تعلق رہتا اور تعلق بھی عقیدتمندانہ ہوتا تھا۔

میدان تجارت میں قریش کی سربراہی

(۱) عکاظ اور ذی المجاز کے مذکورہ بالا عظیم الشان میلوں کی اہمیت اس لئے بھی زیادہ تھی کہ اس موقع پر بڑے بڑے اجتماعات بھی ہوا کرتے تھے جن میں پورے عرب کے اساتذہ شعر و سخن شرکت کرتے، ادبی مقابلے ہوتے، دھوم دھام سے مشاعرے ہوتے۔ مشہور مقررین کی تقریریں

[1] کتاب المحبر واسواق العرب لمحمد بن حبیب (مرزوقی)

ہوتیں جن میں وہ اپنے قبائل کے کارنامے بیان کرتے۔ مختصر یہ کہ مذہبی جشن (حج) کے ساتھ قومی جشن بھی منائے جاتے تھے۔ ان میلوں کے جملہ انتظامات قریش سے متعلق تھے یا قریش کے تعاون سے ہوتے تھے۔ اس طرح میلوں کے سلسلہ میں بھی قریش کو سربراہی حاصل تھی۔

(۲) قریش نے جب تجارت کو منظم کرتے ہوئے رحلتہ الشتاءوالصیف موسم گرما اور سرمائی قافلوں کا طریقہ ایجاد کیا اور اس طرح ان کا تجارتی سلسلہ عرب کے چپہ چپہ میں پھیل گیا تو انہوں نے ایک حفاظتی فوج بھی تیار کی جس میں حبشی غلام اور تنخواہ دار سپاہی ہوتے تھے۔ اس کو قائمہ کہا جاتا تھا۔ یہ فوج قریش کے قافلوں کی طرح حلیف قبائل کے قافلوں کی بھی حفاظت کرتی تھی۔ [1]

(۳) جیسا کہ [2] پہلے گذر چکا ہے عرب میں نہ کوئی سلطنت تھی نہ حکومت، نہ فوج، نہ پولیس، البتہ قبائلی معاہدات کا ایک سلسلہ تھا جو افراد کی جان ومال کی حفاظت کا ذریعہ ہوتا تھا۔ قبائل کے معاہداتی گروپ تھے۔ جو فرد کسی گروپ سے تعلق رکھتا تھا تو پورا گروپ اس کی حفاظت کا ذمہ دار تھا۔ اس ذمہ داری کا نام خَفارت [3] تھا۔ راہرو کو اس کی سند دیدی جاتی تھی تو وہ اس گروپ کے حدود تک محفوظ رہتا تھا۔ اس سند کو بھی خفارت ہی کہا جاتا تھا (یعنی پروانہ راہداری یا ویزا) کبھی خفارت پر معاوضہ بھی لیا جاتا تھا۔

قریش کے تعلقات کا دائرہ پورے عرب کو گھیرے ہوئے تھا تو اس کا "پروانہ راہ داری" خفارہ بھی پورے عرب کے لئے کافی ہوتا تھا۔

(۴) تنظیم تجارت اور تجارتی قافلوں کے ذریعہ جب دوسرے ممالک سے تجارتی تعلقات قائم ہوئے تو پہلے تو یہ ہوا کہ تجارتی قافلے واپسی کے وقت شام اور یمن وغیرہ سے غلہ بھر کر لاتے تھے تو مکہ اور اطراف مکہ جہاں کاشت کا نام ونشان نہیں تھا وہاں غلہ کی فراوانی ہوگئی۔ پھر ان ممالک کے باشندوں نے خود بھی غلہ کی روانگی (سپلائی) شروع کردی۔ خشکی کے راستوں سے بھی غلہ آتا اور بحری راستہ سے بھی جدہ کی بندرگاہ پر غلہ اتارا جاتا تھا۔ [4]

یہ تھے وہ اسباب جن کی بناء پر قریش کو مذہبی عظمت اور سیاسی قیادت کی طرح اقتصادی برتری اور تجارتی سربراہی بھی حاصل ہوگئی۔

---

[1] المحبر لمحمد بن حبیب

[2] زیر عنوان معاہداتی حکومت

[3] اس زمہ داری کی خلاف ورزی کو اخفاء کہتے تھے۔ کما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فانہ من صلی الغداۃ فی زمۃ اللہ فلا یخفرن اللہ فی ذمتہ (مجمع البحار)

[4] ابن قتیبہ کے استاذ محمد بن حبیب المتوفی ۲۴۵ھ، ۸۵۹ عیسوی نے اپنی کتاب المحبر میں اس کی تفصیل دی ہے ص ۲۶۳، ۲۶۴۔

واقعہ اصحاب فیل

قصی کا زمانہ بظاہر چوتھی صدی عیسوی کا وہ ابتدائی نصف ہے جب مسیحیت، جدید ترتیب کے ساتھ ظہور پذیر ہوئی تھی۔ تثلیث کو جزو دین بنایا گیا تھا اور قسطنطین اول نے مسیحیت قبول کر کے حکومت کا مذہب بھی عیسائیت قرار دیدیا تھا۔ جب مسیحیت کا مرکز رومتہ الکبریٰ اٹلی بنا تو مسیحیت کی لہران تمام علاقوں میں پہنچی جو بازنطینی شہنشاہیت کے زیر اثر اور اس بلاک میں داخل تھے۔ عرب کے وہ علاقے جو شام سے متصل تھے، افریقہ کے علاقے خصوصاً حبش اور یمن کے بھی کچھ علاقے عیسائیت سے متاثر ہوئے۔ [1]

بازنطینی شہنشاہ (قیصر روم) نے قصی کی امداد کی پھر ہاشم کے ساتھ یہ مراعات کی کہ قیصر نے اپنی طرف سے بھی اس کو آزادانہ تجارت کا پروانہ دیا اور شہنشاہ حبش سے بھی مراعات دلوائی۔ اس کا مقصد خالص سیاسی بھی ہو سکتا ہے کہ ایران کے مقابلہ میں عربوں کو اپنی طرف مائل اور تجارتی راستوں کو اپنے زیر اثر رکھے۔ اور اس کا مقصد مذہبی بھی ہو سکتا ہے کہ عرب میں عیسائیت کو رواج دے۔ غالباً اسی سلسلہ کی آخری کڑی یہ تھی کہ ابرہہ نے (جو خود عیسائی تھا اور حبش کے عیسائی بادشاہ نجاشی کی طرف سے یمن کا گورنر تھا) یمن کے مرکزی شہر صنعاء میں نہایت عظیم الشان کلیسا تعمیر کرایا [2] تو عربوں کو ہدایت کی کہ وہ خانہ کعبہ کے بجائے اس کلیسا کو اپنا معبد بنائیں اور اسی کا طواف کیا کریں۔ مگر جب عربوں نے اس کا انکار کیا تو ابرہہ نے لشکر کشی کر دی۔

ابرہہ نے دریافت کیا: آپ کیا چاہتے ہیں۔ خواجہ عبدالمطلب نے جواب دیا۔ آپ کی فوج نے میرے دو سو اونٹ لوٹ لئے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ آپ ان کو واپس کرادیں۔ ابرہہ حیران ہوا۔ اس نے ترجمان سے کہا: ان سے کہو کہ آپ کی وجاہت اور شاندار صورت سے میں متاثر ہوا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ آپ کوئی بڑا مطالبہ پیش کرینگے، آپ نے صرف اپنے اونٹوں کی واپسی کی درخواست کی اور تعجب ہے آپ نے اس کعبہ کے متعلق کچھ بھی نہیں کہا جو آپ کا اور آپ کے آباؤ اجداد کا دین اور دھرم رہا ہے۔

خواجہ عبدالمطلب نے جواب دیا:

”اس بیت کا ایک رب ہے اس کا محافظ وہ ہے اس کی فکر وہ کرے گا۔ میں اس بیت کا مالک نہیں ہوں، میں ان اونٹوں کا مالک ہوں جن کی واپسی کی میں نے درخواست کی ہے۔“

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو عہد زریں ص، ۲۸۴ تا ۳۰۱

[2] ابن سعد ص ۵۵، ج ۱

ابن ہشام [3] کی روایت ہے کہ حناطہ نے عبد المطلب سے پہلے دو اور سرداروں کو پیش کیا تھا۔ ایک قبیلہ بنی بکر کے شیخ عمر بن نفاثہ اور دوسرے قبیلہ ہذیل کے سردار خویلد بن نائلہ۔ ان دونوں نے یہ پیش کش کی تھی کہ مکہ میں جو کچھ دولت ہے اس کی ایک تہائی ابرہہ منظور کر لے اور ہدم کعبہ کے ارادہ سے باز آجائے۔ مگر ابرہہ نے اس پیش کش کو مسترد کر دیا۔ اس روایت کو سامنے رکھا جائے تو عبد المطلب کی یہ موقع شناسی تھی کہ انہوں نے کعبہ کے متعلق ابرہہ سے کوئی بات ہی نہیں کی۔ صرف اپنے اونٹوں کی بات کی اور کعبہ کا معاملہ رب کعبہ کے حوالہ رکھا۔

ابرہہ نے اونٹ واپس دلوا دیئے۔ عبد المطلب ان کو لے کر مکہ میں آئے۔ تمام اونٹ [1] قربانی کے لئے وقف کر دیئے اور مکہ والوں کو ہدایت کی کہ شہر خالی کر کے پہاڑوں پر چلے جائیں۔

پھر تنہا اور ایک روایت کے مطابق چند ساتھیوں [2] کو لے کر حرم کعبہ میں آئے اور خانہ کعبہ کی چوکھٹ پر کھڑے ہو کر حلقہ باب کو سنبھالا اور یہ منظوم دعا [3] کی:

۱۔ لاهم ★ ان العبد يمنع رحله فامنع حلالك

۲۔ لا يغلبن صليبهم و محالهم غدّوا محالك

۳۔ ان كنت تاركهم وقبيلتنا فامر مابدالك

یہ تین اشعار ابن سعد اور ابن ہشام نے نقل کئے ہیں۔ ان کے علاوہ یہ دو شعر بھی مروی ہیں:

۴۔ جروا جموع جموعهم۔ والفيل كى يسبو عيالك۔

۵۔ عمدوا حماك بكيدهم۔ جهلا و ما رقبوا جلالك

ترجمہ: (۱) اے اللہ! ایک غلام اپنے کجاوہ کی حفاظت کرتا ہے۔ بس خداوند تو ان کی حفاظت کر جو تیرے بیت کے پڑوسی اور مجاور ہیں۔ (۲) ایسا ہرگز نہ ہو کہ ان کی تدبیر اور ان کا مکر و فریب کل کو تیری تدبیر پر غالب آجائے۔ (۳) اگر میں ان دشمنان کعبہ کو اور اپنے قبیلہ کو چھوڑ کر جا رہا ہوں (کہ میں مجبور اور بے بس ہوں۔ میرے لئے کوئی چارہ کار نہیں ہے تو خداوندا) جو تیرا ارادہ ہو اس کا حکم کر دے۔ (۴) یہ اپنے بے شمار لشکروں کو لے آئے ہیں اور ہاتھیوں کو لائے ہیں تاکہ باشندگان مکہ کو جو تیرے عیال ہیں قید کر لیں۔ (۵) انہوں نے اپنے مکر و فریب اور جہالت سے تیرے حِما (محفوظ

---

[3] سیرۃ ابن ہشام ص ۳۳ جلد ۱

[1] ابن سعد ص ۵۶، ج ۱

[2] عمرو بن عائذ۔ مطعم بن عدی۔ ابو مسعود ثقفی ابن سعد ۵۶ ج ۱

[3] عبد المطلب نے جو جوابات دیئے ان سے نیز اس دعا سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خدا پرست موحد تھے: والاشبه انه من اهل الفترة وممن لم تبلغه الدعوة (حاشیہ سیرۃ ابن ہشام ص ۳۳ ج ۱)

★ اصل اللّٰهمّ

علاقہ۔ حرم) کا قصد کیا ہے۔ انہوں نے تیری عظمت کا پاس ولحاظ نہیں کیا۔"

اس کے بعد کیا ہوا۔ تاریخ عالم کا وہ عبرت انگیز اور ہولناک حادثہ پیش آیا جس کا تذکرہ قرآن حکیم نے بھی کیا ہے۔ مورخین کا بیان ہے کہ ابرہہ عظیم الشان مسلح فوج کے ساتھ تیرہ قلعہ شکن ہاتھی لایا تھا۔ ان میں سب سے بڑا ہیبت ناک اور بڑے ڈیل ڈول کا ہاتھی محمود تھا۔ وہ ہاتھیوں کی کمان کر رہا تھا۔ جب حملہ کا وقت آیا تو یہ ہاتھی اپنی جگہ جم گیا۔ بہت مارا پیٹا مگر یہ آگے کی طرف حرکت نہ کرتا، دائیں بائیں اس کا رخ کر دیا جاتا تو خوب لپک کر چلتا۔

یہاں ہاتھی کا یہ تماشا ہو رہا تھا۔ ادھر آسمان پر پرندوں کی قطار نمودار ہوئی۔ ایک پرندہ تین کنکریاں لئے ہوئے تھا۔ ایک ایک چونچ میں دو دو پنجوں میں۔ یہ کنکریاں چنے کی اور مسور کے دانے کے برابر تھیں۔ یہ کنکریاں جس پر پڑتیں اس کا چورا کر دیتی تھیں۔ پھر پانی کی ایک رو آئی اس نے ان سب کو بہا کر سمندر میں ڈال دیا۔ ابرہہ اور اس کے مخصوص ساتھی اس وقت ختم نہیں ہوئے۔ وہ بھاگے اور طرح طرح کی تکلیفوں میں مبتلا ہو کر راستہ ہی میں مر گئے۔ ابرہہ کو ایسی بیماری لگی کہ اس کا بدن گل گیا، ایک ایک عضو گل کر گرتا رہا۔ وہ صنعا پہنچ گیا مگر اس حالت میں پہنچا کہ گوشت کا لوتھڑا تھا۔ وہاں پہنچ کر اس کا سینہ پھٹا۔ دل باہر نکل آیا اور دل کے ساتھ جان بھی نکل گئی۔ [1]

واقعہ اصحاب فیل کے نتائج

جیسے یہ واقعہ غیر معمولی تھا، قدرتی بات تھی کے نتائج بھی غیر معمولی ہوئے۔ سیاسی لحاظ سے تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ:

(۱) عربوں کو قیصر روم اور اس کے ماتحت حکومتوں سے نفرت ہوئی۔ اس واقعہ سے تقریباً پچاس سال بعد جب روم کی فوجوں کو ایران نے شکست دی تو مکہ والے بہت خوش ہوئے۔ [2]

(۲) یمن کی وہ طاقتیں جو ابرہہ کی طاقت کے سامنے جھک گئی تھیں ابھریں اور انہوں نے شہنشاہ ایران (کسریٰ) سے مدد لے کر ابرہہ کے باقی ماندہ اثرات کو یمن سے ختم کیا۔

(۳) یمن کی یہ ابھرنے والی طاقتیں اچھی صلاحیت نہیں رکھتی تھیں۔ ان میں خانہ جنگی شروع ہوگئی تو کسریٰ نے براہ راست یمن کے ایک علاقہ کو اپنے قبضہ میں لے لیا اور وہاں اپنا گورنر مقرر کر دیا۔ [3]

---

[1] ابن ہشام ۵۴ ج ۱

[2] سورہ روم کی ابتدائی آیتوں میں اس کی طرف اشارہ ہے

[3] جب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لائے تو کسریٰ کی طرف سے یمن کا گورنر باذان تھا جو دولت اسلام سے مشرف ہوا۔ (ابو الفداء)۔

تصدیق کلام

اصحاب فیل کا یہ واقعہ جس طرح قادر ذوالجلال کی قدرت بے پایاں کا مظاہرہ تھا ایسے ہی قریش پر احسان عظیم بھی تھا۔ قریش خراب وخستہ تھے مگر رب ذوالجلال کو ان سے کام لینا تھا۔ یہی قریش تھے جنھوں نے کچھ دنوں بعد دنیا کا چولا بدلا اور عالم انسانیت کو ایسے زیور سے آراستہ کیا جو اسی طرح بے مثال وبے نظیر ہے جس طرح تاریخ عالم میں اصحاب فیل کا واقعہ بے نظیر ہے۔

سورہ فیل میں اللہ تعالیٰ نے اسی احسان عظیم کا تذکرہ فرمایا ہے۔ خطاب اگرچہ آنحضرت ﷺ کو (یا ہر اس شخص کو ہے جو قابل خطاب ہو) مگر روئے سخن قریش کی طرف ہے۔ ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادرؒ کے الفاظ میں کسی قدر تشریح کے ساتھ یہ ہے:

> ”تو نے نہیں دیکھا، کیا کیا تیرے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ۔ کیا نہ کر دیا ان کا داؤ غلط۔ اور بھیجے ان پر اڑتے جانور تنک تنک (ٹکڑیاں بنا کر) پھینکتے ان پر پتھریاں کنکر کی (ٹھیکرے کی) پھر کر ڈالا ان کو جیسے بھس ہو کھایا ہوا۔“

اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے قریش کو خاص طور سے حکم دیا ہے کہ وہ رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ کی عبادت کریں اور اس حکم کی معقولیت کے لئے وہ احسانات شمار کرائے ہیں، جن کی تفصیل وہ ہے جو اس کتابچہ کے اوراق میں پیش کی گئی۔ مختصر یہ ہے کہ

(۱) اس سورت میں سب سے زیادہ بیت پر زور دیا گیا ہے، یہاں تک کہ ذات معبود کے لئے اللہ یا رحمن کے بجائے رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ کا لفظ لایا گیا ہے کیونکہ حقیقت یہی ہے کہ عظمت قریش کے قلعہ معلی کا سنگ بنیاد بیت ہی تھا (یعنی کعبہ)۔

(۲) یہی بیت تھا جس کی وجہ سے قریش کا اثر عرب پر قائم ہوا۔ قریش نے بیت کی خدمت کی اور وہ عرب کے سر تاج بنے۔

(۳) قریش نے بیت اللہ کی زیارت کرنے والوں (حجاج) کی خدمت کی وہ پورے عرب میں محبوب ہو گئے۔

(۴) یہی محبوبیت تھی جس کی بناء پر پورے عرب کی پر آشوب اور خوں آشام زمین ان کے لئے امن کا گہوارہ بن گئی۔ چار ماہ کے بجائے پورے بارہ ماہ ان کے لئے حرم رہتے تھے اور بلا خطر جہاں چاہتے جاتے تھے۔

(۵) یہی عظمت تھی جس کی بنا پر وہ قیصر وکسریٰ اور نجاشی تک پہنچے اور ان سے تجارت کے پروانے حاصل کئے۔

(۶) اندرون عرب عربوں کی عقیدت اور ان کی ارادتمندی اور احسان شناسی اور بیرون عرب فرامین شاہی کی طاقت نے قریش کو موقع دیا کہ ان کا رہنما ہاشم رِحْلَةَ الشِّتَآءِ اور رِحْلَةَ الصَّيْفِ الصیف کا طریقہ ایجاد کر سکا اور تجارت کو منظم کر سکا۔

(۷) مکہ اور اطراف مکہ میں غلہ عنقا تھا۔ شکار کا گوشت اور کھجوریں عام غذا تھی۔ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَ الصَّيْفِ کی

ایجاد نے ان کو موقع دیا کہ وہ واپسی کے وقت غلہ لاسکیں اور عرب کا فاقہ توڑ سکیں۔

(۸) کلبی کی تحقیق یہ ہے کہ ہاشم ابن عبد مناف پہلا شخص ہے جو شام کے علاقہ میں تجارتی قافلہ لے کر گیا اور وہاں سے گیہوں بھر کر لایا۔ ❶

(۹) اسی سورت کی تفسیر میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ارشاد یہ ہے کہ قریش کی حالت نہایت ابتر تھی وہ فاقہ کش تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ہاشم کو توفیق بخشی کہ انہوں نے رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَ الصَّيْفِ کا طریقہ ایجاد کیا۔ اب ان کو بہت کافی نفع ہوتا تھا۔ بڑے تاجر اپنے منافع غریبوں اور فقیروں کو تقسیم کر دیا کرتے تھے تو ان کے فقیر بھی امیروں کی طرح ہو جاتے تھے۔ ❷

(۱۰) جب رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَ الصَّيْفِ سے تجارتی تعلقات دوسرے ممالک سے قائم ہو گئے تو پھر غلہ کی درآمد کیلئے ان قریشی قافلوں کی ضرورت بھی نہیں رہی۔ بلکہ دوسرے ممالک خود غلہ بھیجنے لگے۔ یمن میں تُبالہ اور جُرش میں بہت غلہ پیدا ہوتا تھا۔ وہاں کے کچھ تاجر بحری راستہ سے بندر گاہ جدہ پر غلہ پہنچاتے تھے۔ کچھ تاجر خشکی کے راستہ سے براہ راست مکہ غلہ پہنچاتے تھے۔ اسی طرح شام کے تاجر بھی غلہ سپلائی کرتے تھے۔ ❸ یہ اونٹ اور خچر اور گدھے جن پر خشکی کے راستوں سے غلہ آتا تھا ان کا پڑاؤ محصبّ ہوتا تھا جس کو ابطح، بطحا اور خیف بنی کنانہ بھی کہتے تھے ❹ جو مکہ اور منیٰ کے درمیان ہے۔ یہ ہے اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ (کھانا دیا بھوک میں) کا احسان عظیم۔

(۱۱) حرم کعبہ کا احترام اگرچہ حضرت اسماعیل و حضرت ابراہیم علیہ اسلام کے زمانہ سے چلا آرہا تھا اور اس وجہ سے حرم مکہ کے رہنے والے مامون رہا کرتے تھے۔ مگر جب رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَ الصَّيْفِ کے سلسلہ میں مامونیت کا تذکرہ ہے تو اس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ قریش کے یہ سرمائی اور گرمائی قافلے مال لیجانے اور لانے میں راستہ کے قبائل کی جو خدمت کیا کرتے تھے، اس حسن سلوک نے قریش کو خارج حرم ان قبائل کی حدود میں بھی محفوظ و مامون کر دیا تھا جن کا پیشہ ہی غارتگری تھا۔ عبادت رب کے حکم کی معقولیت سمجھانے کیلئے ان گیارہ احسانات کی طرف اس سورت (سورہ قریش) میں اشارہ کیا اور ایک احسان عظیم وہ تھا کہ مکہ اور اہل مکہ کو اصحاب فیل سے محفوظ رکھا۔ اس کی نوعیت چونکہ جداگانہ تھی کہ وہ دنیاوی اسباب سے بالا و برتر محض اللہ تعالیٰ کی قدرت کا معجزہ تھا، تو اس کو مستقل سورت میں ذکر فرمایا اور بظاہر یہی حکمت ہے ان دونوں سورتوں کے متصل ہونے کی۔

---

❶ تفسیر مظہری (تفسیر سورۃ قریش)
❷ ایضاً
❸ معالم التنزیل
❹ معجم البلدان

ولادت محمدی ﷺ

ظہور بشارت عظمیٰ

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جو بشارت دی تھی یاتی من بعدی اسمه احمد (میرے بعد ایک رسول آئے گا جس کا نام احمد ہو گا) (۶۱:۶)

۲۵ اپریل ۵۷۱ء کو اس جان آفریں بشارت کا ظہور ہوا۔

صبح کا سہانا وقت تھا۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا کہ ہدایت و رحمت کا یہ آفتاب افق مکہ پر طلوع ہوا۔ ربیع الاول کی بارہ تھی۔ [1]

نام نامی:

اس چہیتے بچہ کا نام دادا نے "محمد" والدہ نے "احمد" رکھا۔ باپ (عبد اللہ) کا انتقال دو مہینے پہلے ہو چکا تھا۔ [2]

والدہ کا نام آمنہ تھا اور دادا کا نام عبد المطلب جو قریش کے سردار اور مکہ کے بڑے لوگوں میں سے تھے۔ آمنہ کے باپ کا نام وہب تھا پسر عبد مناف پسر زہرہ پسر کلاب پسر مرہ۔ کلاب پر مادری اور پدری دونوں سلسلے جمع ہو جاتے ہیں۔

---

[1] مشہور یہی ہے ھذا ھوالمشھور عندالجمھور (البدایہ والنہایہ ۲۶۰ ج ۲) مگر مورخین نے ۱۲ کے علاوہ اور تاریخیں بھی بیان کی ہیں۔ فلکیات کے ماہر علامہ محمود فلکی نے ۹ ربیع الاول صحیح قرار دی ہے۔ حضرت الاستاذ العلام المحدث مولانا سید انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ، ان کے علاوہ علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی علامہ محمود فلکی کی تحقیق کو تسلیم کیا ہے۔ یعنی ۹ ربیع الاول ۲۱ اپریل ۵۷۱ء

[2] وہ تجارتی قافلہ میں شام گئے تھے غلہ لینے کے لئے۔ واپسی میں جب قافلہ مدینہ پہنچا تو عبد اللہ بیمار ہو گئے۔ مدینہ کے مشہور قبیلہ بنی عدی بن نجار سے ننھیالی رشتہ تھا۔ عبد اللہ یہیں ٹھہر گئے قافلہ والوں نے مکہ پہنچ کر خواجہ عبد المطلب کو عبد اللہ کی بیماری کی خبر دی۔ عبد المطلب نے اپنے بڑے لڑکے حارث کو مدینہ بھیجا۔ مگر عبد اللہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ دار النابغہ میں ان کو دفن کیا گیا۔ پچیس سال عمر ہوئی۔ ترکہ میں بکریوں کا ایک گلہ، پانچ اونٹ ایک باندی "ام ایمن" چھوڑی۔ (طبقات ابن سعد ص ۶۱ ج ۱)

رضاعت وشیر خوارگی اور مرضعات

(دودھ پلانیوالی مائیں)

زعم برتری اور خوش حالی کا ایک تکلف یہ تھا کہ بیگمات اپنے بچوں کو خود دودھ نہیں پلاتی تھیں۔ کچھ عرصہ بچہ ماں کے پاس رہتا تو دودھ پلانے میں خاندان کی عورتیں یا باندیاں مدد کیا کرتی تھیں۔ پھر بچہ کو مستقل طور پر کسی ماما کے سپرد کر دیا جاتا تھا۔

قریش کو اپنی زبان سے عشق تھا۔ وہ شخص قوم کا سردار نہیں مانا جاسکتا تھا جو فصیح نہ ہو۔ بچپن ہی سے زبان کی حفاظت کی جاتی تھی اور بچوں کو فصیح عربی کا عادی بنایا جاتا تھا۔ مکہ شہر میں یہ ممکن نہیں تھا کہ بچے ٹکسالی فصیح عربی کے عادی ہوں کیونکہ یہ ایک تیر تھ تھا جہاں غیر قریشی عرب جو فصاحت سے نا آشنا ہوتے تھے، ہمیشہ آتے رہتے تھے۔ یہاں قیام کرتے تھے۔ تجارت کے سلسلہ میں بھی آمدورفت رہتی تھی اور زبان کے لحاظ سے سب سے زیادہ خطرناک بات یہ تھی کہ یہاں عجمی (شام اور افریقہ وغیرہ کے غلام) بکثرت رہتے تھے۔ ایک ایک گھرانے میں کئی کئی غلام ہوتے تھے۔ ان کی مخلوط عربی مضحکہ خیز ہوتی تھی اور بچوں کا واسطہ زیادہ تر انہیں غلاموں سے پڑتا تھا۔ اس لئے قریش نے کچھ ایسے دیہاتی قبائل منتخب کر رکھے تھے جن کی زبان فصیح مانی جاتی تھی۔ انہیں قبائل کی عورتوں کو وہ اپنے بچوں کی "ماما" بناتے تھے۔ ان قبائل کی عورتیں مکہ میں آتیں اور بچوں کو لے جاتیں۔ وہی دودھ پلاتیں اور وہی پرورش کرتیں۔ انہیں کی ٹکسالی عربی کے الفاظ بچوں کے کانوں میں پڑتے۔ انہیں الفاظ کی ادائیگی کے لئے بچوں کی زبان پہلی مرتبہ پلٹتی اور فصاحت گویا ان کی گھٹی میں پڑ جاتی۔

زبان کی حفاظت کے علاوہ صحت کے لحاظ سے بھی دیہات کی کھلی ہوا بچوں کے لئے مفید ہوتی تھی۔ اس سماجی رسم کا ایک محرک یہ بھی تھا کہ بچوں کی نشوونما صحت مندانہ [1] ہو۔ اخلاق وخصائل کے لحاظ سے بھی یہ قبیلے پست نہیں تھے۔ یتیم عبداللہ کے دور رضاعت کو خاندانی آداب کے اسی سانچہ میں ڈھلنا پڑا۔ چنانچہ آپ کی والدہ نے تو صرف سات یا نو روز دودھ پلایا۔ پھر ابولہب کی آزاد کردہ باندی ثوبیہ نے سات ماہ دودھ پلایا۔ ابولہب کی باندی ثوبیہ نے جب گوشہ جگر عبداللہ کی ولادت کی خبر سنائی تو ابولہب نے اس خوشی میں اس باندی کو آزاد کر دیا تھا۔ ان کے علاوہ کچھ اور خواتین کے نام بھی لئے جاتے ہیں جنہوں نے دودھ پلایا۔ اس کے بعد آپ حضرت حلیمہ کے سپرد کئے گئے جو آپ کو قبیلہ بنی سعد میں لے گئیں۔ کم و بیش چار سال آپ نے اسی قبیلہ میں گزارے۔

---

[1] سیرۃ ابن ہشام ص ۱۰۱، ج ۱

سیّدہ آمنہ مدینہ میں

مدینہ منورہ جس کا نام اُس وقت یثرب تھا۔ سیدہ آمنہ کا وہاں ننہیالی رشتہ تھا۔ حضرت محمد (ﷺ) حلیمہ سعدیہ کے یہاں سے آگئے تو تقریباً تیرہ سال بعد سیّدہ آمنہ مدینہ گئیں۔ اپنے نور چشم لختِ جگر کو بھی لے گئیں اور خدمت کے لیے متوفی عبداللہ کی باندی "ام ایمن" بھی ساتھ گئیں۔ وہاں دارالنابغہ میں قیام کیا۔ یتیم عبداللہ۔ آمنہ کا لال جس طرح حُسن و جمال میں موتی تھا۔ اُس کی خصلتیں بھی سب بچوں سے نرالی تھیں۔ ذہین بچے شریر ہوتے ہیں مگر آمنہ کے اس جگر گوشہ میں ذہانت تو کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، شرارت کا نام نہ تھا۔ ہر بات میں ادب اور تہذیب۔ ہر ایک کام سلیقہ کا۔ بھولی بھولی بات چیت بہت شیریں۔ سمجھداری اور شرافت ایسی کہ لوگ حیران رہ جاتے تھے۔ دوسروں سے تذکرہ کرتے وہ اس بچّہ کو دیکھنے آتے تھے۔ مدینہ سے دو دو تین تین میل کے فاصلہ پر یہودیوں کی بڑی بڑی بستیاں تھیں۔ وہاں بڑے بڑے عالم رہتے تھے۔ وہ آنے والے نبی کی پیشین گوئیاں کیا کرتے تھے اور اُس کی آمد کے منتظر تھے۔ نجومیوں اور جوتشیوں (کاہنوں) کی باتیں بھی مشہور تھیں۔ اس بچہ کی خبر رفتہ رفتہ ان یہودیوں کو پہونچی تو وہ دیکھنے آنے لگے۔ کوئی دیکھ کر بچہ کی تعظیم کرتا اور کوئی ہکا بکا دم بخود رہ جاتا کہ جو باتیں آنے والے نبی کی ہیں وہ اس بچہ میں پائی جاتی ہیں۔ پھر اپنی تنگ نظری سے جزبز ہونے لگتا کہ نبوت تو ہمارے خاندانوں کا حصّہ ہے۔ قریش میں یہ بچہ کیوں پیدا ہو گیا۔ اس طرح کی باتیں ہونے لگیں۔ سیّدہ آمنہ کو حلیمہ کی بات یاد آگئی کہ وہ ایک یہودی کے پاس اس نونہال کو لے گئی تھیں تو اُس نے شور مچادیا تھا کہ اس بچہ کو ختم کر دو ورنہ انقلاب برپا کر دے گا، تمہارے مذہب بدل دے گا۔ سیدّہ آمنہ کو فکر ہوئی اُنھوں نے مدینہ کا قیام مختصر کیا۔ صرف ایک مہینہ ٹھہریں۔ پھر اپنے آنکھوں کے نور، دل کے سرور کو لے کر مکّہ روانہ ہو گئیں۔ لیکن اس یتیم بچہ کی انوکھی بات یہ بھی تھی کہ قدرت نے ابھی سے اس کو آزمانا شروع کر دیا تھا۔ سیّدہ آمنہ مدینہ سے چلیں تو طبیعت خراب ہو گئی۔ اب جیسے جیسے قافلہ چل رہا تھا، اُن کا مرض بڑھ رہا تھا۔ ایک مقام ابواء تھا۔ وہاں قافلے پڑاؤ کیا کرتے تھے۔ جب سیّدہ آمنہ یہاں پہونچیں تو مرض اور بڑھ گیا۔ آگے چلنے کی ہمت نہیں رہی، مکہ کے بجائے آخرت کے لئے رختِ سفر باندھ لیا اور دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ یہیں اُن کو سُپردِ خاک کر دیا گیا۔ "ام ایمن" ساتھ تھیں۔ وہ اس یتیم کو جو اب یسیر بھی ہو گیا تھا، لے کر مکہ معظمہ آئیں۔ دادا کو خبر ہوئی تو بہت صدمہ ہوا۔

اس واقعہ سے تقریباً پچاس سال بعد جب آنحضرت ﷺ ہجرت کر کے مدینہ پہونچے تو آپ ﷺ کو بچپن کی باتیں یاد تھیں۔ آپ بتایا کرتے تھے کہ یہاں ہم ٹھہرے تھے۔ یہاں والدہ کا قیام ہوا تھا۔ یہودی مجھے آآکر دیکھا کرتے تھے۔ آپ نے یہ بھی بتایا کہ "بنی عدی بن نجار" کے محلہ میں ایک باولی تھی،

میں اُس میں تیراکی کی مشق کیا کرتا تھا۔ ام ایمن بیان کرتی تھیں کہ مجھے خوب یاد ہے۔ یہودی کہا کرتے تھے کہ یہ بچہ اس اُمت کا نبی ہو گا، مکہ سے ہجرت کر کے آئے گا یہ اس کا دارالہجرت ہے۔ ❶

دادا عبد المطلب کی سرپرستی اور وفات

یہ غم زدہ معصوم مکہ معظمہ پہنچا تو عبد المطلب نے اپنے یتیم و یسیر پوتے کو چھاتی سے لگایا اور اپنے ساتھ رکھنے لگے۔

یہ معصوم بھی دادا سے لگ گیا اور اتنا کھل گیا کہ ان کے پاس جاتا تو بلا تکلف ان کی گدی پر بیٹھ جاتا تھا۔ خانہ کعبہ کی دیوار کے نیچے ان کے لئے فرش بچھایا جاتا تھا۔ فرش پر عبد المطلب بیٹھتے اور کنارے پر لڑکے بیٹھا کرتے تھے۔ مگر یہ معصوم "محمد" آگے پہنچ جاتے تھے۔ چچا تائے منع کرتے تھے لیکن عبد المطلب خوش ہوتے اپنے پاس بٹھا لیتے۔ کمر پر ہاتھ پھیرتے اور فرمایا کرتے تھے یہ میرا بیٹا بہت بڑا آدمی ہو گا۔ اس کی خاص شان ہو گی۔ ❷ یہودی کہتے ہیں کہ یہ نبی ہو گا۔ ❸ اُم ایمن جن کو برکت کہتے تھے ان کو تاکید کیا کرتے کہ دیکھو برکت! میرے محمد کا ہر وقت خیال رکھا کرو، کہیں باہر نہ جانے دیا کرو۔ ❹

لیکن عبد المطلب چراغ سحری تھے۔ ❺ سو سال سے بھی زیادہ عمر ہو چکی تھی۔ صرف دو سال پوتے کی دیکھ بھال کر سکے پھر ان کی وفات ہو گئی۔ ام ایمن کہا کرتی تھیں کہ اس روز میں نے دیکھا کہ جنازے کے پیچھے "محمد" روتے جا رہے تھے۔ (ﷺ)

آنحضرت ﷺ سے پوچھا گیا: آپ کو دادا کی وفات یاد ہے فرمایا خوب یاد ہے میری عمر اس وقت آٹھ سال تھی ❻

خواجہ ابو طالب کی سرپرستی

عبد المطلب نے زندگی کے آخری ایام میں ہی یتیمِ عبد اللہ کو ابو طالب کے سپرد کیا۔ ابو طالب کو پہلے

---

❶ طبقات ابن سعد ج ۱، ص ۷۳

❷ سیرت ابن ہشام ص ۱۰۶

❸ طبقات ابن سعد ص ۷۵، ج ۱

❹ ایضاً ص ۷۵

❺ ایک روایت ہے کہ ایک سو دس سال اور دوسری روایت میں ہے کہ ایک سو بیس سال عمر ہوئی۔ یہ بھی روایت ہے کہ بیاسی سال عمر ہوئی حجون میں دفن کیا گیا۔ طبقات ص ۷۵ ج ۱

❻ طبقات ابن سعد ص ۷۵ ج ۱

سے بھی اس بھتیجے سے محبت تھی اب یہ محبت اور بڑھ گئی بقول[1] ابن عباس (رضی اللہ عنہ) اپنی اولاد سے زیادہ اس بھتیجے سے محبت کرتے تھے۔ ابو طالب کو ایسی محبت کبھی کسی سے نہیں ہوئی تھی۔ ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے۔ کہیں جاتے تو ساتھ لے جاتے۔ رات کو اپنے پاس لٹاتے تھے۔ دستر خوان بچھ جاتا سب بچے بیٹھ جاتے مگر ابو طالب اس وقت تک نوالہ نہ توڑتے جب تک ان کا چہیتا "محمد" نہ آجاتا تھا۔ محمد کی باتیں بھی ایسی تھیں کہ ابو طالب کے دل کو لبھاتی رہتیں۔ دستر خوان پر جب بچے اکٹھے ہوتے تو چیخ و پکار اور چھین جھپٹ کرتے مگر یہ بھولے صاحبزادے "محمد" خاموش بیٹھے رہتے۔ کبھی ایسا ہوتا کہ انہیں کچھ بھی نہ ملتا، دوسرے بچے ہی جھپٹ لیتے تھے۔ ابو طالب نے محمد کا کھانا الگ کر دیا[2] مگر یہ بات محمد کی فطرت کے خلاف تھی کہ الگ کھائیں یا کوئی چیز ان کو مل جائے اور دوسروں کو نہ ملے۔ اس لئے الگ کھانے پر محمد راضی نہ ہوئے سب کے ساتھ ہی کھاتے اور اپنے کھانے سے زیادہ دوسروں کے کھانے سے خوش ہوتے۔ کبھی خود اپنے پاس سے اٹھا کر دیتے تھے۔

علماء سیرت و تاریخ کا ایک متفقہ بیان ہے۔ اس موقع پر اس کا ترجمہ پیش کیا جارہا ہے:

محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کردار کے ساتھ جوانی کی منزل پر پہنچے کہ زمانہ جاہلیت کی باتوں سے اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ آپ کو محفوظ رکھا۔ آپ ایسے نوجوان تھے کہ مروت میں سب سے افضل، شرافت کی باتوں میں سب سے اعلیٰ، اخلاق میں سب سے بہتر، میل جول میں نہایت شریف، جواب دینے میں نہایت مہذب اور باسلیقہ، گفتگو نہایت شیریں، سمجھ بوجھ میں سب سے برتر، نہایت بردبار، نہایت امانت دار، بات کے سچے، زبان کے پکے، ہر ایک برائی سے کوسوں دور، ہر ایک کے خیر خواہ، کبھی کسی کو آپ سے تکلیف نہ پہنچی، کبھی کسی کو سخت بات نہیں کہی، نہ کسی سے لڑائی نہ کسی سے جھگڑا کیا۔ انہیں خوبیوں نے آپ کی قوم کو آپ کا گرویدہ بنادیا۔ آپ کی سچائی اور امانتداری نے لوگوں میں جذبہ پیدا کیا کہ آپ کو الامین (الصادق) کہیں اور اسی نام سے آپ کو یاد کریں۔

اپنا تکفل خود اور دوسروں کی مدد

اپنی زندگی خود بناؤ، اپنا بوجھ خود سنبھالو، دوسروں کی مدد کرو۔

عبد المطلب کی وفات کے بعد ابو طالب ان کے جانشین بنائے گئے۔ قبیلہ کے شیخ اور مکہ کے ایک سردار مانے گئے۔ اس لحاظ سے عزت تو کافی تھی مگر دولت ناکافی۔ بڑا کنبہ، عیال کثیر آمدنی کا ذریعہ محدود، یتیم عبد اللہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کے سپرد ہوئے تو اگرچہ یہ یتیم عمر عزیز کی ابھی آٹھویں منزل ہی طے کر رہا

---

[1] بدایہ ونہایہ ص ۲۸۲ ج ۲

[2] بدایہ ونہایہ ص ۲۸۲ ج ۱

تھا مگر چچا کی پریشان حالی کے احساس نے اس کو اس ننھی سی عمر میں ہی فکر مند بنا دیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اپنے مربی چچا کی مدد وہ کس طرح کر سکتا تھا۔ مگر مکہ میں نہ کوئی دستکاری تھی نہ کوئی سرکار جس کی نوکری کی جاسکے۔ اس زمانہ کی دنیا کارخانوں سے بھی آشنا نہ تھی اور مکہ کی پتھریلی اور ریتلی زمین اور آس پاس کے جھلسے ہوئے کالے اور بھوسلے پہاڑوں کو کسی چشمہ یا دریا کی سیرابی بھی میسر نہ تھی کہ وہاں کھیتی باڑی ہو سکے۔ البتہ بھیڑ بکری اور اونٹ یہاں بکثرت تھے اور قدرت نے ان کا چارہ یعنی ببول کے درخت اور اذخر جیسی گھاس بھی وہاں پیدا کی تھی۔ انہیں مویشی کے گلے اس زمانہ کی قیمتی دولت تھے اور جن کے پاس یہ دولت ہوتی تھی وہ ان کے چرانے اور دیکھ بھال کے لئے مزدور اور اجیر بھی رکھا کرتے تھے۔ یہ گلہ بانی سوسائٹی کی نظر میں کچھ بھی حیثیت رکھتی ہو مگر آمدنی اور گذر کا ایک جائز ذریعہ تھی۔ سردار قریش عبدالمطلب کے یتیم پوتے محمد ﷺ نے اسی ذریعہ کو اختیار کیا اور اس کے ننھے سے وجود کے لئے اونٹوں کی گلہ بانی مشکل تھی تو بکریاں چرانے کی مزدوری کرنے لگے۔ اس طرح اپنی زندگی خود بنالی۔ اور نہ صرف یہ کہ اپنا بوجھ خود سنبھالا بلکہ پریشان حال چچا کی مدد بھی کرنے لگے۔

مکہ تجارتی نقطہ نظر سے:

مکہ کی زمین اگرچہ پیداوار کے قابل نہیں تھی مگر تجارتی کاروبار کے لئے نہایت موزوں تھی۔ یہاں مشرق و مغرب کے ڈانڈے ملتے تھے۔ ایران و عراق، یمن، شام اور افریقہ کے تجارتی تعلقات کی درمیانی کڑی یہی شہر تھا۔ قریش اس قدرتی نعمت کو پہچانتے تھے اور جہاں تک ان کی گنجائش تھی وہ اس سے فائدہ اٹھاتے تھے۔

بعثت نبوی (آنحضرت ﷺ کے نبی بنائے جانے) سے تقریباً دو سو برس پہلے قریش کے مشہور اور ممتاز سردار ہاشم نے رحلۃ الشتاء والصیف (سردی اور گرمی کے موسم کے دو کوچ) کا دستور ڈال دیا تھا۔ گرمیوں میں مکہ والوں کے تجارتی قافلے شام اور انقرہ جاتے تھے جہاں اس زمانہ میں ٹھنڈ ہوتی تھی۔ وہ خوشگوار موسم، صحت بخش آب و ہوا۔ کا لطف بھی اٹھاتے اور تجارت بھی کرتے تھے، اور سردیوں میں یہ قافلہ حبشہ اور یمن جاتے تھے۔ ہاشم اور اس کے بھائیوں نے مختلف ممالک سے عربوں کے لئے آزاد تجارت کے سرٹیفکیٹ (پروانے) بھی حاصل کر لئے تھے۔ عرب میں قریش کی عظمت کا ایک بڑا سبب یہ تجارتی اقتدار بھی تھا۔

حضرت محمد ﷺ کی عمر نے ترقی کی اور اس قابل ہوئے کہ تجارتی قافلے کے ساتھ سفر کر سکیں تو آپ نے اس شریف پیشہ کو اپنانا چاہا۔ لیکن روپیہ آپ کے پاس نہیں تھا تو آپ نے دوسروں کے سرمایہ سے تجارت شروع کر دی۔ بیرونی تجارت میں بھی حصہ لیا اور جیسا کہ (عبداللہ بن ابی الحمس) کے واقعہ سے

معلوم ہوتا ہے کہ آپ مکہ میں گھوم پھر کر بھی کاروبار کرتے تھے۔ تفصیل آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیے۔ یہی دور تھا جب آپ نے چچا ابو طالب کی مستقل مدد یہ کی کہ نونہال "علی" کے مصارف سے ان کو سبکدوش کر دیا۔ ان کو اپنے ساتھ رکھا اور جملہ مصارف کے ذمہ دار خود ہو گئے۔

قومی خدمت کا جذبہ:

بچپن کا یہی معصوم دور جس کی خودداری نے اس معصوم نونہال کو گلہ بانی پر آمادہ کیا تھا، فطری طور پر قومی خدمت کے جذبے سے معمور تھا۔ کعبہ عربوں کا قومی اور مذہبی نشان تھا چونکہ وہ پہاڑوں کے نشیب میں واقع ہے تو جب بھی زور دار بارش ہوتی تھی سیلاب کی دھاریں اس کو چھوتی رہتی تھیں اور کبھی کبھی اس کو نقصان پہنچا دیا کرتی تھیں۔

مکہ اگرچہ ساحل سمندر سے صرف چالیس میل کے فاصلہ پر ہے مگر مون سون اس طرف نہیں جاتا۔ برسات تو وہاں ہوتی ہی نہیں۔ بارش بھی کبھی کبھی ہوتی ہے۔ بسا اوقات کئی سال گزر جاتے ہیں بارش کی ایک بوند نہیں برستی اور کبھی ایسی زور دار برستی ہے کہ مکہ میں طوفان آجاتا ہے۔ اس وقت کا ایک واقعہ ہے جب آنحضرت ﷺ کی عمر تقریباً دس سال ہو گی کہ مکہ کے پہاڑوں پر زور دار بارش ہوئی پھر سیلاب بھی ایسے زور کا آیا کہ کعبہ کی عمارت کو نقصان پہنچ گیا۔ سیلاب اترا تو کعبہ کی مرمت شروع کی گئی۔ سن رسیدہ اور نوجوان رضاکار اپنے اس قومی نشان کی مرمت کر رہے تھے تو لوگوں نے دیکھا کہ ایک بچہ بھی نوجوانوں کی طرح سرگرم ہے اور اگرچہ بساط کچھ بھی نہیں مگر جذبہ اور شوق کا یہ عالم ہے کہ بھاری بھاری پتھر مونڈھے پر اٹھا رہا ہے اور کعبہ کی دیوار تک پہنچا رہا ہے۔ مونڈھے پتھروں سے چھلے جا رہے ہیں، بوجھ اٹھانے سے سانس چڑھ رہا ہے مگر اس کے ولولہ میں کوئی فرق نہیں آرہا ہے۔

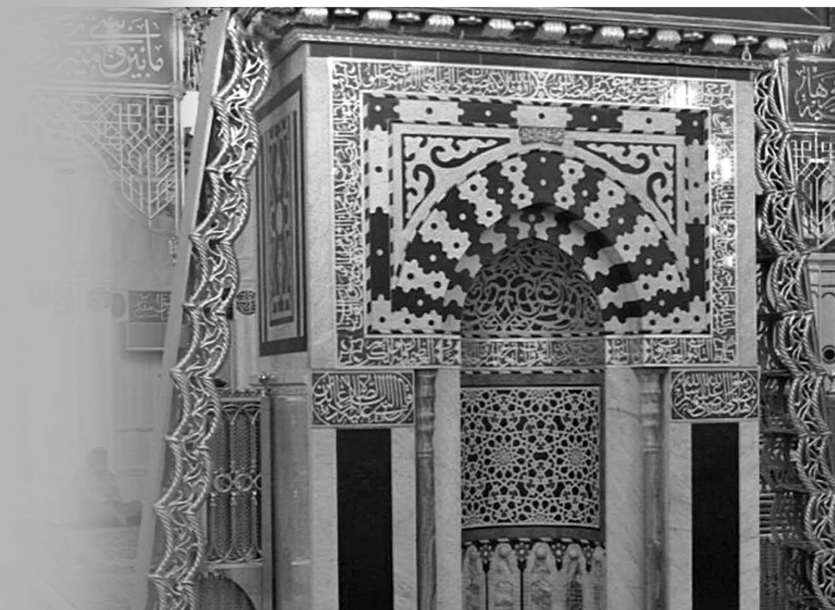
اور یہ بہادر بچہ وہی ہے جسے "محمد" کہا جاتا ہے (ﷺ)

شرم وحیا:

اس فلمی دور میں شرم وحیا ایک مذاق کی چیز بن گئی ہے۔ مگر دنیائے اخلاق میں یہ بہت قیمتی چیز ہے کیونکہ یہ درحقیقت اس خصلت کا نام ہے جو انسان کو ایسی باتوں سے روکے جو انسانیت اور شرافت کی نظر میں معیوب مانی جاتی ہیں۔

سیدنا محمد ﷺ کی فطرت کو جو شرم وحیا کی جنس گراں مایہ عطا ہوئی تھی اس کا ایک نمونہ اس موقع پر دیکھنے میں آیا۔

سیرت رسول ﷺ کے عملی پہلو



امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ

کعبہ کی مرمت کے سلسلہ میں جب آپ پتھر اٹھا رہے تھے تو آپ کے چھوٹے چچا عباس جو آپ سے دو سال بڑے تھے وہاں موجود تھے انہوں نے دیکھا کہ بے ڈول اور نوکیلے پتھروں سے ان کے معصوم بھتیجے محمد کے مونڈھے چھلے جا رہے ہیں۔ نیم وحشی عربوں میں برہنگی زیادہ معیوب نہیں تھی۔ وہ بسا اوقات اپنے عقیدے کے مطابق حج جیسے مقدس فرض ادا کرتے ہوئے خانہ کعبہ کے قریب (جو ان کے نزدیک سب سے زیادہ واجب الاحترام مقام تھا) مادر زاد برہنہ ہو جاتے تھے۔ عقیدہ یہ تھا کہ جن کپڑوں میں سال بھر گناہ کرتے رہے ہیں انہیں کپڑوں میں یہ مقدس فرض انجام دینا صحیح نہیں ہے۔ بہر حال عباس کو بھولے بھالے معصوم بھتیجے پر ترس آیا اور یہ چاہا کہ کوئی کپڑا بھتیجے کے مونڈھے پر ڈال دیں۔ کوئی اور کپڑا نہیں ملا تو اپنے یہاں کے عام دستور کے مطابق انہوں نے ارادہ کیا کہ بھتیجے کی لنگی کھول کر مونڈھے پر رکھ دیں۔ مگر اتنی سی برہنگی بھی اس شرمیلی اور باحیا فطرت کے لئے ناقابل برداشت تھی جو حضرت محمد ﷺ کو عطا ہوئی تھی۔ چنانچہ ابھی لنگی کھلنے بھی نہیں پائی تھی کہ اس برادر زادہ سعید کی حالت غیر ہونے لگی۔ چہرے پر سوائیاں اڑنے لگیں اور ایک ایسی اضطرابی صورت پیدا ہو گئی کہ عباس گھبرا گئے اور لنگی جوں کی توں باندھ دی۔

غیر اللہ کی پرستش سے پرہیز:

یہ عجیب بات ہے کہ مکہ کے باشندے بے دینی اور مذہب سے آوارہ ہونے کے باوجود اپنے آپ کو مذہبی سمجھتے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت عیسائیوں اور یہودیوں کے نزدیک مسلم تھی۔ کیونکہ عیسائی اور یہودی جو عام طور پر بنی اسرائیل تھے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چھوٹے فرزند حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ وہ جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نسلی اعتبار سے مورث اعلیٰ مانتے تھے، ایسے ہی مذہبی اعتبار سے بھی ان کو اپنی ملّت کا بانی مانتے تھے۔ یہی حال اس زمانہ میں عربوں کا بھی تھا۔ کیونکہ عرب عموماً اور قریش خصوصاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بڑے فرزند یعنی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد تھے۔ اس نسلی رشتے کے علاوہ خانہ کعبہ اور خود مکہ شہر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی تاریخی یادگار تھے۔ قریش خانہ کعبہ کے محافظ اور متولی بھی تھے جس کی بنا پر تمام عرب ان کی تعظیم کرتے تھے۔ اس لحاظ سے مکہ والوں کے لئے مذہبیت ایک لازمی چیز تھی۔ مگر ان کی یہ مذہبیت شرک اور اوہام پرستی کا جال بن کر رہ گئی تھی۔ ایک طرف حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا نام زبان پر تھا جنہوں نے شرک کے خلاف توحید کا جھنڈا بلند کیا تھا۔ اور دوسری طرف حالت یہ تھی کہ حرم کعبہ میں تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے اور ان کے علاوہ ہر ایک قبیلہ کا دیوتا اور اس کا بت الگ الگ تھا۔

شرک کی اس گرم بازاری میں کسی بچہ کا غیر اللہ کی پرستش سے بچنا ناممکن تھا۔ مگر جس کو قدرت نے وہ سنجیدگی عطا فرمائی تھی جس نے اس کو کھیل، تماشے اور قصہ گوئی کی محفلوں سے الگ رکھا۔ جو برہنگی

کے تصور سے بھی لرز جاتا تھا۔ وہ عبادت کے معاملہ میں یہ بے جوڑ بات اور یہ مذاق گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ ایک طرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کی توحید پرستی کے قصے سنے اور دوسری طرف اپنی پیشانی غیر اللہ کے سامنے جھکادے۔ ایک وقت اپنے ہاتھ سے مورتی بنائے اور دوسرے وقت اسی مورتی کے سامنے ماتھا ٹیک دے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ بات سب کو تسلیم ہے کہ کبھی آپ کی گردن غیر اللہ کی عبادت کے لئے نہیں جھکی۔

جس فطرت سلیم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سمجھادیا تھا کہ چاند سورج اور آسمان کے چمکدار تارے جن کو ان کی قوم معبود مانتی ہے ہرگز قابل پرستش نہیں ہیں۔ کیونکہ انسان کی طرح رات دن کی تبدیلیوں کا ان پر بھی اثر ہوتا ہے بلکہ وہ انسان سے زیادہ پابند اور بے بس نظر آتے ہیں۔ جو پابند ہو اور جس پر رات دن کی تبدیلیوں کا اثر ہوتا رہتا ہو وہ معبود نہیں ہو سکتا۔

اسی فطرت سلیم نے پاک طینت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوش سنبھالتے ہی بتادیا تھا کہ جس کو انسان خود بنائے وہ معبود نہیں ہو سکتا نہ اس قابل ہو سکتا ہے کہ انسان اس کے سامنے گردن جھکائے یا ماتھا رگڑے۔

بتوں کو چھونے سے پرہیز:

لوگ خانہ کعبہ کا طواف جب بھی کیا کرتے تھے وہاں پیتل کے دو بت[1] اساف اور نائلہ تھے۔ طواف کرنے والے ان کو بوسہ دیا کرتے تھے اور ان پر ہاتھ پھیرا کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چہیتے غلام زید بن حارثہ نے اپنے بیٹے حضرت حارثہ کو واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ بچپن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ طواف کر رہا تھا۔ چکر لگاتے ہوئے جب ہم اساف اور نائلہ کے پاس پہنچے تو میں نے چاہا کہ میں بھی انہیں چھولوں۔ حضرت محمد نے منع فرمادیا۔ اگلے چکر میں میں نے نظر بچا کر چھولینا چاہا اور چھو بھی لیا۔ مگر آپ کی جیسے ہی نظر پڑی آپ نے سختی سے ڈانٹا کہ میں نے تمہیں منع نہیں کیا تھا۔[2]

---

[1] یہ مرد اور عورت کے دو مجسمے ساتھ ساتھ تھے جن کو پوجا کرتے تھے اور ان پر بھینٹ چڑھایا کرتے تھے روایت ہے کہ خاص کعبہ مکرمہ میں فحش حرکت کرتے ہوئے مسخ کردیئے گئے تھے۔ عجائب پرستی کی انتہا تھی کہ جب پتھر بن گئے تو انکی پوجا شروع کردی گئی۔ (اخبار مکہ۔ ازرقی ص ۱۲۱ ج ۱)

[2] ہدایہ ونہایہ ص ۲۸۸ ج ۲ بروایت بیہقی

دور شباب اور جوہری کردار

تجارت:

نوخیز و نوجوان محمد ﷺ گلہ بانی سے آگے بڑھ کر میدان تجارت میں آئے تو آپ کے تعلقات وسیع ہوئے۔ لوگوں کو آپؐ کے آزمانے اور پرکھنے کا موقع ملا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ جن لوگوں نے آپؐ کو زیادہ قریب سے دیکھا وہی آپؐ کے سب سے زیادہ گرویدہ ہوگئے۔ اور ایک عجیب بات یہ ہے کہ صرف دس بارہ سال کے عرصہ میں آپ کی غیر معمولی امانت داری، راستبازی اور سچائی نے سب ہی مکہ والوں کو یہاں تک موہ لیا کہ وہ آپ کا نام لینا بے ادبی سمجھنے لگے۔ یہی مکہ کے بڑے بڑے تاجر اور سیٹھ جن کو اپنی دولت پر ناز تھا جن کو اپنے بین الاقوامی تعلقات پر فخر تھا کہ ان کے تجارتی قافلے شام، یمن، فارس وغیرہ جاتے رہتے تھے۔ افریقہ کے بازاروں میں ان کا لین دین رہتا تھا۔ ان ملکوں کے امیروں اور بادشاہوں سے ان کی راہ و رسم تھی، ان سے اپنی بات منوا سکتے تھے۔ یہی رؤساء قریش جو اپنے سوا کسی کو نظر میں نہیں لاتے تھے، جو دوسروں کی گردنیں اپنے سامنے جھکوانا چاہتے تھے، جن کے مشاعروں کی جان ان کے وہ فخریہ قصیدے ہوا کرتے تھے، جن میں وہ اپنی عظمت اور بڑائی کے ترانے گاتے اور کوئی ان کی توڑ کرتا تھا تو لڑ پڑتے تھے۔ یہاں تک کہ خونریز جنگ کی نوبت آجاتی تھی۔ دنیا جانتی ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ یتیم عبداللہ کی غیر معمولی سچائی اور امانت داری نے ان سیٹھوں اور رئیسوں کو یہاں تک متاثر اور گرویدہ بنادیا تھا کہ وہ آپ کو "الصادق" یا "الامین" ہی کہتے تھے اور نام لینا بے ادبی سمجھتے تھے۔ یہ دو لفظ یہاں تک زبانوں پر چڑھ گئے کہ انہوں نے قومی لقب کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔

مؤرخ حیران رہ جاتا تھا کہ وہ کردار اور وہ کیرکٹر کس درجہ بلند ہوگا جس نے تیس بتیس سال کی عمر کے نوجوان کو اتنا اونچا اٹھادیا کہ بڑے بڑے لوگوں کی گردنیں اس کی صداقت و امانت کے سامنے جھک گئیں۔ ممکن ہے خاندانی رقابت کے سبب سے کچھ لوگ اس خطاب کو پسند نہ کرتے ہوں لیکن وہ مجبور تھے کہ آپ کو اس خطاب سے یاد کریں۔ کیونکہ کوئی ایسی بات یا کوئی ایسا بہانہ ان کو نہیں ملتا تھا کہ وہ تردید کرسکیں اور عوام کے جذبات کا مقابلہ کرسکیں۔

تاریخ کی یہ پرانی عادت بہت ہی تکلیف دہ اور مایوس کن ہے کہ کسی شخص کے واقعات قلمبند کرنے کے لئے وہ اسی وقت قلم اٹھاتی ہے جب وہ شخص تاریخی انسان بن چکتا ہے۔ اس سے پہلے اس کے قلم کو

جنبش نہیں ہوتی۔ اس نے محمد رسول اللہ ﷺ کے بارے میں بھی اسی بخل سے کام لیا اور ان تمام واقعات سے دامن سمیٹے رکھا جو نبوت سے پہلے محمد ﷺ کی روز مرہ کی زندگی میں پیش آتے رہتے، جو قریش کے گردن درازوں کو متاثر کرتے رہے۔ تب بھی چند واقعات ایسے ہیں جو کسی طرح تاریخ کے سکڑے ہوئے دامن میں پڑ گئے اور تاریخ نے ان کو صحیح سندوں کے ساتھ محفوظ رکھا۔ قیاس کرنے کے لئے یہ واقعات ہی کافی ہیں اور ان سے قبل نبوت کی زندگی روشنی میں آجاتی ہے۔

عبد اللہ بن ابی الحمساء عامری ایک معمولی آدمی تھے۔ اگر آنحضرت ﷺ کے ساتھ اس کا یہ معاملہ نہ ہوا ہوتا جو یہاں ذکر کیا جارہا ہے تو دنیا نہ اس کو پہچانتی اور نہ پہچاننے کی ضرورت محسوس کرتی۔

یہ عبد اللہ حضرت محمد بن عبد اللہ ﷺ سے کوئی سودا کر رہا تھا۔ بات چیت کرتے ہوئے اسے کوئی کام یاد آگیا۔ اس نے حضرت محمد ﷺ سے کہا: آپ ٹھہریئے میں ابھی آتا ہوں، تب بات کروں گا۔ آپ کی زبان سے نکل گیا: اچھا۔

اب بات کی پختگی اور زبان کی پابندی ملاحظہ فرمایئے۔

عبد اللہ بن ابی الحمساء یہاں سے چلا تو اس کو کوئی اور ضرورت پیش آگئی وہ اس میں ایسا لگا کہ اس کو اپنے وعدہ کا خیال بھی نہ رہا۔ یہ دن یونہی گزر گیا۔ پھر اگلا دن بھی گزر گیا۔ تیسرے دن اسے خیال آیا کہ میں محمد بن عبد اللہ ﷺ سے معاملہ کر رہا تھا یہ بات یہاں تک پہنچ چکی تھی۔ میں ان کو ٹھہرا کر آیا تھا۔ اب چل کر بات پوری کر لینی چاہئے۔ چنانچہ عبد اللہ بن ابی الحمساء آپ کے مکان پر پہنچا معلوم ہوا کہ دو روز گزر گئے آج تیسرا دن ہے وہ مکان پر نہیں آئے۔ گھر والے خود پریشان ہیں۔ عبد اللہ بن ابی الحمساء یہاں سے روانہ ہوا۔ جہاں جہاں خیال تھا سب جگہ آنحضرت ﷺ کو تلاش کیا۔ کہیں نہ ملے تو احتیاطاً اس جگہ بھی پہنچا جہاں بات چیت ہو رہی تھی اور وہ آپ کو وہاں ٹھہرا کر آیا تھا۔

عبد اللہ بن ابی الحمساء اس مقام پر پہنچا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ محمد بن عبد اللہ ﷺ وہیں موجود ہیں، عبد اللہ بن ابی الحمساء کا انتظار کر رہے ہیں۔ اور زیادہ حیرت اس کو اس بات پر ہوئی کہ مسلسل تین دن تک انتظار کی زحمت اٹھانے کے بعد بھی جب عبد اللہ بن ابی الحمساء سامنے آئے تو نہ لڑائی جھگڑا تھا نہ ڈانٹ ڈپٹ۔ کہا تو صرف اتنا کہا اور وہ بھی دھیمی آواز سے یافتی لقد شققت علیّ انا ھھنا منذ ثلاث انتظرك [1] (اے صاحب! آپ نے پریشان کر دیا۔ تین دن ہو گئے یہاں آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔)

کہہ سکتے ہیں کہ وعدہ کی یہ صداقت اور پختگی وہ متبرک ترکہ تھا جو آپ کو اپنے جدا علیٰ حضرت اسماعیل علیہ السلام سے ملا تھا سیدنا اسماعیل علیہ السلام سے بھی ایک شخص نے کہا تھا کہ آپ یہاں ٹھہریں میں ابھی آتا

---

[1] ابو داؤد شریف باب فی العدۃ کتاب الادب۔

ہوں وہ اپنے کام میں لگ کر بھول گیا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام وعدہ کی پابندی کی بناء پر وہیں ٹھہرے رہے۔ وہ تیسرے دن جب اس کو یاد آیا اور وہاں پہنچا تو حضرت اسماعیل علیہ السلام اسی جگہ انتظار کر رہے تھے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کا یہ وصف یہاں تک مقبول ہوا کہ وحی الٰہی نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی خصوصیات میں اس کو شمار کرایا ہے۔ اِنَّہٗ کَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ (مریم۔۵۴) آنحضرت ﷺ کے اوصاف الگ الگ وحی الٰہی نے شمار نہیں کرائے بلکہ ایک جامع اور مکمل سند یہ دیدی: وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ (قلم۔۴) ، یعنی اخلاق کی مثالیں جو انبیاء علیہم السلام کے تذکرہ میں الگ الگ بیان کی گئیں آپ ان سب کا مکمل مجموعہ ہیں۔

قیس بن سائب بن عویمر ایک صحابی تھے۔ اس زمانہ میں جب آپ کاروبار کیا کرتے تھے وہ آپ کے شریک اور ساجھی رہے تھے۔ وہ ہمیشہ تعریف کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے:

کان رسول اللہ ﷺ شریکی فی الجاھلیۃ فکان خیر شریک لایداری ولایماری۔

"محمد ﷺ جب نبی نہیں بنائے گئے تھے (زمانہ جاہلیت میں) میرے ساجھی تھے۔ بس بہت ہی اچھے ساتھی تھے۔ نہ کبھی سخت بات کہتے تھے نہ جھگڑتے اور بحث کرتے تھے۔

یہ کاروباری سلسلہ کی باتیں تھیں۔ اب ہمدردی نوع انسان اور احترام انسانیت کی ایک مثال مطالعہ فرمایئے جو اس زمانہ میں بھی اپنی نظیر آپ تھی اور تہذیب کی دعویدار موجودہ دنیا بھی اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔

بردہ فروشی عرب میں عام تھی اور بسا اوقات شریف گھرانوں کے بچے بھی اس شکنجہ میں کس لئے جاتے تھے۔ چنانچہ قبیلہ بنی القین بن جسر کے آدمی ایک لڑکے کو پکڑ لائے اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے برادر زادے "حکیم بن حزام بن خویلد" کے ہاتھ بیچ دیا۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اپنے بھتیجے کے یہاں گئیں تو یہ غلام ان کو پسند آگیا۔ انہوں نے فرمائش کی اور بھتیجے نے یہ غلام پھوپھی کی نذر کر دیا۔ حضرت محمد ﷺ کی نظر اس پر پڑی تو اس کی معصوم زندگی اور اس کی مظلومیت سے دل بے چین ہو گیا۔ آپ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے اس کو خرید لیا۔ پھر بچہ سے اس کے ماں باپ کا نام اور خاندان و قبیلہ کا پتہ دریافت کیا۔ بچہ ذہین تھا اس نے برجستہ جواب دیا: میرا نام زید، میرے والد حارثہ بن شرجیل بن کعب اور والدہ سعدی بن ثعلبہ ہیں اور قبیلہ طے کے خاندان بنی معن سے ہمارا تعلق ہے۔ آنحضرت ﷺ کو اس کے باپ کا نام اور پتہ معلوم ہو گیا تو اس کے والد کو خبر پہنچائی۔ والد حارثہ خبر پاتے ہی اپنے بھائی کو ساتھ لے کر مکہ آگیا اور دریافت کرتا ہوا حضرت محمد ﷺ کے پاس پہنچا۔ بچہ کو دیکھا، چوما، پیار کیا گلے لگایا اور شفقت پدری کے بموجب یہ چاہا کہ اپنے لخت جگر، نور چشم کو ساتھ لے جائے اور حضرت محمد ﷺ کی خدمت میں کچھ رقم بطور فدیہ پیش کر دے۔ آنحضرت ﷺ نے رقم لینے

سے توانکار کر دیااور اس کی اجازت دیدی کہ بچہ کو اپنے ساتھ لے جائیں۔ البتہ یہ فرمادیا کہ خود بچہ سے بھی دریافت کرلیں کہ وہ آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہے یا یہاں رہنا چاہتا ہے۔

بچہ آپ کے یہاں آیا۔ اس کے والد کو اس زمانہ کے ذرائع اور وسائل کے بموجب خبر دی گئی۔ وہ اپنے علاقہ طے سے سفر کر کے یہاں آیا اس میں کچھ دن لگ گئے۔ بچہ اس عرصہ میں حضرت محمد کی شفقتوں سے اتنا مانوس ہو گیا تھا کہ اس کو آپ سے جدا ہونا گوارا نہ ہوا۔ اس نے باپ کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ باپ نے بہت سمجھایا مگر بچہ کسی طرح راضی نہ ہوا۔ آخر میں باپ اور چچا نے چبھتی ہوئی بات کہی: بیٹا تم غلام ہو، غلام رہنا پسند کرتے ہو، باپ کے ساتھ آزاد رہنا پسند نہیں کرتے۔

آنحضرت ﷺ نے اب تک باپ بیٹے کی گفتگو میں دخل نہیں دیا تھا۔ مگر یہ بات ایسی تھی جس کا تعلق آنحضرت ﷺ کے سلوک اور آپ کے انداز فکر سے تھا۔ کیا واقعی زید کو آپ غلام سمجھتے ہیں۔ زید کو غلام کی حیثیت سے رکھنا چاہتے ہیں۔ کیا آپ کسی آزاد بچہ کے لئے غلامی پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے فوراً باپ بیٹے کی گفتگو میں مداخلت کرتے ہوئے فرمایا: غلام نہیں بیٹا۔ زید میرے پاس رہے گا تو بیٹا بن کر۔ میں تمہارے سامنے یہ کہتا ہوں اور تمہیں اس سے اطمینان نہ ہو تو چلو، مجمع میں یہ اعلان کئے دیتا ہوں ۔ چنانچہ آپ باپ چچا اور زید کو لے کر ایک چوپال میں پہنچے، جہاں قریش کے سردار اور چودھری موجود تھے اور آپ نے اعلان فرمادیا کہ: زید میرا بیٹا ہے میں اعلان کرتا ہوں آپ لوگ گواہ رہیں۔

حارثہ (زید کے باپ) کی یہ آخری تدبیر تھی۔ زید کو پھسلانے کی جو قطعاً ناکام رہی۔ اب حارثہ کو کہنا پڑا: اچھا آپ بیٹا بنا کر رکھتے ہیں تو مجھے بھی عذر نہیں۔ فطرت محمد (ﷺ) کی یہ بلندی بھی نظر انداز نہ ہونی چاہیے کہ آپ نے عبدِ محمد (محمد کا غلام) کہلانا پسند نہیں کیا۔ آپ نے "ابن محمد" کہلایا اور اسی نسبت سے ان کی شہرت ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ اس واقعہ سے تقریباً ۳۰ سال بعد آیت نازل ہوئی: اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ (احزاب۔۵)۔ [1]

محمد ﷺ کا یہی کردار تھا جس نے سرداران قریش کی گردنیں اس کی تعظیم کے لئے خم کیں۔ یہاں تک کہ نام لینا بے ادبی سمجھتے اور "الصادق" اور "الامین" کے خطاب آپ کے لئے عام ہو گئے۔

آپ کے مربی چچا ابو طالب آخر تک مسلمان نہیں ہوئے۔ اپنے باپ دادا کے مذہب پر رہے اسی مذہب پر جان دی مگر بھتیجے کے اخلاق و کمالات اور ہمدردی خلق کا جو جذبہ بھتیجے کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، اس کے یہاں تک گرویدہ تھے کہ بھتیجے کی تعریف میں قصیدے کہا کرتے تھے۔

---

[1] الاستیعاب ذکر زید بن حارثہ

ایک قصیدہ جس میں تقریباً سو شعر ہیں اس کو ابن ہشام نے نقل کیا ہے جس کا مشہور شعر یہ ہے، جس سے حضرت محمد ﷺ کے فیض بے پناہ کا اندازہ ہوتا ہے:

وابیض یستسقی الغمام بوجھه ثمال[1] الیتامیٰ عصمة للارامل

وہ نورانی چہرے والا جس کی ذات اور جس کے چہرے کی برکت سے بادل بھی سیرابی حاصل کرتا ہے۔ یتیموں کا مربی بیواؤں کی عزت و آبرو کا محافظ۔"

وان فخرت یوماً فان محمداً ھوالمصطفیٰ من سرھا و کریمھا[2]

"اور اگر کسی دن (کسی موقع پر) فخر کرنا چاہو تو محمد وہ منتخب شخصیت ہے جس سے کمالات قریش[3] کے مخفی خزانے نمایاں ہوتے ہیں جو پورے قریش میں صاحب کرم اور صاحب شرف ہے۔"

نکاح

وَالطَّیِّبٰتُ لِلطَّیِّبِیْنَ (نور۔۲۶)

نکاح:

مکہ کی رہنے والی ایک ادھیڑ عمر کی خاتون (خدیجہ) جس کی عمر چالیس سال سے کم نہیں ہے، جو کئی بچوں کی ماں ہے، دو مرتبہ بیوہ ہو چکی ہے۔ تیسری مرتبہ شادی کے لئے ایک پچیس سالہ نوجوان سے سلسلہ جنبانی کرتی ہے۔ یہ نوجوان حسب نسب کے لحاظ سے مکہ کے تمام شریف اور باعزت خاندانوں میں "نگ" ہے۔ جسمانی صحت بہت عمدہ، شکل و صورت بے مثال۔ اخلاق و عادات میں پورے مکہ کا قیمتی ہیرا۔ اس کے یہاں دولت کے انبار نہیں ہیں مگر کامیاب تجارت میں وہ نام پیدا کر چکا ہے کہ اس کے مقابلہ میں دولت و ثروت ایک پرچھائیں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ بیشک اس بیوہ کے لئے اس رشتہ میں بہت سی دلچسپیاں ہو سکتی ہیں مگر اس پچیس سالہ نوجوان کے لئے دلچسپی کی ایک ایک چیز ختم ہے۔ یہ خاتون دولت مند ضرور ہے لیکن جس خود دار نوجوان نے اپنی زندگی خود بنائی، جس نے بچپن میں بھی گوارا نہ کیا کہ اپنا بار دوسروں پر ڈالے، کسی خاتون کی دولت و ثروت اس کی خودداری اور غیرت کے لئے چیلنج تو ہو سکتی ہے

---

[1] الثمال کالغیاث الذی یقوم بامر قومه

[2] البدایہ والنہایہ ص۲۵۸، ج۲، و سیرة ابن ہشام ص۷۰، ج۱

[3] چونکہ پہلے اشعار میں قریش کا ذکر ہے۔ اس لئے یہاں یہ مفہوم لیا گیا۔ اس سیاق کا لحاظ نہ کیا جائے تو مفہوم یہ ہو گا کہ محمد ﷺ وہ شخصیت ہے جس سے کمالات انسانیت کے مخفی خزانے نمایاں ہوتے ہیں۔ جو پوری نوع انسان میں صاحب کرم اور صاحب شرف ہے۔

دلچسپی اور کشش کا باعث نہیں بن سکتی۔ ہاں، ایک بہت بڑی دولت اور ہے۔ نیک نفسی، راست بازی، امانتداری، سچائی اور خلق خدا سے ہمدردی۔ محمد ﷺ کی ذات ستودہ صفات ان اوصاف کا خزانہ تھی۔ اور یہ نیک نفس خاتون جو دنیا کی تمام بہاروں سے آسودہ ہو چکی تھی ان اوصاف کی قدردان تھی، یعنی ایک طرف جوہر تھا تو دوسری طرف جوہری۔

قدر جوہر شاہ داند یا بداند جوہری

یہی سبب تھا کہ یہ رشتہ جو بظاہر ان مل بے جوڑ تھا ایسا مبارک ثابت ہوا کہ خاندان اور کنبہ والے اس پر رشک کیا کرتے تھے۔ خود آپ کی وہ بیویاں جو بعد میں آپ کی حرم بنیں، جب آنحضرت ﷺ کی زبانی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی تعریفیں سنتی تھیں تو رشک کیا کرتی تھیں۔

رشتہ کا سبب:

واقعہ اس طرح پیش آیا کہ خدیجہ رضی اللہ عنہا جب دوسری مرتبہ بیوہ ہو چکیں تو اپنی تجارت کو باقی رکھنے کیلئے انہیں کسی ایسے امانتدار شخص کی ضرورت تھی جو کاروباری سلیقہ اور تجارتی تجربہ بھی رکھتا ہو۔

آنحضرت ﷺ کی عمر اگرچہ تقریباً ۲۴ سال تھی مگر آپ کے اوصاف حمیدہ کے چرچے شروع ہو گئے تھے۔ کاروباری سلیقہ کی بھی شہرت ہو چکی تھی اور تجارتی قافلہ کے ساتھ شام جا کر بیرونی تجارت کا بھی آپ کو تجربہ ہو چکا تھا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ کی یہ شہرتیں سنیں پھر ذاتی طور پر بھی واقفیت حاصل کی، تو اپنے وسیع کاروبار کے لئے آپ کو زیادہ سے زیادہ موزوں پایا۔ چنانچہ آپ نے جوان صالح حضرت محمد بن عبد اللہ القریشی المکی ﷺ کو پیشکش کی کہ وہ کاروبار کی ذمہ داری سنبھال لیں۔ نفع میں ایک حصہ ان کا ہو گا۔ آنحضرت ﷺ نے یہ پیشکش منظور فرمائی اور مال لے کر شام تشریف لے گئے۔ واپسی کے وقت آپ نے ایسا مال تلاش کیا، جس کا مکہ میں فوراً نکاس ہو جائے۔ آپ نے شام سے یہ مال لا کر مکہ معظمہ میں فروخت کیا، تو نفع بدرجہا زائد ہوا۔ آنحضرت ﷺ کی اس کاروباری دانشمندی، ہوشیاری اور مستعدی نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی اس رائے کی تصدیق کر دی جو وہ اس "ترقی پسند" نوجوان کے متعلق پہلے قائم کر چکی تھیں۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے شام جاتے وقت جب مال سپرد کیا تو خاص اپنے بھروسے کے غلام "میسرہ" کو بھی ساتھ کر دیا تھا۔ بہانہ یہ تھا کہ وہ خدمت کرتے رہیں گے اور مقصد یہ تھا کہ مال کی نگرانی بھی رکھیں اور آنحضرت ﷺ کے طور و اطوار کا بھی گہرا مطالعہ کرتے رہیں۔

سفر شام سے واپسی پر آنحضرت ﷺ نے منافع کا مال حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے سپرد کیا اور "میسرہ"

نے نہ صرف امانتداری بلکہ آپ کے عام اخلاق کی بھی ایسی تعریف کی کہ خدیجہ رضی اللہ عنہا جو اپنی زندگی کا یہ آخری دور کسی راست باز کے حوالہ کرنا چاہتی تھیں "دامان محمد" ﷺ میں ان کو گوہر مراد نظر آنے لگا۔ انہوں نے آپ کے خاص احباب اور بزرگوں کے ذریعہ رشتہ کی سلسلہ جنبانی کی۔ جس نے منظوری کا شرف عظیم حاصل کیا اور نکاح ہو گیا۔ نکاح کے بعد تجارت اور کاروبار کی طرف خاص توجہ کا تذکرہ تو نہیں آتا، البتہ خدمت قوم، ہمدردی خلق، خدا پرستی اور خدا ترسی کے اوصاف روز افزوں نظر آتے ہیں۔ ادھر خدیجہ رضی اللہ عنہا جن کے لئے یہی اوصاف باعث کشش تھے ان کی گرویدگی دن بدن بڑھ رہی ہے۔ یہاں تک کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا محض خانگی زندگی ہی میں رفیقہ حیات نہیں رہیں بلکہ قومی اور ملی خدمات میں بھی دہنا ہاتھ بنی رہیں۔ آنحضرت ﷺ کی ذات پر تو ان کا ایک حبہ بھی کبھی صرف نہیں ہوا۔ البتہ قومی اور ملی کاموں میں ان کی پوری دولت صرف ہو گئی۔ حتیٰ کہ وفات کے وقت وہ اس گھرانہ کی صاحب خانہ (گھر ستن) تھیں جس کا فخر اور امتیازی نشان فقر وفاقہ تھا۔ خود آنحضرت ﷺ فرمایا کرتے تھے لوگوں نے مجھے امداد سے محروم رکھا۔ خدیجہ نے میری مدد کی۔ لوگوں نے مجھے جھٹلایا، مگر خدیجہ نے ہر موقع پر میری تصدیق کی اور ہمت بڑھائی۔ [1]

پچیس برس تک حضرت خدیجہ زندہ رہیں۔ چھ بچے ہوئے دو لڑکے جو بچپن ہی میں وفات پا گئے، چار لڑکیاں جو زندہ رہیں۔ ان کے نکاح بیاہ بھی ہوئے مگر آنحضرت ﷺ کی وفات سے پہلے یہ لڑکیاں بھی وفات پا چکی تھیں۔ صرف ایک صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا زندہ رہیں جن کے دو لڑکوں (سیدنا حضرت حسن اور سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہما) کی اولاد کو یہ شرف حاصل ہے کہ ان کو سادات کہا جاتا ہے۔

اخلاقی بدحالی۔ جذبہ اصلاح
امن پسندی اور صلح جوئی

چھٹی صدی عیسوی جس کے آخری حصہ میں یہ آفتاب طلوع ہوا۔ ایک اندھیری رات تھی جس پر گمراہیوں اور ظلم و ستم کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔

دولت پر غرور، جاگیر و جائیداد پر گھمنڈ، نسلی اور خاندانی اونچ نیچ، اپنے آپ کو اونچا، دوسروں کو نیچا

---

[1] البدایہ والنہایہ ص۱۲۹ ج ۲ والاستیعاب وغیرہ

سمجھنا، یہاں تک کہ ان سے چھوت چھات کرنا، غریبوں کو دبانا، کمزوروں کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا، عورتوں کو ایک خدمت گزار جاننا، شوہروں کے مرنے کے بعد ان کی زندگی کو اکارت ماننا، یہاں تک کہ ان کی خودکشی کو ان کے لئے ذریعہ نجات سمجھنا، خدا سے انکار کرنا، یا سینکڑوں ہزاروں دیوی دیوتاؤں کے سامنے ماتھا رگڑنا، من مانی باتوں کو مذہب اور دھرم سمجھ لینا، خود غرضی، بے رحمی، سود، زنا، شراب، رشوت، جوا وغیرہ ایسی بیماریاں تھیں جن کی وبا پوری دنیا میں پھیلی ہوئی تھی۔ عرب میں ان عام بیماریوں کے علاوہ:

(۱) ایک بیماری یہ تھی کہ پورے ملک کی کوئی باقاعدہ حکومت نہیں تھی۔ ہر ایک قبیلہ اپنی جگہ آزاد تھا۔

(۲) کچھ انسانوں کو ناپاک سمجھنے کا عقیدہ تو نہیں تھا مگر انسانی خون کو سستا اور مہنگا سمجھنا ان کا قومی مزاج بن چکا تھا، یعنی کسی معمولی قبیلہ کا کوئی آدمی اگر مارا جاتا خواہ وہ اس قبیلہ کا سردار ہی ہوتا تو اس کے خون کے عوض میں چند اونٹ دینے کافی سمجھے جاتے تھے جس کو وہ دیت کہا کرتے تھے۔ لیکن اگر کسی بڑے قبیلہ کا کوئی معمولی آدمی بھی مارا جاتا تو اس کے عوض میں قاتل کے ایک سے زائد اور انتہا یہ کہ کبھی پورے قبیلہ کو تباہ کر دینا بھی اپنا حق سمجھتے تھے اور اس پر فخر کیا کرتے تھے۔

(۳) فطرت جنگجو تھی، اس بنا پر معمولی بات پر بھی بڑی سے بڑی جنگ کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا جو سالہا سال جاری رہتا۔ مثلاً:

ایک شخص کا اونٹ کھیت میں چلا گیا۔ کھیت والی عورت نے اسے مارا۔ اونٹ والے نے عورت کی چھاتی کاٹ ڈالی۔ اس بات پر ۴۹۴ء سے ۵۳۵ء تک برابر لڑائی رہی۔ یعنی اکتالیس سال برابر، کہتے ہیں ستر ہزار آدمی اس میں مارے گئے۔

داحس ایک گھوڑا تھا۔ گھوڑ دوڑ میں وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ ایک شخص نے آگے بڑھ کر اسے بدکا دیا۔ اتنی بات پر ایسا رن پڑا کہ قبیلے کے قبیلے کٹ مرے۔ اس لڑائی کا خاتمہ اس وقت ہوا جب اسلام کی امن پسندی نے محارب قبیلوں کے مزاج بدل دیئے۔

مختصر یہ کہ ان قومی اور بین الاقوامی بیماریوں اور علتوں نے نہ صرف یہ کہ امن و امان کی زندگی کو ناممکن بنا دیا تھا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ رحم، رواداری، بھائی چارگی، عدل و انصاف، مروت و شرافت، مختصر یہ کہ انسانیت کی تمام شریف خصلتوں کے چراغ گل تھے۔ قریش جیسے قبائل اگرچہ تمدن میں اپنا ممتاز مقام رکھتے تھے۔ مگر روح تمدن سے وہ بھی محروم تھے۔ ان کی کاروباری منڈیاں بڑھ رہی تھیں مگر اخلاق کی جنس ان میں ناپید تھی۔

حضرت محمد ﷺ نے جیسے ہی بیدار مغز جوان صالح کی حیثیت سے شہری زندگی میں قدم جمایا، جس

طرح آپ کو اپنے خالق اور پروردگار کی عبادت و پرستش کا شوق بڑھا، قوم کی یہ ابتر حالت بھی آپ کے دل کا درد اور جگر کا سوز بن گئی۔ یہ سوزش آپ کو ہر وقت بے چین اور مضطرب رکھتی۔ مگر کوئی معمولی نسخہ شفاء اس درد کے لئے کارگر نہیں تھا۔

اس درد کے علاج کیلئے ایک بہت بڑے سماجی انقلاب کی ضرورت تھی۔ لیکن وقتی طور پر ایک واقعہ نے موقع دیا کہ آپ اس میدان میں آگے بڑھیں۔

واقعہ یہ تھا کہ یمن کا ایک سوداگر کچھ مال مکہ معظمہ میں لایا۔ مکہ کے ایک بیوپاری عاص [1] بن وائل سہمی نے اس کا مال خرید لیا اور جب قیمت ادا کرنے کا وقت آیا تو اس کو مار پیٹ کر بھگا دیا۔ وہ مکہ والوں کے سامنے رویا دھویا مگر کسی نے پرواہ نہیں کی اور عاص بن وائل کا مقابلہ کرنے کی ہمت کسی کو نہیں ہوئی۔ مکہ جیسے تجارتی شہر کیلئے یہ بدنامی بہت خطرناک تھی۔ اس پر مکہ کے کچھ شرفاء نے ایک کنونشن کا انعقاد کیا۔ محمد ﷺ اگرچہ ابھی بیس سالہ نوجوان تھے مگر امن و آشتی اور صلح و مصالحت جو آپکا فطری جذبہ تھا اس کا یہ اثر تھا کہ جیسے ہی آپ کو خبر ہوئی آپ بھی مجمع میں پہنچ گئے۔ آپ کی شرکت کی یہ برکت تھی کہ واقعہ کا تعلق اگرچہ تجارت اور کاروباری سلسلہ سے تھا مگر غور و فکر کے دائرہ کو وسیع کیا گیا اور ایک ایسی سوسائٹی (انجمن) بنائی گئی جس کے ارکان کا یہ عہد ہوتا تھا: (۱) ہم اپنے وطن سے بے امنی دور کرینگے (۲) مسافروں کی حفاظت کیا کرینگے (۳) غریبوں کی امداد کرتے رہیں گے۔ (۴) طاقتور کو کمزور پر، بڑوں کو چھوٹوں پر ظلم کرنے اور ناانصافی سے روکا کریں گے۔ [2]

مگر جب تک دلوں کی سطح ہموار نہ ہو اس طرح کے معاہدے پائیدار نہیں ہوتے کیونکہ ان کا منشا علاج نہیں ہوتا۔ بلکہ دفع الوقتی ہوتا ہے۔ وقت گزرتا جاتا ہے تو یہ معاہدے بھی فراموش ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اسی طرح کا ایک معاہدہ پہلے بھی ہو چکا تھا جب مکہ پر قبیلہ جرہم کا قبضہ تھا۔ مگر اب اس معاہدہ کا صرف نام یاد رہ گیا تھا۔ یعنی "حلف الفضول"

بہر حال وقتی طور پر یہ امن اور حفاظت جان و مال کے لئے ایک اچھا اقدام تھا۔ آنحضرت ﷺ نے اسی ثابت قدمی اور استقلال کے ساتھ اس میں حصہ لیا کہ نبوت کے بعد جب ایک مضبوط نظام مسلمانوں کا قائم ہو گیا تھا تب بھی آپ فرمایا کرتے تھے کہ قریش اگر حلف الفضول کو زندہ کریں تو میں سب سے پہلا شخص ہوں گا جو اس میں حصہ لوں گا۔ [1]

---

[1] اپنے قبیلہ کا بارعب سردار بھی تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا حلیف تھا۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام لائے تھے تو اس نے ان کو پناہ دی تھی۔ حضرت عمرو بن العاص انہیں کے فرزند تھے۔

[2] ابن ہشام ص ۸۳ و ص ۸۴ ج ۱

[1] ابن ہشام ص ۸۴، ج ۱

خدا پرستی اور معرفت حق

خدا کو ایک ماننا اور اس کی عبادت کرنا، عقل سلیم کا تقاضا ہے۔ مگر خدا پرستی کے وہ طریقے جن سے انسان روحانی ترقی اور ابدی سکون حاصل کر سکے، انسان اپنی عقل سے نہیں معلوم کر سکتا۔

عقل ان فیصلوں میں بھی بسا اوقات غلطی کر جاتی ہے جن کا تعلق مشاہدہ سے ہے۔ انتہا یہ کہ وہ طاقتیں جو انسان کے اندر موجود ہیں اور تندرستی یا بیماری کی وہ کیفیتیں جو جسم انسان میں پائی جاتی ہیں، چونکہ ان کا مشاہدہ نہیں ہو سکتا تو عقل ان کو پوری طرح پہچاننے سے بھی قاصر رہتی ہے اور پہچانتی ہے تو بسا اوقات غلطی کر جاتی ہے۔ انتہا یہ کہ ایکسرے جیسی نظر آنے والی چیز کے بعد بھی ڈاکٹروں کی تشخیص مختلف رہتی ہے، جن میں کوئی ایک صحیح ہوتی ہے اور کبھی ایک بھی صحیح نہیں ہوتی۔ پس وہ معاملات جن کا تعلق ان حقیقتوں سے ہے جن تک مشاہدہ کی رسائی نہیں ہو سکتی، نہ ان کے تجربہ کی کوئی صورت ممکن ہے ان کے بارہ میں عقل کے فیصلوں پر وہی شخص اعتماد کر سکتا ہے جو انصاف جیسی نعمت سے محروم ہو، یا موجودہ زندگی کے فلسفہ اور فکر مستقبل سے غافل اور لاپرواہ ہو۔ مگر وہ صاحب فہم و فراست جو دیکھتا ہے کہ ہر ایک فعل کی ایک تاثیر ہے اور یہ بھی یقین رکھتا ہے کہ معمولی کمی بیشی سے تاثیروں میں بے انتہا فرق آجاتا ہے۔ اگر صحیح توازن قائم رہے تو انسان ایٹم بم اور راکٹ تک بنا سکتا ہے اور چاند تاروں تک پہنچ سکتا ہے، لیکن توازن میں کچھ بھی فرق آجائے تو ساری محنت رائیگاں اور دولت برباد ہو جاتی ہے۔ وہ ہرگز جرأت نہیں کر سکتا کہ مشاہدہ سے بالا چیزوں کے بارہ میں عقلی فیصلوں پر اعتماد کر لے۔ وہ لامحالہ کسی ایسے مخبر اور ایسے رہنما کی تلاش کرے گا اور اس کی جستجو میں بے چین اور مضطرب رہے گا جو انسانی زندگی کے منتہا اور انجام کی صحیح خبر دے سکے۔ اور وہ متوازن چیزیں بتا سکے جن سے روحانی صحت اور ترقی حاصل ہو اور ابدی سکون میسر آئے۔

آنحضرت ﷺ کی فطرت سلیم نے آپ کو ایک خدا کی یاد پر آمادہ کیا۔ اس کا شوق پیدا ہوا۔ ایک طرف قومی زندگی میں آپ وہ اعتماد حاصل کرتے رہے کہ آپ کو "الصادق الامین" کا خطاب دیا گیا۔ دوسری جانب یاد خدا کا شوق اتنا ہی بڑھتا رہا۔ یاد خدا کے شوق کے ساتھ لامحالہ نوع انسان کی اصلاح و ترقی کے سوالات بھی آپ کے سامنے آتے رہے۔

☆ یہ اصلاح و ترقی صرف مادیات تک ہو یا اس کا تعلق روحانیت سے بھی ہو؟

☆ انسانی زندگی صرف اسی ظاہری زندگی تک ہے یا اس کے بعد بھی اس کا تعلق ہے؟

☆ اگر انسان مرنے کے بعد بھی ایک وجود رکھتا ہے تو اس کی فلاح و بہبود کس طرح ہو سکتی ہے؟

☆ اصلاح کا وہ طریقہ کیا ہو کہ انسان اس زندگی میں بھی امن و سکون اور ترقی سے ہمکنار ہو اور اس کے بعد کی زندگی بھی ایک خوشگوار زندگی ہو اور اس طرح یہ اصلاح مکمل اصلاح ہو۔

یہ وہ سوالات تھے جو آنحضرت ﷺ کے قلب حساس میں خلش پیدا کرنے لگے اور ان کی خلش یہاں تک بڑھی کہ آپ کو اس غور و فکر میں لطف آنے لگا۔ گویا یہی غور و خوص، فکر و مراقبہ آپ کی حیات مقدسہ کا جوہر بن گیا۔ اور چونکہ شہری زندگی اس میں ہارج تھی تو آپ کو تنہائی پسند آنے لگی۔ رفتہ رفتہ یہ وابستگی یہاں تک بڑھی کہ آپ شہر سے باہر پہاڑ کی ایک کھو میں رہنے لگے۔

حرا پہاڑ کا چار گز لمبا اور پونے دو گز چوڑا غار جہاں سے کعبہ مکرمہ بھی نظر آتا رہتا ہے اب بھی موجود ہے۔ یہ مکہ شہر سے تقریباً تین میل ہے۔ راستہ اتنا دشوار کہ یہ تین میل تیس میل سے بھی زیادہ کٹھن پڑتے ہیں۔ طاقتور نوجوان بھی وہاں پہنچتے پہنچتے تھک جاتے ہیں۔ مگر آنحضرت ﷺ نے یہ عادت بنالی تھی کہ پانی اور ستو ساتھ لیتے اور اس غار میں پہنچ جاتے اور جب تک پھر ضرورت نہ ہوتی آپ وہیں یاد خدا، غور و فکر اور مراقبہ میں مشغول رہتے۔

رفیقہ حیات حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا بھی پوری وفاداری اور دل سوزی سے حق رفاقت ادا کرتی رہیں۔ وہ پانی اور ستو کا ایک اندازہ رکھتیں اور جب ان کے اندازہ سے آنحضرت ﷺ کی واپسی میں تاخیر ہوتی تو وہ خود پانی اور ستو لیکر اس غار پر پہنچ جاتیں۔

آخر میں چھ ماہ[1] ایسے گزرے کہ آپ کو عجیب و غریب خوابیں آتی تھیں اور وہ اپنی تعبیر میں ایسی ہی سچی ہوتی تھیں جیسے سپیدہ صبح طلوع آفتاب کی پیشن گوئی میں صادق ہوتا ہے۔ پھر آفتاب طلوع ہوتا ہے تو آفتاب آمد دلیل آفتاب، بقول سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا، آنحضرت ﷺ کا خواب بھی گویا سپیدہ صبح ہوتا تھا جس کے بعد آفتاب تعبیر کی درخشانی لازمی ہوتی تھی۔[2]

---

[1] یعنی نبوت سے چھ ماہ پہلے

[2] بخاری شریف والبدایہ والنہایۃ وغیرہ

نبوت

آپ اسی غار میں تھے کہ ایک وجود نمودار ہوا۔ اس سے گھبراہٹ نہیں ہوئی بلکہ دل کو سکون ہوا۔ جیسے سوکھے ہونٹوں کو ٹھنڈا پانی مل گیا۔

اس نے فرمائش کی: "اِقۡرَاۡ" پڑھو۔

حضرت محمد ﷺ پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے۔ آپ نے عذر پیش کر دیا، میں پڑھنا نہیں جانتا۔ اس وجود نے دوبارہ یہی کہا، اِقۡرَاۡ۔ پڑھو۔ اس مرتبہ بھی حضرت محمد ﷺ کا وہی عذر تھا۔ اس وجود نے تیسری مرتبہ یہی کہا۔ اس مرتبہ جواب میں حضرت محمد ﷺ نے فرمایا: کیا پڑھوں۔ اس وجود نے یہ آیتیں پڑھوائیں:

اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الَّذِیۡ خَلَقَ ۚ﴿۱﴾ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ عَلَقٍ ۚ﴿۲﴾ اِقۡرَاۡ وَ رَبُّکَ الۡاَکۡرَمُ ۙ﴿۳﴾
الَّذِیۡ عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ ۙ﴿۴﴾ عَلَّمَ الۡاِنۡسَانَ مَا لَمۡ یَعۡلَمۡ ؕ﴿۵﴾

ترجمہ: پڑھ [1] اپنے رب کے نام سے جس نے (ساری مخلوق کو) پیدا کیا۔ بنایا انسان کو لہو کی پھٹکی (جمے ہوئے خون) سے پڑھ اور تیرا رب بڑا کریم ہے جس نے علم سکھایا قلم سے۔ سکھایا آدمی کو جو نہ جانتا تھا"

آپ نے یہ آیتیں پڑھیں۔ آیتیں ذہن نشین ہو گئیں۔ مگر ساتھ ساتھ ذمہ داری کا احساس بھی ہوا۔ ایک طرف اپنی عاجزی کا غیر معمولی احساس تھا۔ آپ کی خصوصیت یہ تھی کہ اپنے آپ کو کچھ نہیں سمجھتے تھے۔ ہیچ در ہیچ سمجھتے تھے۔ دوسری طرف اتنی بڑی ذمہ داری، اور ایسی ذمہ داری جس کا کوئی تجربہ اب تک نہیں تھا۔ یعنی بھٹکی ہوئی مخلوق کو پڑھنے پڑھانے، تعلیم دینے اور سدھارنے کی ذمہ داری، اور ایسی صورت سے جو بالکل اجنبی صورت تھی۔ جس کا کبھی وہم و گمان بھی نہیں آیا تھا نہ کسی سے ایسی باتیں سنی

---

[1] یہ آیت ۶۲۲ئ میں نازل ہوئی، یعنی ساتویں صدی عیسوی کے شروع میں جو یورپ کے قرون وسطیٰ کا تاریک ترین زمانہ تھا جب مغربی یورپ پر جہالت کی گہری گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ مشرقی یورپ میں کچھ تعلیم کا چرچا تھا تو اس کو کلیسا نے اپنی مخصوص جائداد سمجھ رکھا تھا۔ کسی کی کیا مجال تھی کہ دست درازی کر سکے۔ ہندوستان میں جو کچھ علم تھا وہ چند گھرانوں کی ملکیت تھا۔ کسی غیر تک اگر بھنک پہونچ جاتی تو اس کے کان میں سیسہ پلا دیا جاتا تھا۔

تھیں۔ اس طرح کے خیالات اور غیر معمولی احساس کا اثر یہ ہوا کہ دل کانپنے لگا۔ آپ مکان پر پہنچے تو لرزہ جیسی کیفیت تھی۔ آپ نے رفیقہ حیات (حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا) سے کہا:

"میرے اوپر کپڑا ڈال دو"۔ ❶

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کیا بات ہے؟ طبعیت کو سکون ہوا تو آپ نے پورا قصہ سنایا اور یہ بھی فرمایا۔ مجھے خوف ہے کہ ایسی بڑی ذمہ داری کس طرح اٹھا سکوں گا۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سمجھدار خاتون تھیں۔ حضرت محمد ﷺ کو جس طرح پندرہ سال سے دیکھ رہی تھیں، ان کو یقین تھا کہ اس غیر معمولی شخص کے لئے کوئی غیر معمولی صورت نمودار ہوگی جس کی شان نرالی ہوگی۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے پورا واقعہ سنا، پھر وہ آیتیں سنیں جن میں اس طرف اشارہ تھا کہ خدا قادر جو خون کے لوتھڑے سے جیتا جاگتا انسان بناتا ہے۔ قلم کے ذریعے لکھنا پڑھنا سکھاتا ہے۔ انسان کو وہ باتیں بتاتا ہے جن کو وہ اپنے ذہن سے نہیں معلوم کر سکتا تھا۔ وہ خدا قادر کسی استاد یا قلم کی مدد بغیر محض اپنی قدرت سے علم کے دروازے آپ پر کھول دیگا۔

یہ آیتیں سن کر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو یقین ہو گیا کہ جس غیر معمولی صورت کی توقع تھی وہ سامنے آگئی ہے۔

وہ اس واقعہ کے متعلق کوئی فیصلہ تو نہیں کر سکیں۔ البتہ حضرت محمد ﷺ نے جو اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ ان ذمہ داریوں کے بوجھ سے میری جان جاتی رہے گی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے اس کا اطمینان دلایا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ کی زندگی کا مرقع پیش کر کے بہت لطیف پیرایہ میں اطمینان دلایا کہ آپ یہ بار اٹھا سکیں گے کیونکہ اب تک کی زندگی میں جو بوجھ اٹھاتے رہے ہیں وہ کم نہیں وہ بھی غیر معمولی ہیں۔ پس اگر کوئی اس سے بھی بڑی ذمہ داری آپ پر پڑے گی آپ اس کو بھی اٹھا سکیں گے۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے اطمینان دلاتے ہوئے فرمایا: كلا والله لايخزيك الله ابداً انك لتصلُ الرحم و تحمل الكل وتكسب المعدو مرو تقرى الضيف و تعين على نوائب الحق (بخاری شریف ص ۲۴۰) ترجمہ: خدا شاہد ہے ایسا ہر گز نہیں ہو سکتا۔ کبھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ناکام کر دے۔ آپ کی مدد نہ کرے آپ رشتہ داروں کا خیال رکھتے ہیں، ان کی مدد کرتے ہیں، ان کو منزل تک پہنچاتے ہیں۔ آپ ایسے احسانات کرتے ہیں اور ایسی خدمات انجام دیتے ہیں جن کی نظیر نہیں ملتی۔ جو دوسری جگہ قطعاً نایاب ہیں۔

---

❶ خود قرآن پاک کی عظمت اور اس کا وقار ایک با احساس کو لرزہ براندام کرنے کے لئے کافی ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔ لو انزلنا هذا القران علیٰ جبلٍ لرايته الخ۔ اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو تو دیکھتا کہ وہ خدا کے خوف سے دب جاتا اور پھٹ جاتا (سورہ حشر آخری رکوع پ ۲۸)

باہر کے مسافر جو بے ٹھکانا ہوتے ہیں آپ ان کو اپنا مہمان بناتے ہیں۔ برپا ہونے والے ہنگاموں اور ناگہانی حوادث میں آپ حق کی حمایت کرتے ہیں۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے اس طرح تسلی دی۔ لیکن یہ ان کی رائے اور ان کا اپنا اعتقاد تھا کہ جو اس طرح صاحب خیر ہو، خدا کی طرف سے اس کی مدد ہوگی۔ اس کو ذلیل ورسوا اور ناکام نہیں کیا جائے گا۔ لیکن اس طرح کے معاملہ کی حقیقت وہ بھی نہیں جانتی تھیں، کیونکہ نبوت اور الہام کی باتوں سے وہ بھی واقف نہیں تھیں۔ ان کو ایک شخص کا خیال آیا۔ یہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ہم جد تھے۔ رشتہ کے بھائی ہوتے تھے، عیسائی مذہب اختیار کئے ہوئے تھے۔ عالم فاضل تھے۔ نبوت اور الہام کی باتیں جانتے تھے۔ عبرانی زبان پر ان کو عبور تھا۔ عبرانی کی اصل انجیل کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ عربی میں اس کا ترجمہ بھی کیا کرتے تھے۔ اب بہت بوڑھے تھے۔ بصارت سے بھی معذور ہو چکے تھے۔ مگر لوگ ان کی قدر کرتے تھے۔ ان کا نام ورقہ تھا ولدیت نوفل۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ساتھ لے کر ان کے یہاں پہنچی اور کہا: آپ کے برادرزادے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو عجیب صورت پیش آئی ہے۔ یہ خود ہی بیان کرینگے۔ آپ غور سے سنئے اور رائے دیجئے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پورا واقعہ بیان کیا۔

ورقہ نے جیسے ہی سنا برجستہ جواب دیا:

یہ تو وہی ناموس [1] (فرشتہ) ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل فرمایا تھا۔

ورقہ نے کہا: میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ کاش میں جوان ہوتا! کاش میں اس وقت تک زندہ رہوں جب آپ کی قوم آپ کو نکالے گی!

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا کہ قوم ان کو نکالے گی تو بہت تعجب ہوا۔ یہ قوم جو یہاں تک گرویدہ ہے کہ عقیدت اور احترام میں نام لینا بے ادبی سمجھتی ہے، مجھ سے دعائیں کراتی ہے اور بڑے معاملات کا فیصلہ کرنا میرے حوالے کر دیتی ہے، کیا وہ ایسی آنکھیں پھیر لے گی کہ مجھے مکہ سے نکال دیگی؟

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسے محبوب رہنما کے لئے یہ بہت ہی عجیب بات تھی۔ آپ نے تعجب سے دریافت کیا: ”کیا میری قوم مجھے نکالے گی؟“

ورقہ! بیشک آپ کو نکالے گی اور یہ انوکھی بات نہیں ہے۔ جو شخص بھی ایسی بات پیش کرتا ہے جو آپ پیش کرنے والے ہیں اس کے ساتھ قوم کا برتاؤ یہی ہوا کرتا ہے۔ کاش میرے سامنے وہ دن آئے تو

---

[1] رازدار فرشتہ فتح الباری

میں آپ کی پوری پوری مدد کروں!

ورقہ تو زندہ نہیں رہے۔ کچھ دنوں بعد ان کی وفات ہو گئی مگر جو بات انہوں نے کہی تھی وہ پوری ہوئی۔

یہ تھا نبوت کا آغاز اور یہ تھی وحی کی ابتداء جس میں پڑھنے پڑھانے، علم اور قلم کا تذکرہ اور عالمانہ زندگی کی ترغیب ہے۔ (واللہ اعلم) ابتدائی ظہور کے بعد یہ سلسلہ کچھ عرصہ کیلئے بند ہو گیا۔

تبلیغ اور دعوت عام سے پہلے تربیت

حضرت محمد ﷺ کی چالیس سالہ مثالی زندگی نے آپ کو الصادق اور الامین اور ایسا محبوب رہنما بنا دیا تھا جس کے اعلیٰ اخلاق اور بہترین کردار پر مکہ کے ہر ایک چھوٹے بڑے کو پورا اعتماد تھا۔ مگر ان اعلیٰ اخلاق کے باوجود منصب نبوت کے فرائض اور اداء فرائض کے طریقوں سے آپ قطعاً ناواقف تھے۔ قرآن مجید نے آپ کی شان یہ بیان کی ہے۔

(الف) نہ آپ لکھ سکتے تھے، نہ لکھا ہوا پڑھ سکتے تھے، نہ آپ نے کہیں تعلیم پائی تھی۔ [1] نہ آپ شاعر تھے۔ نہ ادیب کی حیثیت سے آپ کی شہرت تھی۔ [2] نہ آپ کاہن یا نجوم داں تھے۔ [3] نہ سابق مذہبوں سے آپ کو واقفیت تھی۔ [4] نہ آپ یہ جانتے تھے کہ ایمان کیا ہوتا ہے، آسمانی کتاب کیا ہوتی ہے [5] نہ آپ کو کبھی یہ خیال آیا تھا کہ آپ پر کوئی کتاب نازل ہو گی۔ [6] نہ اس شہر میں جہاں آپ پلے تھے، بڑھے تھے، نبوت یا رسالت کا چرچا تھا انتہا یہ کہ وہ قوم جس کے آپ فرد تھے اُمی تھی یعنی نبوت سے ناآشنا کیونکہ اس میں کوئی نبی نہیں ہوا تھا۔ حضرت ابراہیم ں کا نام سنا تھا۔ مگر ان کی تعلیمات فراموش ہو چکی تھیں صرف دھندلے سے نشان باقی تھے۔ لیکن اب آپ پر یہ ذمہ دری ڈالی گئی تھی کہ ایسی قوم میں مکمل انقلاب برپا کریں۔ جو اگرچہ گمراہ ہے مگر اپنے آپ کو تمام دنیا کی قوموں میں سب سے بہتر اور برتر سمجھتی ہے اور یقین رکھتی ہے کہ حق وہی ہے جس [7] پر وہ قائم ہے۔ اور اس انقلاب کا آغاز خاص اس گروہ سے کریں جس کو نہ صرف اس کا یقین ہے کہ وہ حق پر ہے بلکہ یہ فخر بھی ہے۔ کہ وہ اپنے مذہب مےں نہایت پختہ اور کٹر ہیں

---

[1] سورہ عنکبوت ۲۹ آیت ۴۸
[2] سورہ یٰسین ۳۶ آیت ۶۹
[3] سورہ الحاقہ ۶۹ آیت ۴۱ و ۴۲
[4] سورہ قصص ۲۸ آیت ۴۴ تا ۴۶
[5] سورہ شوریٰ ۴۲ آیت ۵۲
[6] سورہ قصص ۳۸ آیت ۸۶
[7] سورہ الانفال آیت ۳۲ وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَالْحَقَّ الخ

-❶

اس قوم (عرب) سے متصل ایک طرف ایران، عراق، فارس اور ان سے متصل ہندوستان ہے۔ ان کے مذہب اگرچہ مختلف ہیں مگر پرستش غیر اللہ (شرک) میں سب شریک ہیں۔ کوئی بت پرست ہے کوئی کواکب پرست، کوئی عجائب پرست، ہر ایک کے پاس ایک فلسفہ ہے اور ہر ایک کو اپنی روایات، اپنے تمدن، اپنی عقل و دانش اور اپنے فلسفہ پر ناز ہے۔

دوسری طرف شام، مصر، افریقہ اور یورپ کے علاقوں میں باز نطینی شہنشاہیت کے پرچم لہرا رہے ہیں۔ اور اگرچہ آج بیسویں صدی عیسوی میں چھٹی ساتویں صدی عیسوی کے دور کو قرون وسطیٰ کا پس ماندہ غیر مہذب اور غیر ترقی یافتہ تاریک ترین دور کہا جاتا ہے۔ مگر یہی علاقے ہیں جہاں رومتہ الکبریٰ کا مشہور قانون (رومن لا) جاری ہے او اسی علاقہ میں سقراط، بقراط، ارسطو، افلاطون، فیثاغورث جیسے باکمال فلاسفہ اور موجد گزر چکے ہیں۔ جن کے فلسفہ کو آج بیسویں صدی میں بھی زندہ فلسفہ کہا جاتا ہے۔

پس ماندہ لیکن کٹر عرب ❷ کا ایک اُمی ان تمام علاقوں اور ان میں بسنے والے انسانوں یعنی پورے نوع بشر کے لئے ہادی اور رہنما بنایا جارہا ہے۔ منصب رسالت اس کے سپرد ہونے والا ہے تو اس سے پہلے کہ وہ دوسروں کو دعوت دے ضروری ہے کہ جن باتوں کی وہ دعوت دے ان کا نمونہ وہ خود ❸ بن جائے۔ چنانچہ نبوت کے بعد کم و بیش تین سال ایسے گزرے جن میں حضرت محمد ﷺ کو عام دعوت و تبلیغ کا حکم نہیں تھا۔ ہاں، کچھ سعادت مند وہ تھے جنہوں نے مشک کی خوشبو خود سونگھ لی اور وہ خود ہی اس شمع کے پروانے بن گئے۔ ان میں سب سے پہلے یہ حضرات ہیں ابو بکر، خدیجہ، علی، زید بن حارثہ اور اُم ایمن (رضوان اللہ علیہم اجمعین) یہ تعداد میں صرف پانچ ہیں مگر عجیب بات یہ ہے کہ ان کا تعلق آزاد، غلام، مرد، عورت، بچے یعنی نوع انسان کے ہر طبقہ سے ہے۔

آزاد مردوں میں ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ)

آزاد عورتوں میں خدیجہ (رضی اللہ عنہا)

بچوں میں حضرت علی (رضی اللہ عنہ)

آزاد کردہ غلاموں میں زید بن حارثہ (رضی اللہ عنہ) جو اس وقت زید بن محمد کہلاتے تھے

---

❶ اپنے آپ کو وہ احمس یا حمس کہتے تھے یعنی اپنے مذہب میں کٹر اور نہایت پختہ

❷ قبیلہ قریش اور ثقیف وغیرہ چند قبائل اگرچہ متمدن تھے مگر عرب قوم متمدن نہیں تھی۔ اس کی بڑی تعداد بادیہ نشین صحرانورد تھی۔ محمد میاں

❸ تاکہ مقصد رسالت پورا ہو۔ کیونکہ نبوت اور رسالت اس لئے نہیں کہ پیغام پہنچا دیا جائے بلکہ بشر کو نبی یا رسول بنانے کا مقصد ہی یہ ہے کہ نوع بشر کے سامنے عملی نمونہ بھی پیش کیا جائے۔ (دیکھو سورہ ۶ الانعام آیت ۷ تا ۱۰)

آزاد کردہ باندیوں میں اُم ایمن (رضی اللہ عنہا) جو بچپن سے آنحضرت ﷺ کی ماما (خادمہ) تھیں۔

ان حضرات نے بھی ابھی تبلیغ شروع نہیں کی۔ لیکن کچھ اور افراد جن کے کردار نے مستقبل میں ثابت کر دیا کہ وہ بہترین انسان اور پورے سماج کے قیمتی جواہر تھے، وہ خود متاثر ہوئے اور دعوت عام سے پہلے آغوش اسلام میں داخل ہوگئے۔ ان کے اسماء گرامی یہ ہیں (ان کے پر تقدس کارنامے تاریخ عالم کے سینے پر نقش ہیں جو شہادت دے رہے ہیں کہ یہ حضرات کس درجہ صداقت پسند، حق گو، دلیر اور بہادر تھے اور اسی لئے وہ سب سے پہلے الصادق الامین اور اس کے پیغام کے گرویدہ ہوگئے تھے)

عثمان بن عفان، طلحہ بن عبید اللہ، زبیر بن عوام، سعد بن ابی وقاص، عثمان بن مظعون، ابو عبیدہ بن الجراح، عبد الرحمن بن عوف، ابو سلمہ بن عبد الاسد، ارقم بن ابی ارقم [1] (رضوان اللہ علیہم اجمعین)۔ تعلیم و تربیت کے اس بنیادی دور میں ان کی تربیت بھی ہوتی رہی۔

نصاب و طریقہ تربیت

قرآن پاک کی وہ سورتیں جو ابتداء میں نازل ہوئیں انہیں کو نصاب کہا جا سکتا ہے۔ ان سورتوں میں عقائد و نظریات کی بھی تعلیم دی گئی اور طریقہ تربیت بھی بتایا گیا ہے۔ عجیب بات جو ایک طالب حق کو مطمئن اور گرویدہ بنا دیتی ہے یہ ہے کہ جن عقائد و نظریات کی تعلیم ابتداء میں دی گئی، باقی ۲۳ سالہ زندگی میں ان کی ہی تشریح اور توضیح ہوتی رہی، ترمیم کسی ایک میں بھی نہیں ہوئی۔ بنیادی تعلیمات درج ذیل ہیں ۔ آیتوں اور سورتوں کے نمبر حاشیہ میں لکھ دیئے گئے ہیں۔

☆ پوری کائنات کا ایک خالق ہے جسکی سب سے نمایاں صفت یہ ہے کہ وہ رب العالمین اور ارحم الراحمین ہے (یعنی مخلوقات کے جس قدر طبقات اور درجات کائنات عالم میں ہیں وہ ان کا پیدا کرنے والا اور پالنے والا ہے۔ اس نے ہر مخلوق کی ایک فطرت بنائی اور اس فطرت کے بموجب نشوونما، بقاو تحفظ، تدریجی ترقی اور درجہ کمال تک پہنچنے کیلئے جن چیزوں کی ضرورت تھی اس کی رحمت نے ان کو مہیا کیا اور برابر مہیا کرتی رہتی ہے)۔ تمام جہانوں کا رب اور سب پر رحم کرنے والا وہی ہے۔ تمام کمالات اسی کو حاصل ہیں۔ تمام تعریفوں کا وہی مستحق ہے۔ [2]

☆ مشرق و مغرب کا رب وہی ہے۔ وہی معبود ہے اس کے سواء اور کوئی پرستش کے قابل نہیں ہے۔ [3]

☆ اس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا، اس کو دولت علم سے نوازا اور ترقی کے راستہ پر لگایا

---

[1] البدایہ والنہایہ ص ۷ ۳ ج ۳

[2] اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ سورہ ۱ آیت ۱ و ۲

[3] سورہ مزمل ۷۳ آیت ۹ ،

ـ ❶

☆ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ قلم اور لکھنے پڑھنے کے ذریعہ تعلیم کا طریقہ اسی نے بتایا❷ وہ اس ذریعہ کے بغیر بھی جس کو چاہے عالم وفاضل اور سرتاج فضلاء بنا سکتا ہے۔

☆ وہ ایک ہے، یکتا ہے، وہ کسی کا محتاج نہیں سب اس کے محتاج ہیں، نہ اس کے اولاد ہے، نہ وہ کسی کی اولاد ہے، اس کا کوئی ہمسر نہیں ہے۔ ❸

☆ انسان کا ہر ایک عمل اچھا ہو یا برا ایک حقیقت ہے۔ ہر ایک عمل اپنا اثر رکھتا ہے۔ انسان اپنے اعمال کے جال میں اس طرح پھنس جاتا ہے جیسے کوئی قیدی۔ ❹

☆ کوئی شخص کسی کا گناہ اپنے اوپر نہیں لے سکتا کسی پر دوسرے کا گناہ نہیں ڈالا جا سکتا۔ ہر شخص اپنا اور اپنے فعل کا ذمہ دار ہے۔ انسان کو صرف وہی ملتا ہے جو اس نے کمایا۔ انسان جو کچھ کماتا ہے وہ اس کے سامنے آئے گا۔ ❺

☆ ایک خاص دن ہو گا جس میں انسان کے تمام اعمال کا حساب اور ہر معاملہ کا انصاف ہو گا۔ ❻

☆ خدا کی مخلوق صرف وہی نہیں ہے جو تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے، بلکہ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی مخلوق ہے۔ ایک خاص مخلوق وہ ہے جس کو فرشتہ کہا جاتا ہے۔ ان کی تعداد کا علم صرف ان کے خالق اللہ رب العالمین ہی کو ہے۔ ❼ وہ خدا کے حکم کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ ❽ ان کی زندگی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل اور خدا کی حمد وثناء کرتے رہتے ہیں۔ وہ خدا کے حکم سے انسانوں پر خدا کی نعمتیں بھی نازل کرتے ہیں اور خدا کے حکم سے خدا کا قہر بھی بندوں پر اتارتے ہیں۔ ❾

☆ اللہ تعالیٰ انسانوں کی صحیح رہنمائی کے لئے نبی اور رسول بھیجتا ہے۔ ❿ نبی اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا، صرف وہ کہتا ہے جو خدا اس کو بتاتا ہے۔ ❶

---

❶ سورہ علق ۹۶ آیت ۲ و ۴

❷ سورہ علق ۹۶ آیت ۳

❸ سورہ اخلاص ۲ ا ا

❹ سورہ مدثر ۷۴ آیت ۳۸

❺ سورہ والنجم ۵۳ آیت ۳۸، ۳۹، ۴۰،

❻ سورۃ الفاتحہ ا آیت ۳

❼ سورہ مدثر ۷۴ آیت ۳۱

❽ سورہ والنجم ۵۳ آیت ۲۵

❾ سورہ مدثر ۷۴ آیت ۳۱

❿ سورہ مزمل ۷۳ آیت ۱۵

❶ والنجم ۵۳ آیت ۳۔۴

☆ علم اور یقینی بات وہی ہے جو اللہ کے بتانے سے رسول بتاتا ہے۔ اسکے علاوہ جو کچھ انسان کے پاس ہے وہ ظن ہے (تخمینی اور اٹکل کی باتیں ہیں)، جو علم ویقین کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ ❷

☆ تزکیہ نفس اور دل کو پاک کرنے اور روحانیت کو ترقی دینے کی صورتیں یہ ہیں۔
اللہ کو یاد کرو۔ دن کو یاد کرو۔ رات کو جاگ کر خدا کو یاد کرو۔ ❸ نمازیں پڑھو۔ زکوٰۃ ادا کرو (جو ایک لازمی فریضہ ہے اور زکوٰۃ کے علاوہ) اللہ کو قرض دو (ملی اور قومی کاموں میں خرچ کرو وہ اللہ تعالیٰ پر قرض ہو گا) کوئی نیک عمل ضائع نہیں کیا جائے گا۔ جو نیکی کرو گے خدا کے یہاں اس سے بہتر اور بڑھا ہوا پاؤ گے۔ جو غلطیاں اور کوتاہیاں ہوتی رہیں اللہ تعالیٰ سے ان کی معافی اور مغفرت چاہتے رہو ❹۔

☆ دولت کو اللہ کا انعام سمجھو۔ ہر ایک غرض سے بلند ہو کر صرف اللہ تعالیٰ کے فرمان کی تعمیل اور اس کی رضا حاصل کرنے کیلئے ہر ایک ضرورت مند کی مدد کرو اور اس سے کہہ دو کہ ہم کوئی بدلہ نہیں چاہتے صرف اللہ کی رضا چاہتے ہیں۔ ❺

☆ روحانیت کی پاکی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ جسم کو پاک رکھو۔ لباس پاک رکھو ہر ایک پلیدی کو (ظاہری ہو یا باطنی) دور کرو۔ ❺

☆ عذاب کے کام (جن سے انسان کی ابدی زندگی برباد ہوتی ہے اور دوزخ کا مستحق ہو جاتا ہے) یہ ہیں:
نماز نہ پڑھنا، غریبوں کی امداد نہ کرنا، بیکار باتوں (اور خدا سے غافل کرنے والے کاموں) میں منہمک رہنا، عذاب و ثواب یعنی پاداش عمل پر یقین نہ رکھنا ❻ کسی کے ساتھ اچھا سلوک کر کے اس پر احسان جتانا۔ ❼
ایسی صورتیں اختیار کرنا کہ دولت اپنے پاس جمع رہے اور غریبوں اور ضرورتمندوں کی امداد نہ ہو۔ ❽

---

❷ والنجم ۵۳ آیت ۲۸
❸ سورہ مزمل ۷۳ آیت ۲، ۳، ۴
❹ سورہ مزمل ۷۳ آیت ۲۰
❺ سورہ دہر ۷۶ آیت ۸، ۹ و سورہ مدثر ۷۴ آیت ۶
❺ سورہ مدثر ۷۴ آیت ۴ و ۵
❻ سورہ مدثر ۷۴ آیت ۴۳ تا ۴۶
❼ ایضاً آیت ۶
❽ سورہ القلم ۶۸ آیت ۱۶ تا ۳۰

☆ اچھے آدمی جن کے نقش قدم پر چلنا چاہئے وہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے انعام سے نوازا۔ [1]
یعنی [2] (الف) خدا کے برگزیدہ نبی : جو ایسے پاک فطرت ہوتے ہیں کہ ہمیشہ گناہوں سے محفوظ رہتے ہیں۔
(ب) صدیق: جو اپنے قول و فعل میں نہایت سچے، جن کا ضمیر سچا، جن کے ہر فعل میں سچائی اور صداقت، یہاں تک کہ وہ سچائی کا پیکر اور صداقت کی تصویر ہوتے ہیں۔
(ج) شہید: جو حق و صداقت کے راستہ میں ہر ایک قربانی کے لئے تیار رہتے ہیں جن کا جذبہ یہی ہوتا ہے کہ راہ حق میں قربان ہوں۔ اس کے علاوہ اور اپنے تمام جذبات قربان کر دیتے ہیں یہاں تک کہ اپنے آپ کو بھی قربان کر دیتے ہیں۔
(د) صالح: نیک کردار، پاکباز، پاک طینت، جو اچھے کاموں کی بہترین صلاحیت رکھتے ہیں اور اس صلاحیت کو عمل میں لاتے رہتے ہیں۔

☆ مومن صالح اور سچا مسلمان وہ ہے جو راتوں کو جاگ جاگ کر خدا کو یاد کرے۔ دن کے کاموں کو خوبی سے انجام دے اور دل میں یاد خدا رکھے۔ اسی سے اس کا دل لگا رہے۔ اسی پر بھروسہ رکھے، نمازیں پڑھے، زکوٰۃ ادا کرے۔ قومی اور ملی کاموں کے لئے دولت خرچ کرتا رہے۔ اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کی معافی مانگتا رہے۔ مخالفین کی باتوں کو ضبط و تحمل سے برداشت کرے۔ برداشت سے باہر ہو جائیں تو خوش اسلوبی، سنجیدگی اور نرمی کے ساتھ ان سے الگ ہو جائے [3]۔ جو قول و قرار کے پکے ہوں، جو منت مان لیں یا عہد کر لیں اس کو پورا کریں۔ جو بلا لحاظ مذہب و فرقہ مسکینوں، یتیموں اور قیدیوں کی امداد کو اپنا فرض سمجھیں۔ اپنی ضرورتیں پیچھے ڈالیں ان کی ضرورتیں پوری کریں۔ خدا کی خوشنودی ان کا نصب العین ہو۔ جو کچھ کریں خدا کے لئے ہی کریں۔ کسی انسان سے کوئی معاوضہ گوارا نہ کریں۔ یہاں تک کہ یہ بھی نہ چاہیں کہ کوئی انسان ان کا کسی طرح شکریہ ادا کرے۔ خوف خدا، خدا کی عظمت اور اپنے انجام کی فکر ان کے دل و دماغ پر چھائی رہے۔ جو کچھ کریں اسی لئے کریں۔ [4]

☆ بدترین انسان وہ ہیں جو حکومت اور اپنے اقتدار پر گھمنڈ کریں۔ جن کو اپنی شاہنشاہیت پر ناز ہو (جیسے

---

[1] سورہ فاتحہ ۱ آیت ۵
[2] یہ تشریح قرآن پاک میں بعد میں نازل ہوئی (سورہ نساء ۴ آیت ۶۹) لیکن عمل پہلے دن سے اسی پر تھا۔
[3] سورہ مزمل ۷۳ آیت ۱۔۷، ۸، ۹، ۱۰ و ۲۰
[4] سورہ دہر آیت ۷، ۸، ۹ و ۱۰

فرعون)۔ جو اپنی دولت کے نشہ میں صداقت سے منہ موڑیں۔ حقائق کو جھٹلائیں۔ ❺

جن کو اپنی دولت پر، اپنی اولاد پر، اپنے مادی ذرائع و وسائل پر ناز ہو انہیں کی بڑھوتی کی اڈھیڑ بن میں رات دن لگے رہیں۔ ذخیرہ اندوزی کے حریص ہوں، حق کے مقابلہ میں اکڑ جائیں، سچائی کی توہین کریں، عبرت کی آنکھیں بند رکھیں۔ ❶ خدا کی مخلوق کو بھول جائیں۔ جھوٹ بولنے اور جھوٹی قسمیں کھانے سے نہ شرمائیں۔ بلکہ اس کو ہوشیاری اور فن کاری سمجھیں۔ کسی کو چڑھائیں کسی کا اتاریں۔ لگی بجھی کرتے رہیں۔ چغلیاں کریں۔ نہ ان کی نظر میں شرافت اور اخلاق کی قدر ہو نہ عصمت اور پاک دامنی کی۔ جن کی کوشش یہ ہو کہ غریبوں کا حق دبائیں اور اپنا سرمایہ بڑھائیں۔ ❷

طریقہ تربیت

☆ رات کو اٹھو، جاگو، آدھی رات یا آدھی رات کے قریب یاد خدا میں کھڑے ہو کر گزارو۔ ❸

☆ قرآن کو ٹھیر ٹھیر کر اطمینان سے پڑھو۔ ❹ (تبلیغ خصوصاً فرائض نبوت کی ادائیگی کے لئے ضروری ہے کہ ریاضت و مجاہدہ یعنی محنت کرنے اور مشکلات کو برداشت کرنے کی عادت ہو۔ ضمیر پاک ہو۔ اس کی تمام صلاحیتیں بیدار ہوں۔ جو بات نکلے دل سے نکلے۔ ہر ایک بات نہایت ٹھیک اور سنجیدہ ہو۔ شب بیداری سے یہ خصلتیں پیدا ہوتی ہیں اور ترقی کرتی ہیں کیونکہ) یہ حقیقت ہے کہ رات کے اٹھنے میں دل اور زبان کا خوب میل ہوتا ہے اور ہر بات خوب ٹھیک نکلتی ہے۔ ❺ (لہٰذا شب بیداری کرو تاکہ یہ خصلتیں پیدا ہوں کیونکہ) ہم عنقریب ڈالیں گے تم پر بھاری کلام۔ ❻

☆ پورے دن کو زیادہ سے زیادہ مصروف رکھو۔ ❼

☆ اپنے رب کے نام کا ذکر جاری رکھو۔ ❽

☆ اور سب سے کٹ کر اسی کے ہو جاؤ۔ ❾

---

❺ سورہ مزمل ۷۳ آیت ۱۵، ۱۶ و آیت ۱۱
❶ سورہ مدثر ۷۴ آیت ۱۱ تا ۱۶
❷ سورہ قلم ۶۸ آیت ۸۔ ۱۰ تا ۲۴
❸ سورہ مزمل ۷۳ آیت ۲، ۳
❹ ایضاً آیت ۴
❺ ایضاً آیت ۶
❻ ایضاً آیت ۵
❼ سورہ مزمل ۷۳ آیت ۷
❽ ایضاً آیت ۸
❾ ایضاً آیت ۸

☆ خدا کو اپنا وکیل اور ذمہ دار بنالو [10] اسی پر بھروسہ رکھو۔

☆ اس عقیدہ کو اپنے اوپر حاوی کرلو کہ مشرق و مغرب (اور تمام عالم) کا رب وہی ہے اس کے سوا اور کوئی نہیں جو معبود اور الٰہ ہو۔ [1]

☆ جو کچھ وہ (مخالفین) کہتے ہیں اس پر ضبط و تحمل سے کام لو [2]۔ زیادہ سے زیادہ برداشت کی عادت ڈالو۔

☆ دنیاداروں سے کنارہ کرو (مگر خوبصورتی کے ساتھ [3]۔ یہ کنارہ کشی ایسی ہو کہ اپنے اندر جمال رکھتی ہو۔ نفرت نہ ہو بلکہ ایسی ہو جیسے طبیب، بیمار کی بیماری سے اپنا بچاؤ کرتا ہے۔ مگر اس طرح کہ اس بچاؤ میں بھی دلداری ہوتی ہے۔ مرض کا علاج کرتا ہے، مریض کا دل نہیں توڑتا)۔

داعی الی اللہ کے اوصاف اور ان کی تربیت و تکمیل

جس ذات کو اس لئے اٹھایا جارہا ہو کہ وہ لوگوں کو اللہ کی طرف بلائے، بھٹکی ہوئی مخلوق کو حق و صداقت کے صراط مستقیم اور نیکی اور سچائی کے شاہراہ اعظم پر چلائے۔ اس کے کچھ اوصاف ہونے چاہئیں۔ قرآن حکیم میں جابجا ان اوصاف کی طرف اشارے اور کہیں تصریح پائی جاتی ہے۔

محمد رسول اللہ ﷺ کی شخصیت ایک بہترین مثال ہے اور ان اشاروں اور تصریحات کی شہادت یہ ہے کہ محمد رسول اللہ کی ذات اقدس بہترین مثال اور نمونہ اس لئے تھی کہ مقاصد دعوت و ہدایت کے لئے آپ کی تربیت خاص طور پر کی گئی تھی۔ داعی حق کے تمام اوصاف اس مختصر کتابچہ میں بیان نہیں کئے جاسکتے یہاں صرف چند اوصاف بیان کئے جارہے ہیں۔

(ا) ہمدردی: کامیاب داعی اور ہادی کو شمع اور چراغ ہونا چاہئے۔ شمع پوری محفل کو فیض پہنچاتی ہے۔ تاریک مجلس کو روشنی سے بھر دیتی ہے۔ مگر اس طرح کہ اہل محفل کے لئے خود فنا ہوتی رہتی ہے۔ ایک سوز ہوتا ہے جو اس کے تن من کو تحلیل کرتا رہتا ہے۔ داعی حق بھی اسی طرح سوز و گداز کا پیکر ہوتا ہے۔ وہ اپنی بقاء اسی میں سمجھتا ہے کہ راہ حق میں خود کو فنا کردے۔ قرآن حکیم کی شہادت یہ ہے کہ محمد ﷺ سراج منیر (شمع سوزاں) تھے [4] اور درد دل کا عالم یہ تھا کہ جان عزیز اسی میں گھلا رہے تھے [5] کہ بھٹکے ہوئے انسان سیدھے راستہ پر آجائیں۔

---

[10] ایضاً آیت ۹

[1] ایضاً آیت ۱۰

[2] ایضاً آیت ۱۰

[3] ایضاً آیت ۱۰

[4] یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا ﴿۴۵﴾ وَّ دَاعِیًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِیْرًا ﴿۴۶﴾ (احزاب ۴۵، ۴۶)

[5] فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ (شعراء آیت ۳۔ نیز سورہ ۱۸ کہف آیت ۶)

(۲) اذعان اوریقین: (الف) ایک شخص اونچے پہاڑ پر کھڑا ہوا، دشمن کے لشکر کو دیکھ رہا ہے جو تیزی سے حملہ کرنے کے لئے آرہا ہے۔ اس کی بستی کے آدمی، پہاڑ کے پیچھے ہیں وہ نہیں دیکھ رہے۔ یہ دیکھنے والا شخص جس خطرہ سے اپنی قوم کو آگاہ کررہا ہے، وہ اس کا مشاہدہ کررہا ہے۔ اس لئے وہ اپنی پوری طاقت صرف کررہا ہے کہ جس طرح بھی ہوسکے وہ بستی کے غافل لوگوں کو جگادے اور اپنے مشاہدہ کا یقین ان کو دلادے۔ داعی حق کو اپنی دعوت پر ایسا ہی یقین ہونا چاہئے۔ [1] گویا قبول حق اور کفروانکار کے نتائج کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔

(ب) ایک نہایت شاداب باغیچہ میں ایک گہری خندق ہے جس میں آگ کے بڑے بڑے انگارے دہک رہے ہیں۔ خندق کے کنارے پھسلوان ہیں۔ سیر کرنے والوں کو اس کی خبر نہیں ہے۔ جس کو خبر ہے وہ سیر کرنے والوں کو پورے یقین کے ساتھ خطرہ سے آگاہ کرتا ہے اور اگر باغ کی سیر کرنے والے اس کے دوست اور عزیز قریب ہوتے ہیں تو وہ اپنی پوری طاقت صرف کردیتا ہے کہ ان کو اس خندق کی طرف نہ جانے دے۔

داعی حق باخبر باغبان ہوتا ہے جس کو مخلوق خدا سے ایسی ہی محبت ہوتی ہے، جیسی اپنے اہل وعیال سے۔ وہ خندق کی طرف جانے والوں کو منع کرتا ہے۔ کوئی آگے بڑھ جاتا ہے تو اس کو کمر پکڑ کر کھینچتا ہے۔ اس وقت اس کی ہمدردی سراسر اضطراب بن جاتی ہے۔ [2] اس کا سوزواضطراب ناقابل بیان ہوتا ہے۔

شمع جلتی ہے پر اس طرح کہاں جلتی ہے
ہڈی ہڈی مری اے سوز نہاں جلتی ہے

(۳) داعی حق کی کامیابی یہ نہیں ہے کہ اس کی شوکت وحشمت کے سامنے لوگوں کی گردنیں جھک جائیں۔ بلکہ اس کی کامیابی یہ ہے کہ اس کی دعوت کی معقولیت، دلائل کی مضبوطی، اس کے اخلاص، قول اور فعل کی صداقت اور اس کی سچی خیرخواہی اور ہمدردی، بے لوث زندگی اور بلندی اخلاق کے سامنے لوگوں کے دل جھک جائیں۔ ان میں گرویدگی اور عقیدت پیدا ہوجائے۔ لہٰذا سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ:

(الف) کوئی جور اور جبر نہ ہونا چاہئے۔ ہر صاحب فکر کی رائے کو آزادی حاصل ہو۔ وہ خود اچھے برے اور اندھیرے اور اجالے کو پہچانے اور اپنے ضمیر کی شہادت پر عمل کرے۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۔(بقرہ۔ ۲۵۶)

(ب) بیشک داعی حق اصلاحی مسائل پیش کرے گا۔ لوگوں سے مطالبہ کرے گا کہ وہ اس کے اصول

---

[1] بخاری شریف ص ۹۶۰ حدیث ابی موسیٰ فیہ انا النذیر العریان

[2] بخاری ص ۹۶۰ حدیث ابی ہریرہ۔

تسلیم کریں اور ان پر عمل کریں۔ لیکن ضروری ہے کہ انداز نہایت سنجیدہ، دانش مندانہ، نصیحت آمیز اور خیر خواہانہ ہو۔ تبادلہ خیالات اور بحث و مباحثہ کی نوبت آئے تو اس کا انداز اور طرز بھی ایسا حسین ہو کہ اس سے زیادہ نرم، دل کش اور پیار بھرا انداز نہ ہو سکے۔

اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ [1] (نحل۔ ۱۲۵)

(ج) گمراہ، سرکش، شورہ پشت، شرارت پسند، بدکردار جن کو سیدھے راستہ پر لانا مقصود ہے ان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ داعی حق کی بات سنجیدگی سے سنیں گے اور شرافت کا جواب شرافت سے دینگے۔ بالخصوص ایسی صورت میں کہ ان کی عزت و عظمت، شہرت یا ان کے کسی مفاد کو نقصان پہنچ رہا ہو تو وہ لامحالہ حق کے مقابلہ میں اپنی ہر ایک شرارت کو کام میں لائیں گے اور پوری قوت سے سرکشی اور بغاوت کا مظاہرہ کریں گے۔ اس صورت میں داعی حق کا فرض کیا ہو گا۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے: معافی اور درگزر کو اپنا اصول بنالو، نیکی کی ہدایت کرتے رہو اور جاہلوں (نادانوں) سے کنارہ کرتے رہو۔ (اعراف۔ ۱۹۸، نحل۔ ۱۲۷، مزمل و مدثر و دہر وغیرہ)

(۴) اگرچہ قانون یہ ہے کہ برائی کا بدلہ اسی جیسی برائی ہوتی ہے وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثۡلُھَا (شوریٰ ۴۸)

مگر داعی حق اس قانون پر عمل نہیں کرتا بلکہ اس کا اصول یہ ہوتا ہے: بدی کا جواب نیکی سے دیتے ہیں، بھلائی کر کے برائی کو دفع کرتے ہیں۔

وَّیَدۡرَءُوۡنَ بِالۡحَسَنَۃِ السَّیِّئَۃَ (الرعد۔ ۲۲)

(۵) عدل کے معنی برابری پیدا کرنے کے ہیں۔ اسی کو انصاف کہا جاتا ہے، اس سے مساوات تو قائم ہو جاتی ہے مگر بدی ختم نہیں ہوتی بلکہ بسا اوقات جواب اور جواب الجواب کا سلسلہ بدی کو بڑھاتا اور اس کے دائرہ کو وسیع کر دیتا ہے۔ داعی حق کا نصب العین یہ ہوتا ہے کہ بدی اور برائی دنیا سے ختم ہو۔ لہذا اس کا اصول یہ ہو گا کہ جب کوئی بدی پیش آئے گی تو اس کے اسباب تلاش کر کے ایسا راستہ اختیار کرے گا کہ بدی اور برائی کی جڑ کٹے، دوست دشمن بن جائیں، جو برے ہیں وہ اچھے ہو جائیں۔

وَلَا تَسۡتَوِی الۡحَسَنَۃُ وَلَا السَّیِّئَۃُ ؕ اِدۡفَعۡ بِالَّتِیۡ ھِیَ اَحۡسَنُ فَاِذَا الَّذِیۡ بَیۡنَکَ وَبَیۡنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیۡمٌ (حم سجدہ۔ ۳۴)

---

[1] پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے (اے نبی) اپنے پروردگار کی راہ کی طرف لوگوں کو بلاؤ اس طرح کہ حکمت (دانشمندی) کی باتیں بیان کرو۔ اور اچھے طریقہ پر پند و نصیحت کرو اور مخالفوں سے بحث و نزاع کرو تو (وہ بھی) ایسے طریقہ پر کہ حسن و خوبی کا طریقہ وہی ہو (اس سے اچھا نہ ہو سکے) تمہارا پروردگار ہی بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹک گیا اور کون راہ راست پر ہے۔

مگر یہ آسان بات نہیں ہے۔ اس کو وہی کر سکتے ہیں جو ضبط و تحمل کے عادی ہوں۔ جو مکارم اخلاق کے خوگر ہوں۔ (ایضاً آیت ۳۵)

لیکن عالم اسباب میں کسی چیز کی عادت جب ہی ہوتی ہے جب پہلے اس کی تربیت ہو چکی ہو۔ مختصر یہ کہ اس دور میں تربیت کا ایک مکمل باب یہ بھی تھا کہ ان کمالات واوصاف کا عادی بنایا گیا جو سب سے افضل اور آخری پیغمبر اور سب سے زیادہ جلیل القدر داعی کے لئے ضروری تھے۔

ثمرہ تربیت

جن کی فطرت سلیم نے بلا دعوت اور بلا فرمائش خود بخود محمد رسول اللہ ﷺ کی پیروی کو پوری زندگی کا نصب العین بنایا تھا۔ اس زمانہ تربیت میں جو رنگ محمد نبی اللہ ﷺ پر غالب آتا رہا اسی رنگ میں یہ بھی رنگے جاتے رہے۔ ثمرہ یہ ہوا کہ ایک جماعت ایسی تیار ہو گئی۔

۱۔ جو خداشناس اور سچی خدا پرست تھی۔

۲۔ جو سب کو چھوڑ کر اپنا رشتہ خدا سے جوڑ چکی تھی۔

۳۔ جس کا پورا بھروسہ اپنے خالق اور مالک پر تھا۔

۴۔ جس کا دل ہر ایک طمع سے پاک اور صرف اپنے خالق کی محبت سے لبریز تھا۔

۵۔ جس کے دل پر صرف خالق کائنات کی عظمت کا سکہ تھا، اسی کا خوف اس کے قلب و جگر کا داغ تھا۔ جس نے خوف خدا کے سوا ہر ایک خوف و خطر کے دھبے کو مٹا دیا تھا۔

۶۔ جس کو خالق کی ہر ایک مخلوق سے محبت تھی، کیونکہ وہ اس کے رب کی پالی ہوئی مخلوق ہے۔ ہر ایک انسان کا درد اس کے دل میں تھا، کیونکہ یہ انسان خدا کی قدرت کا شاہکار تھا جس سے اس کو عشق ہو گیا تھا اور جس کے لئے یہ سب کچھ قربان کر دینے کو زندگی کا نصب العین اور دل کی آخری آرزو بنا چکا تھا۔

۷۔ اس جماعت کو ان سے نفرت ہو گئی: (الف) جن کے دل اپنے خالق اور رب کی عظمت اور اس کی مخلوق کے درد سے نا آشنا تھے۔ (ب) جو خدا کو چھوڑ کر اپنی اغراض کی پوجا میں لگے ہوئے تھے۔ (ج) جن کو مال اور اولاد پر ناز تھا اور انہی کی ترقی ان کی زندگی کا محبوب نصب العین تھا۔ (د) جن کو غریبوں سے نفرت تھی کیونکہ وہ دولت سے محروم ہوتے تھے۔ (ہ) جو یتیموں اور بیواؤں کو اپنے پاس نہیں آنے دیتے تھے کہ ان کی امداد کرنے سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ان سے کہیں زیادہ انہیں اپنی تجوریوں سے محبت تھی۔ (و) کمزوروں کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا، مخلوق خدا کو غلام اور غلاموں کی زندگی کو اپنی خواہشات کا کھلونا بنانا، ان کی عظمت و برتری کا نشان تھا، جس کو وہ کسی وقت

بھی مٹانا یا نیچا کرنا نہیں چاہتے تھے خواہ ان کی جان جاتی رہے۔

مقامی اور سماجی حالات اور رد عمل

ا۔ عرب میں بادشاہت نہیں تھی۔ ہر ایک قبیلہ آزاد ہوتا تھا۔ شیخ قبیلہ اندرونی نظام کا نگراں ہوتا تھا۔ مکہ میں اس نظام نے چھوٹے سے جمہوریہ کی صورت اختیار کرلی تھی۔ صدر جمہوریہ تو پھر بھی کوئی نہیں تھا، البتہ قبائل کی ایک مشترک جماعت (کونسل) تھی۔ اس نے شہری، سماجی اور انتظامی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر تقریباً ایک درجن شعبے (پورٹ فولیو) بنائے تھے اور ہر شعبہ کا سربراہ منتخب کردیا تھا۔ مثلاً مقدمات قتل کا ایک خاص شعبہ تھا۔ اس کے سربراہ ابو بکر صدیق تھے۔ شعبہ سفارت کے ذمہ دار حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تھے۔ اسی طرح باقی شعبوں کے ذمہ دار علیحدہ علیحدہ تھے۔ ان میں سے صرف ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ وہ تھے جو سب سے پہلے اسلام لاچکے تھے۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کئی سال بعد مسلمان ہوئے۔ باقی شعبوں کے ذمہ دار یا مسلمان ہی نہیں ہوئے یا اگر مسلمان ہوئے تو بہت آخر میں۔ اس مشترک جماعت کے اجلاس ہوا کرتے تھے۔ اس مقام کا نام "دارالندوہ" تھا۔

جہاں یہ اجلاس ہوا کرتے تھے، کوئی غیر معمولی معاملہ ہوتا تو اراکین کے علاوہ بھی نمایاں افراد کو خاص طور پر مدعو کرلیا جاتا تھا۔

(۲) حرب بن امیہ، ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل، عتبہ ربیعہ، ابو لہب، ابو جہل، اُمیہ بن خلف، ابی بن خلف، عقبہ بن ابی معیط، نضر بن حارث، اسود بن عبدیغوث۔ بڑے بڑے دولتمند تھے۔ یہ تاجر بھی تھے صاحب جائیداد بھی، سودی کاروبار بھی بڑے پیمانہ پر کرتے تھے اور ان تمام خصوصیتوں کے مالک تھے جو سرمایہ داروں میں ہوا کرتی ہیں مثلاً ابو لہب جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا بھی تھا اور ہمیشہ مخالفت میں پیش پیش رہا، اس کا سودی لین دین وسیع پیمانے پر تھا اور اس کے حرص و طمع کی یہ حالت تھی کہ اس نے خانہ کعبہ کے خزانہ سے سونے کا ہرن چوری کرکے بیچ ڈالا تھا۔ یہ ہرن بہت عرصہ سے محفوظ چلا آتا تھا۔[1]

عاص بن وائل بہت بڑا دولتمند قبیلہ کا مشہور سردار تھا مگر حضرت خباب رضی اللہ عنہ سے اس پر جھگڑا ہوا کہ انہوں نے لوہے کی کوئی چیز بنا کر اس کو دی تھی وہ اس کی اجرت مانگتے تھے اور یہ جان چراتا تھا۔[2] اور یاد ہوگا یہی عاص بن وائل تھا جس نے یمن کے ایک تاجر کو مارپیٹ کر بھگادیا تھا، جب اس نے اپنے دام مانگے جس سے تمام مکہ والوں کی بدنامی ہوئی اور جس کی بنا پر وہ انجمن بنائی گئی تھی جس کا تذکرہ پہلے گزر چکا

---

[1] معارف ابن قتیبہ
[2] بخاری شریف ص ۳۰۴،

ہے۔ [3]

قرآن شریف نے کسی کا نام نہیں لیا مگر اس کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ سماج اور معاشرہ کا اونچا طبقہ جو مکہ پر چھایا ہوا تھا جو اس لحاظ سے خوش نصیب مانا جاتا تھا کہ ان کے یہاں دولت کے انبار بھی ہوتے تھے اور فرماں بردار اولاد کی بھی کمی نہیں ہوتی تھی، اس کے اخلاق اور اوصاف یہ تھے:

(الف) اپنی اس خوش نصیبی پر کہ وہ صاحب مال اور صاحب اولاد ہیں ان کو گھمنڈ اور غرور ہوتا تھا۔

(ب) جو ان سے کم ہوتے تھے ان کو حقیر سمجھتے اور طرح طرح کے طعنے دیتے تھے۔

(ج) اپنے اثر و رسوخ اور اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے جھوٹی قسم کھانے سے ان کو عار نہ آتی تھی بلکہ بڑھ بڑھ کر قسمیں کھاتے، دوسروں کو لڑانے اور اپنے مخالفوں کو زک پہنچانے کے لئے بے دھڑک چغلیاں اور طرح طرح کا شرارت آمیز پروپیگنڈہ کرتے تھے۔ [1]

(د) کمزوروں پر ظلم کرنا، ان کی عادت تھی۔

(ہ) نرم مزاجی اور اخلاق سے ناآشنا تھے۔ نیک کام نہ خود کرتے نہ دوسروں کو کرنے دیتے۔

(و) غریبوں کی امداد کا کوئی موقع ہوتا تو اس میں روڑے اٹکاتے نہ خود خرچ کرتے نہ دوسروں کو خرچ کرنے دیتے۔

(ز) اخلاق سے ناآشنا سخت دل، خشک مزاج طبعیت کے روکھے۔ [2]

(ح) رات دن تجوری بھرنے کی کوشش میں مصروف رہتے۔ اس تصور سے ناآشنا تھے کہ یہ دولت ختم ہونے والی بھی ہے۔ [3]

(ط) خدا سے بے تعلق، خدا پرستی سے بے گانہ، کج بحث، زبان زوری سے اپنے عیبوں کو چھپانے والے۔ [4]

یہی لوگ تھے جو پورے مکہ پر چھائے ہوئے تھے اور چونکہ مکہ ہر لحاظ سے پورے عرب کا مرکز تھا تو ان کے اثرات پورے عرب پر غالب تھے۔

ایک شخص جس نے بچپن، جوانی اور ادھیڑ عمر کا ایک حصہ شہر کی گھلی ملی زندگی میں اس طرح گذارا ہو کہ وہ لوگوں کی آنکھ کا تارا بنا رہا ہو۔ اس کی زندگی میں خاص طرح کی تبدیلی آئے اس کے کچھ ساتھی

---

[3] زیر عنوان کمزوروں کی امداد عدل و انصاف اور جذبہ اصلاح۔

[1] القلم آیت ۸ تا ۱۵

[2] ایضاً

[3] سورہ ۱۰۴ ہمزہ آیت ۲

[4] سورہ ۷۴ مدثر آیت ۱۶ تا ۲۵ و آیت ۴۵ و ۴۶ و سورہ ۸۳ المطففین آیت ۲ و ۳ و آیت ۱۲ و ۱۳ سورہ ۹۶ العلق آیت ۶ و ۷

ہوجائیں۔ ان میں وہ بھی ہوں جو شہری زندگی میں اونچا درجہ رکھتے ہوں ❺۔ کچھ مالدار گھرانوں کے نوجوان ہوں ❻ اور یہ سب ایک خاص قسم کی انقلاب انگیز زندگی بنانے لگیں۔مان لیجئے یہ کسی کو اپنی طرف نہیں بلاتے مگر کیا خود ان کا عمل اور غیر معمولی انداز لوگوں کو متوجہ نہیں کرے گا۔ خصوصاًوہ بڑے لوگ جو اپنے اقتدار کو سنبھالنے کے لئے ہر خطرہ کے موقع پر خوردبین سے کام لیتے ہیں۔ کیا وہ ان کے طرز زندگی سے ہراساں اور چوکنے نہیں ہونگے اور کیا یہ بات ان کو سراسیمہ اور پریشان نہ کردے گی کہ یہ جماعت جس طرح شرک اور بت پرستی کے خلاف توحید کی قائل اور خداپرستی کی عاشق ہے وہ سرمایہ دارانہ نظام حیات سے بھی اتنی ہی متنفر ہے اور جذبات نفرت کی پرورش کررہی ہے۔

ردعمل:

یہ قدرتی بات تھی کہ سرداران قریش نے جیسے ہی اس چھوٹی سی جماعت کے انداز سے خطرات کو بھانپا۔ مخالفت شروع کردی۔ مگر جس طرح دعوت عام نہیں تھی مخالفت بھی عام نہیں تھی۔ نجی مجلسوں میں تبصرے ہوتے۔ بیشک پھیلنے والے اثرات کو زائل کیا جاتا اور مخالفانہ رائے پختہ کی جاتی تھی۔ مگر گفتگو اور تبادلہ خیالات کے ذریعہ مثلاً: سب سے پہلے قرآن پاک کی معجزانہ فصاحت و بلاغت تھی جو ہر ایک صاحب ذوق کو متاثر کردیتی تھی اور جب کوئی صاحب فکر معنی اور مقصد پر غور کرتا تو حیران رہ جاتا اور بسا اوقات وارفتہ ہوجاتا تھا۔ یہ وارفتگی گرویدگی کی حد تک پہنچتی تھی جو اس کو سب سے چھڑا کر حضرت محمد ﷺ سے وابستہ کردیتی تھی۔ جو حضرات اب تک مسلمان ہوچکے تھے اگرچہ ان کی تعداد تھوڑی تھی مگر وہ قرآن پاک کی اس تاثیر کی بہترین مثال اور نمونہ تھے۔ قرآن پاک کی اس تاثیر کو معاذ اللہ جادو کہا جاتا تھا۔ کہ یہ منتر ہے جو کسی سے محمد ﷺ کو ہاتھ لگ گیا ہے وہ اس منتر سے متاثر کرتا رہتا ہے۔ ❶

ان تمام آیتوں اور سورتوں میں جن عقائد اور نظریات کی تلقین ہے جب ان پر بحث ہوتی تو بڑے لوگوں کا چلتا ہوا جواب یہ ہوتا تھا: پرانے زمانہ کی دقیانوسی باتیں ہیں۔ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اب یہ باتیں نہیں چل سکتیں۔ ❷

جب خداپرستی اور توحید کا ذکر ہوتا تو جواب دیا جاتا: اپنے باپ دادوں کے مذہب سے ہٹ کر گمراہ

---

❺ جیسے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ

❻ جیسے حضرت عثمان بن عفان، عبدالرحمن بن عوف، مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہم

❶ سورہ ۷۴ مدثر آیت ۲۴ تنبیہ: سورہ مدثر اور سورہ قلم کی تمام آیتیں اگرچہ ایک ہی دفعہ میں نازل نہیں ہوئیں کچھ پہلے نازل ہوئیں کچھ تھوڑے وقفہ کے بعد۔ مگر بہر حال تمام آیتیں نبوت کے ابتدائی دور میں ہی نازل ہوئیں۔

❷ سورہ ۶۸ قلم آیت ۱۵

ہو رہے ہیں۔[3]

جب ان کی شب و روز کی عبادت اور غیر معمولی شب بیداری کا تذکرہ ہوتا تو روساء قریش کی مجلسوں میں تبصرہ یہ کیا جاتا: دیوانے ہو گئے ہیں۔

لیکن ظاہر ہے اس طرح کے جوابات وقتی طور پر کام کر سکتے ہیں۔ واقعی اور حقیقی اثرات کو زائل اور سوال کرنے والوں کو مطمئن نہیں کر سکتے۔ تو اب ان لوگوں نے یہ چاہا کہ اس سے پہلے محمد ﷺ کے اثرات متعدی ہوں، ان سے کوئی سمجھوتہ ہو جائے چنانچہ سرداران قریش کا ایک وفد آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔

ارکان وفد پر ایک نظر ڈال لیجئے:

(۱) ولید بن مغیرہ، مکہ کا رئیس اعظم جو دولت مندی اور خوش حالی کی تمام عظمتیں اپنے اندر رکھتا تھا۔ اسی وجہ سے اس کو وحید کہا جاتا تھا۔

(۲) ابو جہل، سب سے زیادہ ہوشیار اور چالاک سردار۔

(۳) اسود بن عبد یغوث، مکہ کا بہت بڑا تاجر اور رئیس۔

(۴) اخنس بن شریق، طائف کا سب سے بڑا سردار اور رئیس۔

وفد نے آپ کے سامنے تین صورتیں پیش کیں:

- اگر دماغی خلش ہے تو اجازت دیجئے ہم بہترین علاج کا انتظام کریں۔
- اگر عیش و عشرت مقصود ہے تو ہم دولت اور حسن دونوں فراہم کر سکتے ہیں۔
- اگر اقتدار مطلوب ہے تو مکہ کے اقتدار کی باگ ڈور آپ کے حوالے کرتے ہیں۔ مگر آپ اپنے انداز کو ہلکا کیجئے۔ آپ کے نظریات جو سننے میں آرہے ہیں نہایت سخت ہیں۔ وہ ہیجان برپا کر دیں گے۔

مگر وحی الٰہی نے اسی طرح کی پیش کشوں کی شدت سے تردید کر دی ا۔

تبلیغ کا آغاز

سب سے پہلے اپنا خاندان

حضرت محمد ﷺ کو جب حکم ہوا "قُمْ فَاَنْذِرْ"[1] اٹھو اور لوگوں کو آگاہ کرو (کہ ان کے موجودہ

---

[3] ایضاً آیت

[1] سورہ مدثر کی آیت ۱۱ و من خلقت وحیدا کے تحت حضرات مفسرین نے اس کی تصریح فرمائی ہے۔

عمل اور کردار کا مستقبل کیا ہو گا) تو آپ نے انداز اور تبلیغ کا سلسلہ اپنے خاندان سے شروع کیا۔ خدا کا حکم بھی یہی تھا۔ ❷

آپ نے کھانے کا انتظام کیا اور ان رشتہ داروں کو دعوت دی جو آپ کے پردادا (دوسری پشت کے دادا) ہاشم کی اولاد تھے۔ ان میں وہ بھی تھا جس کا نام عبدالعزیٰ تھا۔ اور ابو لہب کی کنیت سے مشہور تھا❶۔ یہ آنحضرت ﷺ کے والد ماجد کا سب سے بڑا بھائی تھا۔ عمر، سرمایہ اور دولت کے لحاظ سے خاندان میں سب سے اونچا تھا۔ عبدالعزیٰ سمیت تقریباً چالیس آدمی اس دعوت میں آئے۔ کھانا کھایا، پھر آنحضرت ﷺ نے کچھ فرمانا شروع کیا ابھی آپ نے بات پوری بھی نہیں کی تھی کہ عبدالعزیٰ نے پکار کر کہا:

لهدما سحر کم صاحبکم ❷ (یہ جادو بہت ہی عجیب ہے جو تمہارے دوست نے تم پر کیا ہے)

جادو کا نام سن کر کون ٹھہر سکتا تھا۔ مجمع منتشر ہو گیا۔

ابو لہب کی یہ حرکت بہت ہی ہمت شکن تھی۔ مگر اس کے مقابلہ پر تھی جس کی ہمت نے ٹوٹنا نہیں سیکھا تھا۔ وہ نئے حوصلہ سے اٹھا۔ کچھ وقفہ کے بعد دوبارہ دعوت کی اور اس مرتبہ حلقہ وسیع کر دیا۔ پہلے ہاشم کی اولاد کو دعوت دی تھی اس مرتبہ ہاشم کے والد عبد مناف کی اولاد کو دعوت دی۔ اور ابو لہب کی پہلی حرکت کا رد عمل یہ ہوا کہ سب ہی آ گئے اور آخر تک جمے رہے۔ آپ نے بھی اپنی بات پوری فرمادی۔ آپ نے فرمایا:

”میں وہ پیغام پہنچا رہا ہوں کہ عرب کے کسی جواں ہمت نے یہ پیغام نہیں پہنچایا تھا۔ یہ دنیا اور آخرت کی کامیابی کا پیغام ہے۔ امتہ عرب اس پیغام سے دنیا میں بھی سربلند ہو گی اور آخرت کی کامیابیاں بھی اس کو نصیب ہو نگی ❸۔ یہ پیغام عمل کا پیغام ہے انسان کا عمل ہی اس کو کامیاب کر سکتا ہے۔ ایک کا عمل دوسرے کو کامیاب نہیں کر سکتا۔

اے معشر قریش! اپنے آپ کو جس درجہ پر رکھنا چاہتے ہو تو اس کی قیمت خود ادا کرو۔ عذاب الٰہی سے بچنا چاہتے ہو تو نجات کا سودا تم خود کرو۔

اے آل عبد مناف! خدا کے مقابلہ میں تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا جب تک تم خود عمل نہ

---

❷ سورہ مدثر ۴۷ آیت ۲

❶ سورہ شعراء ۲۶ آیت ۲۱۴ لہب کے معنیٰ آگ کی لپٹ کے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس کا رنگ سفید سرخ تھا، چہرہ انگارے کی طرح دہکتا رہتا تھا اسی لئے یہ کنیت دی گئی۔ گویا وہ آگ کے انگارے اور لپٹ کی تصویر ہے۔

❷ البدایہ والنہایہ ص۳۹ ج۳ و مجمع البحار لفظ ھد

❸ ایضاً ص۳۹ و ۴۰ ج ۳

کرو۔ میں تمہیں قانون قدرت کی گرفت سے نجات نہیں دلا سکتا۔

اے عباس❹ بن عبد المطلب! خدا کے مقابلہ پر میں تمہارے کام نہیں آسکتا۔ اے رسول خدا کی پھوپھی "صفیہ!" میں اللہ کی گرفت سے تمہیں نہیں بچا سکتا۔ اے رسول کی بیٹی فاطمہ! میرے مال میں سے جو کچھ مانگنا چاہو مانگو میں دوں گا مگر خدا سے بے نیاز ہو کر میں تمہارے کچھ کام نہیں آسکتا۔ اللہ کے مقابلہ پر میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔❶

تقریر بے حد موثر اور بلیغ تھی۔ سننے والوں کے پاس کوئی جواب نہیں تھا مگر دلوں کا پرانا مرض آسانی سے نکلنے والا نہیں تھا۔ یہاں بھی عبد العزیٰ ابو لہب نے اپنی عمر کی بڑائی اور رشتہ کی برتری سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔

عجیب بات یہ تھی کہ اس مجمع میں سب سے زیادہ سن رسیدہ ابو لہب تھا اور سب سے چھوٹے حضرت علی رضی اللہ عنہ جن کی عمر تقریباً بارہ سال تھی ۔ بیمار اور کمزور بھی تھے۔ پیٹ بڑھا ہوا، آنکھیں آتی ہوئیں۔ پنڈلیاں پتلی پتلی۔ کھڑا ہونا مشکل تھا۔

آنحضرت ﷺ نے تقریر کے بعد مجمع کی طرف سے جواب کا انتظار کیا تو صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ (طفل بیمار) نے آپ کی تصدیق کی اور حمایت کا وعدہ کیا۔ آپ نے ان کی حوصلہ افزائی کے الفاظ کہے۔ ابو لہب کو موقع مل گیا۔ اس نے طنز کرتے ہوئے قہقہ لگایا۔ مجمع کا رخ بدل گیا۔ پھر منتشر ہو گیا۔❷

صفا کی اسٹیج سے اعلان حق

مکہ کی ایک پہاڑی کا نام "صفا" ہے اس پہاڑی کا وجود اب بھی باقی ہے۔ کعبہ شریف سے تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلہ پر ہے۔ اب یہ پہاڑی شہر مکہ کی سطح کے برابر ہو گئی ہے مگر اس زمانہ میں یہ بلند تھی۔ خانہ کعبہ کا حرم❸ (میدان) اس کے دامن میں تھا۔ عام طور پر قریش کی یہاں نشست رہتی تھی۔ محمد رسول اللہ ﷺ اس پہاڑی پر چڑھے اور قبائل قریش کو نام بنام پکارا۔ یا بنی فہر۔ یا بنی عدی وغیرہ وغیرہ۔

محمد۔ وہی محمد جن کا اثر و احترام یہ تھا اور قریش کے عوام و خواص اس درجہ گرویدہ تھے کہ آپ کو الصادق اور الامین کہہ کر خوش ہوا کرتے تھے۔ انہیں الصادق اور الامین کی آواز کانوں میں پڑی تو لوگ

---

❹ عباس اگرچہ چچا تھے مگر ہم عمر اور ہم جولی تھے۔ تقریباً دو سال بڑے تھے

❶ بخاری شریف ص ۷۰۲

❷ البدایہ والنہایہ ص ۴۰ ج ۳

❸ چار دیواری اس زمانہ میں نہیں تھی۔ بیچ میں خانہ کعبہ تھا۔ اس کے چاروں طرف میدان تھا۔ میدان کے کنارے پر روساء مکہ او خداماں کعبہ کے مکانات تھے۔ میدان میں ان روساء کی نشستیں رہتی تھیں۔

پہاڑی کے دامن میں آکر جمع ہوگئے اور جو نہیں آسکتے تھے انہوں نے اپنا کوئی آدمی بھیج دیا۔

سب پہنچ گئے تو آپ نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

اگر میں یہ بتاؤں کہ یہ وادی جو اس پہاڑ کی آڑ میں ہے یہاں دشمن کی فوج پہنچ گئی ہے اور وہ عنقریب تم پر حملہ کرنے والی ہے تو کیا آپ صاحبان میری بات سچ مانیں گے۔

سب نے جواب دیا: بیشک آپ کے متعلق ہمارا تجربہ یہی ہے کہ آپ سچ ہی بولتے ہیں [1]

آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

عذاب خداوندی کا لشکر آنے والا ہے اس سے پہلے کہ عذاب کا یہ لشکر آئے میں تمہیں آگاہ کر رہا ہوں۔

آپ نے اسی موضوع پر تقریر فرمائی۔ بہت ممکن تھا لوگ اثر لیتے مگر خاندان ہاشم کا (وہی عمر رسیدہ عبدالعزیٰ ابولہب) بھڑکتا ہوا اٹھا اور یہ کہتا ہوا اچل دیا:

"محمد! تیرے ہاتھ ٹوٹیں کیا اس لئے ہمیں یہاں جمع کیا ہے"۔ [2]

خاندان کا بڑا پورے خاندان کا سرپرست اور مربی مانا جاتا ہے اور قاعدہ عرب کے مطابق وہ ولی یعنی جواب دہ اور ذمہ دار بھی ہوا کرتا تھا۔ چھوٹوں کے حق میں اس کی بات مانی جاتی تھی۔ ابولہب کو یہ ولایت اور سرپرستی حاصل تھی کیونکہ وہ آنحضرت ﷺ کے والد ماجد کا بڑا بھائی تھا۔ اس کے علاوہ مکہ کا باا ثر دولت مند تھا۔ مجمع نے جب اتنے بڑے آدمی کو خفا ہو کر جاتے ہوئے (واک آؤٹ کرتے ہوئے) دیکھا تو مجمع بھی چلدیا۔ لیکن ذہنوں میں ایک سوال گھر کر چکا تھا (داعی حق کی یہی کامیابی تھی)۔

اتنا اشتعال (بوکھلاہٹ) کیوں؟

کوہ صفا سے جس نے پکارا وہ وہی محمد تھا جس کا نام لینا لوگ بے ادبی سمجھتے تھے۔ جس کو "الصادق" اور "الامین" کہا کرتے تھے۔ جس سے دعائیں کرایا کرتے تھے۔ برکتیں حاصل کیا کرتے تھے۔ جس نے کچھ عرصہ پہلے اس خوفناک ہنگامہ کو نہایت خوبصورتی سے ختم کیا تھا جو تعمیر کعبہ کے وقت حجر اسود کے سلسلہ میں سر اٹھا چکا تھا۔

کوہ صفا کی مختصر تقریر میں جن خرابیوں کی طرف آنحضرت ﷺ نے اشارہ کیا ان کا احساس خود قریش کو بھی تھا۔ انہی کمزوریوں اور خرابیوں کی اصلاح کے لئے چند سال پہلے وہ انجمن بنائی تھی اور وہ عہد نامہ طے کیا تھا جو حلف الفضول کے نام سے مشہور تھا۔

---

[1] ماجربنا علیک الا صدقاً بخاری شریف ص ۷۰۲

[2] بخاری شریف ص ۷۰۳

یہ ابولہب جو اس وقت سب سے پہلے مشتعل ہوا آنحضرت ﷺ کا وہی عم بزرگ ہے جو آنحضرت ﷺ کی ولادت پر اتنا خوش ہوا تھا کہ اپنی باندی ثوبیہ کو فوراً آزاد کر دیا۔ اسی ثوبیہ نے سب سے پہلے اس نونہال محمد ﷺ کو دودھ پلایا تھا۔

پھر یہ خفگی اور اتنی بوکھلاہٹ کیوں؟

اس کا سبب وہ انقلاب تھا جس کی تصویر اس مختصر جماعت کے آئینہ کردار میں ان کو نظر آرہی تھی جو اس چند سال کے عرصہ میں (جو تربیت کیلئے مخصوص تھا) محمد ﷺ کے دامن میں تربیت پا کر تاریخ عالم کے پلیٹ فارم پر جلوہ گر ہو چکی تھی، جو ایک طرف شرک والحاد کے مقابلہ میں توحید۔ فسق وفجور کے مقابلہ میں مکارم اخلاق۔ حیوانیت اور بہیمیت کے مقابلہ میں انسانیت اور شرافت کی علمبردار تھی، تو دوسری جانب راتوں کو اٹھ اٹھ کر کلام الٰہی کی وہ آیتیں بھی گنگنایا کرتی تھی جو مفاد پرست، دولت و ثروت اور ظالمانہ سرمایہ داری کے خلاف گرج رہی تھیں۔ جس کا کردار یہ تھا کہ اپنی دولت کو راہ خدا میں لٹا کر ان آیتوں کے مفہوم و مقصود کا وہ نقشہ پیش کر رہی تھی، جو ان دولت پرستوں کے لئے بہت ہی وحشتناک تھا ۔ جھنجلاہٹ اور اشتعال کا باعث یہ بھی تھا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کو سمجھانے کی جتنی کوششیں کیں وہ ناکام ہو چکی تھیں۔

ابولہب جیسا سرمایہ پرست جو خزانہ کعبہ کے غزالہ زریں پر بھی ہاتھ مار دے، عاص بن وائل جیسا ذخیرہ اندوز جو مزدور کی مزدوری برسوں تک ٹلاتا رہے۔ ولید بن مغیرہ جیسا حریص جو سب سے بڑا دولت مند ہونے پر بھی صبر نہ کرے، اور اس کی طمع اور لالچ کا جہنم "هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ" (ق۔۳۰) پکارتا رہے۔ عتبہ بن ربیعہ اور مسعود ثقفی جیسے جاگیردار جن کی زندگی کا نصب العین ہی جاگیرداری اور زراندوزی ہو۔ ابوجہل اور عقبہ بن ابی معیط جیسے باغی اور طاغی بڑے بڑے کاروبار کے مالک جو مکہ اور مکہ سے گزر کر پورے عرب پر چھائے ہوئے ہوں سورہ ھمزہ میں انہی جیسوں کے لئے فرمایا گیا ہے:

> "جہنم کی ہلاکت اور بربادی ہر ایسے شخص کے لئے جو دوسروں کے عیب نکالے اور ان کو نظر حقارت سے دیکھتے ہوئے طعنے دے۔ جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے مال بٹور رکھا ہے اور اس کو بار بار گنتا رہتا ہے۔ سمجھتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ اس کے پاس رہے گا (اس کی سرمایہ داری پائدار ہو گی)۔ ہر گز نہیں، بلاشبہ ایسا ہو گا کہ اس کو حطمہ میں ڈال دیا جائے گا۔ تم جانتے ہو حطمہ کیا ہے۔ وہ خدا کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے جو دلوں کو جھانک [1] لیتی ہے۔ بلند اور دراز ستونوں کی طرح اس آگ کے شعلے ہونگے ان لوگوں کو ان آتشیں ستونوں

---

[1] ایمان ہو تو نہیں جلاتی کفر ہو تو جلا ڈالتی ہے۔ شاہ عبد القادر صاحبؒ

میں گھیر کر بند کر دیا جائے گا۔ (سورہ ھمزہ)

سورہ ھمزہ کو بار بار پڑھئے آپ کو سرمایہ داروں کے اس غیر معمولی اشتعال کا سبب معلوم ہو جائے گا ۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ ابتدائی دور میں اسلام سے مشرف ہو گئے تھے۔ آپ کی مشہور روایت ہے ❶ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دیوار کعبہ کے سایہ میں تشریف فرما تھے۔ میں سامنے پہنچا تو آپ فرمارہے تھے "ھم الاخسرون و رب الکعبۃ یوم القیامۃ" رب کعبہ کی قسم قیامت کے روز یہی لوگ خسارہ میں ہونگے۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے یہ الفاظ سنے تو میں چونک گیا۔ مجھے خیال ہوا کہیں میرے بارے میں بھی کوئی آیت نازل ہوئی ہے؟ میں نے عرض کیا:

یارسول اللہ آپ پر میرے ماں باپ قربان۔ یہ بدنصیب کون ہیں؟

فرمایا: جو سب سے زیادہ دولت مند ہیں۔ صرف وہ مستثنیٰ ہیں جو آگے پیچھے دائیں بائیں سب طرف خرچ کرتے رہیں۔

تعلیمات کا دوسرا رخ

پڑھنا، لکھنا، تہذیب، تمدن

ا۔ تخلیق نواز اور انقلاب انگیز تعلیمات کا دوسرا رخ بھی ملاحظہ فرمایئے۔ مشہور مثل "کلام الملوک ملوک الکلام" کی وجد آفرین مثال بھی آپ کے سامنے آجائے گی۔

وحی کا آغاز لفظ "اِقْرَاْ" سے ہوا۔ اور اس اہمیت کے ساتھ کہ نام رب بھی بعد میں لایا گیا۔ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ "پڑھ اپنے رب کے نام سے" پھر پروردگار (رب) کی تین صفتیں بیان کی گئیں خَلَقَ، الْاَكْرَمُ، عَلَّمَ زیادہ زور عَلَّمَ پر دیا گیا (عَلَّمَ بِالْقَلَمِ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ) تعلیم دی قلم کے ذریعہ۔ سکھایا انسان کو وہ جو نہیں جانتا تھا۔

کیا اس اسلوب کلام سے ہمیں یہ سبق ❷ نہیں ملتا کہ جو شخص اس وحی پر ایمان لائے اس کا پہلا فرض

---

❶ ترمذی شریف ص۸۷ج۲ و مسلم شریف ص۳۲۰ج۱ وغیرہما

❷ جس طرح یہ سبق ملتا ہے کہ معلم حقیقی اللہ تعالیٰ ہے۔ وہ انسان کو وہ باتیں سکھاتا ہے جو وہ نہیں جانتا۔ وہ جس طرح قلم کے ذریعہ سکھاتا ہے وہ اس پر بھی قادر ہے کہ امی محض محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بلا کسی واسطہ کے علم الاولین والآخرین سے نواز دے۔ علق (خون بستہ) یعنی لہو کی پھٹکی۔ اس کو علم سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی۔ خون کی پھٹکی کے لئے علم کا تصور بھی بے محل ہے۔ لیکن خدا قادر پروردگار عالم اس علق سے انسان کو پیدا کرتا ہے اور علم بے پایاں کی دولت سے نوازتا ہے۔ وہی رب ذوالجلال محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسے امی کو جوہر علم سے آراستہ کررہا ہے۔ بلاشبہ کسی امی کو نہیں کہا جاسکتا کہ پڑھ۔ پڑھنے کا حکم امی کے حق میں تکلیف

قرأت اور تعلیم ہے ❶۔ اور تعلیم بھی وہ نہیں جو ماں باپ بچوں کو زبانی دے دیتے ہیں بلکہ تعلیم ایسی جس میں پڑھنا بھی ہو اور قلم سے لکھنا بھی۔

۲۔ کچھ توقف کے بعد دوبارہ سلسلہ وحی شروع ہوا تو اس کا پہلا لفظ تھا یٰٓاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ (اے لحاف میں لپٹنے والے)

اس المدثر کو چھ کاموں کی ہدایت کی گئی۔(۱) دعوت و تبلیغ قُمْ فَاَنْذِرْ (۲) تعظیم رب (عبادت) وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ (۳) ظاہر کی پاکی اور صفائی وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ (۴) باطن کی پاکی و صفائی وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ (۵) بے لوث خدمت لَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ (۶) رضاء مولیٰ کو نصب العین بنا کر اس پر جم جانا۔ صبر و استقامت سے کام لینا۔ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ (المدثر ۴۔۷)

لفظ المدثر ❷ سے خطاب اور اس کے بعد یہ احکام کیا ان کا اشارہ یہ نہیں ہے کہ خدا پرستی اور تلاش حق، ہمدوش تہذیب و تمدن ہونی چاہیئے۔

مالا یطاق ہے۔ مگر رب محمد کا حکم محمد کے لئے تکلیف مالا یطاق نہیں ہے کیونکہ جو حکم کر رہا ہے وہ پہلے ہی محمد ﷺ کو وہ جوہر عطا کر چکا ہے جس نے محمد ﷺ کو خطاب اقرأ کا اہل اور محل بنا دیا۔(واللہ اعلم بالصواب)

❶ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے کے لئے یہ موضوع بہت دلچسپ ہے کہ وہ تحقیق کرے کہ اس وقت تعلیم کے بارے میں اقوام عالم کی حالت کیا تھی اور ان کا ذوق تعلیم کہاں تک سر دپڑ چکا تھا۔ مغربی یورپ، انگلینڈ، جرمنی وغیرہ کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ وہاں تو انسان ابھی پہاڑ کی گھاٹی اور پھونس کی جھونپڑی سے بھی نہیں نکلا تھا۔ رات کو ایک ہی جھونپڑی میں اپنے مویشی کے ساتھ بند ہوتا تھا۔ مشرقی یورپ جہاں "رومن" کا اقبال چمک رہا تھا وہاں بھی علم اور تعلیم کی کچھ دولت تھی تو صرف کلیسا کے تاریک کناروں میں چھپی ہوئی۔ کلیسا سے باہر یا دولت علم سے آشنا ہی نہ تھے یا تعلیم ان کے لئے ممنوع تھی اور کلیسا کے علماء بھی صرف نفع اندوزی کی حد تک علم کے قدردان تھے۔ اگر نفع کسی کتاب کی فروخت سے ہوتا یا چمڑے پر لکھی ہوئی کتاب کے حروف مٹا کر چمڑہ فروخت کر دینے میں نفع ہوتا تو وہ اس سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ (موسیو لیبان)

ہندوستان کا حال معلوم ہے کہ یہاں صرف براہمہ ہند علم کے مالک سمجھے جاتے تھے اور غیر برہمن میں سے آدھی سے زیادہ مخلوق شودر تھی، وہ علم حاصل تو کیا کر سکتی اگر علم کی بھنک بھی کان میں پڑ جاتی تو کان میں سیسہ پگھلا دیا جاتا۔(منو سمرتی)

ایران اور فارس میں عیش پرستی علم پر غالب تھی اور چین و افریقہ کا ماضی ان کے موجودہ حال سے معلوم ہو رہا ہے۔ امریکہ و کناڈا، آسٹریلیا، ربع مسکون سے خارج تھا تو انسانی دنیا سے بھی خارج تھا۔

❷ المدثر دثار سے ماخوذ ہے۔ دثار کا ترجمہ حضرت شاہ عبد القادر صاحبؒ نے لحاف فرمایا ہے کیونکہ دثار اس کپڑے کو بھی کہا جاتا ہے جس سے گرمائی حاصل کی جائے (مجمع البحار)۔ لیکن عرف میں دثار اس کپڑے کو کہتے ہیں جو اس کپڑے کے اوپر پہنا جائے جو بدن سے متصل رہتا ہے۔ جو کپڑا بدن سے لگا رہتا ہے اس کو شعار کہتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے حضرات انصار کے متعلق فرمایا تھا "انتم شعار والناس دثار" یعنی تم میرا وہ لباس ہو کہ اگر تم الگ ہو جاؤ تو بدن ننگا ہو جائے اور دوسرے لوگ اوپر کا آرائشی کپڑا ہیں۔ وہ اگر الگ ہو جائیں تو بدن برہنہ نہیں ہو گا۔ مختصر یہ کہ دثار میں صرف ستر پوشی نہیں ہوتی بلکہ اس سے ایسی آرائش ہوتی ہے جو تہذیب کے تقاضے کو پورا کرے جیسے ہندوستان میں شیروانی یا اچکن اور عرب کے پرانے قاعدہ کے مطابق چادر اور دور حاضر میں عبا۔ پس لفظ المدثر اور اس کے بعد کے الفاظ ثیابك فطھر یہ تصور پیدا کر رہے ہیں کہ داعی الی اللہ کو پورے لباس سے آراستہ ہونا چاہیئے اور لباس بھی ایسا ہو جو پاک صاف ہو۔ یعنی اسلام جب رہبانیت یا سادھو پنے

دلیل صداقت ❶

آنحضرت ﷺ کی صداقت کی بہت سی دلیلیں پیش کی گئی ہیں۔ مستقل کتابیں اس موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ احادیث اور تاریخی روایات کے علاوہ خود قرآن حکیم نے بہت سی دلیلوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہاں صرف دو دلیلیں پیش کی جارہی ہیں۔ ہر ایک انصاف پسند کے لئے یہ دو دلیلیں کافی ہیں۔

پہلی دلیل:

خود آپ کی زندگی (صلوات اللہ علیہ وسلامہ ابداً دائماً) آپ کی زوجہ مطہرہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے سامنے بھی آپ کی سابقہ زندگی تھی۔ اسی زندگی کے معیار پر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے غار حرا کے واقعہ کو پرکھا اور غیر اختیاری طور پر آپ کی نبوت کی معترف ہوگئیں۔ اور جب آپ نے پوری قوم کے سامنے دعوت پیش کی تو وحی خداوندی نے ہدایت کی کہ آپ اپنی قوم سے یہ کہیں کہ یہ دعوت تو میں آپ کو پیش کررہاہوں۔ لیکن

"واقعہ یہ ہے کہ میں اس سے پہلے تم لوگوں کے بیچ میں اپنی پوری عمر بسر کر چکاہوں۔ کیا تم سمجھ بوجھ سے کام نہیں لیتے"۔(سورہ یونس ۱۰ آیت ۱۶)

تشریح: وحی الٰہی کی تلقین یہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ اپنی صداقت کے ثبوت کے لئے لوگوں سے کہیں کہ ساری باتیں چھوڑدو۔ صرف اسی بات پر غور کرو کہ میں تم میں کوئی نیا آدمی ہوں، جس کے حالات وکردار کی تمہیں خبر نہ ہو۔ مین تم ہی میں سے ہوں اور اعلان وحی سے پہلے ایک پوری عمر تم میں بسر کرچکا ہوں۔ اس تمام مدت میں میری زندگی تمہاری آنکھوں کے سامنے رہی۔ بتلاؤ اس تمام عرصہ میں کوئی ایک بات بھی سچائی اور امانت کے خلاف مجھ میں دیکھی۔ تم نے نہ صرف صادق اور امین کہا بلکہ صادق اور

کو پسند نہیں کرتا تو یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ اس کا داعی برہنہ یا صرف ستر پوش (لنگوٹی کسنے والا) نیم برہنہ ہو۔ برہنگی یا نیم برہنگی دونوں حرام ہیں۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ پورا لباس اسی وقت ہو سکتا ہے جب تمدن اس حد تک پہنچا ہوا ہو کہ کپڑا تیار ہوسکتے وہ سل سکے وغیرہ وغیرہ۔ پس اس بات سے انکار کرنے کی گنجائش نہیں ہے کہ کلام اللہ شریف کے اس اسلوب خصوصاً ان الفاظ سے جیسے تہذیب وتمدن کی قدر افزائی ہوئی ہے ایسے ہی صنعت وحرفت، تبادلہ، تجارت وغیرہ ان تمام عوامل کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ جو کسی انسان کے "المدثر" لحاف پوش، یا مہذب لباس پوش ہونے کے لئے ضروری ہوں۔ اور جب ستر پوشی فرض ہے تو لباس وپوشاک کا تیار کرنا اور اس کی تیاری کے جملہ ذرائع مہیا کرنا بھی مسلمانوں کے حق میں اجتماعی فریضہ ہوا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

❶ سیرۃ کی عام کتابوں میں یہ عنوان نہیں ہوتا مگر کتاب اللہ نے آغاز قرآن میں جب نوع انسان کو عبادت کا حکم دیا تو ساتھ ساتھ صداقت کتاب اللہ کی دلیل بھی ایسی پیش کی جس کے ساتھ رسول خدا کی صداقت بھی ضروری ہوجاتی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے سورہ بقرہ، رکوع ۳

امین میرا لقب کر دیا۔ پھر اگر اس تمام مدت میں مجھ سے یہ نہ ہو سکا کہ کسی انسانی معاملہ میں جھوٹ بولوں، تو کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ اب خدا پر بہتان ❶ باندھنے کے لئے تیار ہو جاؤ اور جھوٹ موٹ کہنے لگوں کہ مجھ پر اس کا کلام ❷ نازل ہوتا ہے؟ کیا اتنی سی موٹی بات بھی تم سمجھ نہیں سکتے؟

دوسری دلیل خود قرآن شریف (کلام اللہ)

سچے آدمی کی سچائی کی سب سے بڑی دلیل خود اس کی زندگی ہے اور اپنی زندگی کو دلیل صداقت کے طور پر وہی پیش کرتا ہے جو فی الواقع سچا ہو اور اپنی سچائی پر اس کو پورا یقین ہو، جس کے عمل نے کبھی ضمیر سے بغاوت نہ کی ہو، اور جس کا ضمیر اپنے کردار عمل سے ہمیشہ مطمئن رہا ہو۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب، لیکن آفتاب دلیل انہیں کے لئے بن سکتا ہے جو آفتاب کو دیکھ رہے ہیں۔ جنہوں نے آفتاب نہیں دیکھا انہیں تو کسی اور ہی شاہد کی ضرورت ہو گی۔ قرآن حکیم (کلام اللہ) کہتا ہے: وہ شاہد میں ہوں۔ خود اپنی صداقت کی بھی دلیل ہوں اور صداقت محمد ﷺ کی دلیل بھی میں ہی ہوں۔

وہ عرب جن کو مطمئن کر کے تمام دنیا کے لئے داعی بنانا تھا۔ کلام الٰہی کا خطاب ان سے ہے۔

"تم اہل لسان ہو، اپنی زبان کے عاشق ہو، ایسے عاشق کہ شعر و سخن ہر ایک کی گھٹی میں پڑا ہے۔ شعر و سخن کی یہی گرم بازاری ہے کہ قومی میلوں اور تہواروں کے موقع پر خصوصاً زمانہ حج میں جب عرب کے چنیدہ دماغ منیٰ میں جمع ہوتے ہیں تو کئی کئی روز تک مشاعروں کی محفلیں گرم رکھتے ہو۔ ان میں بڑی شان سے مقابلہ کے قصیدے پڑھے جاتے ہیں۔ پھر جو قصیدے سب سے اونچے مانے جاتے ہیں ان کی یہاں تک قدر کرتے ہو کہ خانہ کعبہ میں جہاں تمہارے بہت سے معبود رہتے ہیں اس قصیدہ کو بھی ایک معبود بنا کر آویزاں کرتے ہو اور تمہارے ذوق و شوق کا عالم یہ ہوتا ہے کہ ان کے سامنے ماتھا رگڑتے ہو

---

❶ تمام علماء اخلاق و نفسیات متفق ہیں کہ انسان کی عمر میں ابتدائی چالیس سال کا زمانہ اس کے اخلاق اور خصائل کے ابھرنے اور پنپنے کا اصل زمانہ ہوتا ہے۔ پس اگر ایک شخص چالیس برس تک صادق و امین رہا ہے تو کیونکر ممکن ہے کہ اکتالیسویں برس میں قدم رکھتے ہی ایسا کذاب اور مفتری بن جائے کہ انسانوں پر ہی نہیں بلکہ اس خدا پر بہتان باندھنے لگے جس کو وہ اپنا خالق و مالک جانتا ہے۔ جس کی عظمت کا معترف ہے جس کے قہر و غضب سے وہ خود بھی ڈرتا ہے اور لوگوں کو بھی ڈرارہا ہے جس کی عبادت میں شب و روز مشغول رہتا ہے جس کا ذکر ہر وقت اس کی زبان پر رہتا ہے اور ہر وقت وہ اپنی کوتاہیوں کی معافی اسی رب سے مانگتا رہتا ہے جیسا کہ احادیث میں ہے کہ ایک ایک مجلس میں ستر ستر بار الفاظ استغفار زبان مبارک پر آجاتے تھے پھر یہی خدا پرستی اور خداترسی کی لگن ہے، جس کی وجہ سے اس کی قوم اس سے ناراض ہو رہی ہے اور وہ قوم کی نگاہوں میں معتوب ہو رہا ہے۔ کیا یہ شخص جھوٹا ہو سکتا ہے؟

❷ جب کہ کلام بھی ایسا ہو کہ اس کا کوئی فقرہ بھی خدا کے ذکر سے خالی نہ ہو۔ کہیں اس کے قہر و غضب کا ذکر ہو، کہیں لطف و کرم کا، کہیں اس کے ہمہ گیر علم کو بیان کر کے بتایا گیا ہو کہ انسان جو بھی کرتا ہے اللہ اس کو دیکھ رہا ہے، سن رہا ہے۔ انسان کو اپنے ہر فعل اور ہر ایک قول کا جواب دینا ہو گا۔ وغیرہ وغیرہ

،ان کو سجدہ کرتے ہو اور صرف قصیدے ہی کو نہیں بلکہ شاعر کو بھی غیر معمولی طاقت کا انسان سمجھنے لگتے ہو کہ اس کے ساتھ جن رہتا ہے۔ جو ایسا غیر معمولی شعر اس کو سکھا دیتا ہے۔ اب دیکھو "محمد" ﷺ بھی تمہارے سامنے ہیں، جنہوں نے کبھی کسی استاد کے سامنے زانو تلمذ طے نہیں کیا۔ کبھی کسی کی شاگردی نہیں کی۔ کبھی کسی مکتب مےں نہیں پڑھا، کبھی کوئی شعر نہیں کہا، کبھی شعر و سخن کی مجلس میں شرکت نہیں کی۔ تم نے اس کو صادق اور امین تو کہا مگر نہ کبھی شاعر کہا نہ کبھی خطباء اور مقررین میں ان کو شمار کیا۔ اس محمد ﷺ کی زبان سے ایک کلام تمہارے سامنے پیش کیا جارہا ہے۔ محمد کہتے ہیں کہ یہ کلام میرا نہیں خدا کا کلام ہے جو میرے اوپر نازل ہوتا ہے جیسا نازل ہوتا ہے بجنسہ اور بعینہ آپ کو سنا دیتا ہوں۔ پس

"اگر تمہیں اس کلام کی سچائی میں شک ہے جو ہم نے (اللہ تعالیٰ) اپنے بندے محمد ﷺ پر نازل کیا ہے تو اس کا فیصلہ بہت آسان ہے۔ اگر یہ محض انسانی دماغ کی بناوٹ ہے تو تم بھی انسان ہو۔ زیادہ نہیں۔ اس جیسی صرف ایک ہی سورت بنالاؤ۔ (اگر تمہارا عقیدہ ہے کہ جنات شعراء کے مددگار ہوا کرتے ہیں تو تم ایسا کرو کہ) اللہ کے سوا جن (طاقتوں) کو تم نے اپنا حمایتی سمجھ رکھا ہے، ان سب کو بھی اپنی مدد کے لئے بلالو۔ اگر تم سچے ہو تو ایسا ضرور کرلو۔ اور اگر تم ایسا نہ کرسکو اور حقیقت یہ ہے کہ ایسا ہرگز نہ کرسکوگے تو اس آگ کے عذاب سے ڈرو جو (لکڑی کی جگہ) انسان اور پتھر کے ایندھن سے سلگتی ہے اور منکرین حق کے لئے تیار کی جاچکی ہے۔" (سورہ بقرہ ۲ آیات ۲۳)

کلام اللہ کی شوکت و قوت اور اپنی صداقت کا یقین حیرت انگیز ہے۔ ایک شخص جس کے ساتھ صرف چند افراد ہیں، جن کو انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے۔ وہ نہ صرف قریش کو نہ صرف اہل مکہ کو بلکہ ہر ایک عربی بولنے والے بلکہ پوری دنیا میں جو بھی شک و شبہ کرے خواہ وہ کوئی ہو، ان سب کو چیلنج کر رہا ہے۔ چیلنج معمولی نہیں ہے، ایسا سخت اور تلخ چیلنج جو معمولی سے معمولی انسان کی غیرت کو بھی اس درجہ مشتعل کردے کہ وہ اپنے تمام ذرائع اور وسائل کو کام میں لاکر چیلنج کا جواب دینے کیلئے بوکھلا جائے۔ مضمون دوبارہ ملاحظہ فرمایئے:

"اگر تم اس چیلنج کو قبول نہیں کرسکتے اور اس جیسی کوئی ایک سورت نہیں لاسکتے تو یقین کرلو کہ تم باطل پر ہو۔ تم حق کا مقابلہ کر رہے ہو۔ تم عذاب الٰہی کے مستحق ہو تمہارا ٹھکانا دوزخ ہوگا، جس کا ایندھن تم جیسے انسان اور پتھر ہونگے" (بقرہ۔۲۴،۲۳)

قرآن حکیم کی ایک سورت ۱۰۸ سورہ کوثر بھی ہے جس میں صرف تین آیتیں (جملے) ہیں جن کے کل الفاظ (کلمات) اٹھارہ ہیں۔

چیلنج کا خلاصہ یہ ہے کہ حق و باطل اور سچائی اور بناوٹ کا فیصلہ اس پر ہے کہ تم صرف ایسا کلام پیش

کردو جو ۱۸ لفظوں پر مشتمل ہو۔ مگر وہ اپنے ظاہری اور معنوی کمالات میں اس جیسا ہو۔ تمام دنیا کے ادیبوں کی مجلسیں اور شعر و سخن کے کمالات کا فیصلہ کرنے والے جج موجود ہیں۔ کسی بھی عدالت، کسی بھی ادبی مجلس میں موازنہ کے لئے پیش کردو۔ اگر تمہارے حق میں فیصلہ ہو جائے تو مان لیا جائے گا کہ یہ کلام، اللہ کا کلام نہیں ہے محمد کی من گھڑت ہے (معاذ اللہ)۔

پھر یہ چیلنج صرف ایک مرتبہ اتفاقی طور پر نہیں بلکہ مختلف عنوانوں سے بار بار دہرایا گیا اور اسی قوت کے ساتھ دہرایا گیا مثلاً:

(۱) سورہ ہود مکہ معظمہ میں نازل ہوئی۔ اس کی آیت ۱۳ جو اس سلسلہ کی سب سے پہلی آیت ہے اس کا ترجمہ یہ ہے۔

"کیا لوگ ایسا کہتے ہیں کہ محمد ﷺ نے یہ قرآن اپنے جی سے گھڑ کر خدا پر بہتان باندھا ہے۔ آپ کہہ دیجئے اگر تم اپنی اس بات میں سچے ہو تو اس طرح کی دس سورتیں گھڑی ہوئی بنا کر پیش کردو اور اللہ کے سوا جس کسی کو اپنی مدد کے لئے پکار سکتے ہو اس کو پکار لو۔"

پھر دو آیتوں کے بعد آیت ۱۶ کا ترجمہ یہ ہے:

"یہ لوگ (جو صرف دنیاوی مفاد اور آسائش کے لئے حق سے اعراض کرتے ہیں اور اس کلام کو اللہ کا کلام نہیں مانتے) یہی وہ ہیں جن کے لئے آخرت میں آگ کے سوا کچھ نہ ہو گا۔ "

(۲) سورہ ۱۰ یونس بھی مکہ میں نازل ہوئی۔ اس کی آیت ۳۸ میں بھی اس چیلنج کو دہرایا گیا ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے:

"کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اللہ کے نام پر یہ بہتان باندھا ہے۔ تم کہہ دو اگر تم اس قول میں سچے ہو تو قرآن کی مانند ایک سورت بنا کر پیش کردو۔ اور خدا کے سوا جن جن ہستیوں کو اپنی مدد کے لئے بلا سکتے ہو (تمہیں پوری اجازت ہے) بلا لو" (آیت ۳۸)

(۳) پہلے دس سورتوں کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس مرتبہ صرف ایک سورت کا۔ پھر سورہ ۵۲ طور میں "سورہ" کا لفظ بھی نہیں بلکہ حدیث (کلام، بات) کا لفظ آیا ہے:

فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ الخ آیت ۳۴ اس طرح کا کوئی کلام لے آئیں اگر سچے ہیں۔

(۴) سورہ بنی اسرائیل آیت ۸۸ میں یہ اعلان کیا گیا:

"اگر تمام انسان اور جن اکٹھے ہو کر چاہیں کہ اس قرآن کے مانند کوئی کلام پیش کردیں تو کبھی بھی پیش نہیں کر سکیں گے۔ اگرچہ ان میں سے ایک دوسرے کا مددگار ہی کیوں نہ ہو۔"

(۵) یہ آیتیں وہ ہیں جن میں یہ چیلنج صراحت کے ساتھ کیا گیا:

"اس جیسا قرآن پیش کر دیں" (۱۷/ ۸۸)

"دس سورتیں بنالائیں" (۱۱/ ۱۳)

"ایک سورت بنا لائیں" (۱۰ / ۳۸)

"ایک سورت بنا لائیں" (۲ / ۲۳)

"اس طرح کا کوئی کلام لے آئیں" (۵۲/ ۳۴)

ان آیتوں کے علاوہ اور بہت سی آیتیں ہیں جن میں بطور اشارہ و کنایہ اس چیلنج کو بار بار دہرایا گیا ہے۔ اس چیلنج کے مخاطب عرب کے وہی فصحاء اور بلغاء ہیں جن کو اپنی ادبیت اور فصاحت و بلاغت پر ناز تھا، جو اپنے زمانہ میں بھی عربی ادب کے استاد مانے جاتے تھے اور آج بھی استاد مانے جاتے ہیں۔ کیا قرآن پاک اور قرآن پاک کے پیش کرنے والے محمد ﷺ کی صداقت کے لئے یہ آفتاب جیسی کھلی ہوئی دلیل کافی نہیں ہے کہ نہ صرف عرب بلکہ تمام دنیا جس میں اکثریت قرآن اور اسلام کے مخالفین کی ہے چودہ سو برسوں سے اس چیلنج کو سن رہی ہے۔ مگر اس کو منظور کرنے سے آج بیسویں صدی عیسوی میں بھی اسی طرح عاجز ہے جیسے ساتویں صدی عیسوی میں عاجز تھی جب یہ قرآن نازل ہو رہا تھا۔

قریش جو اس کے مخاطب اول تھے ان سے یہ نہ ہو سکا کہ ۱۸ لفظ کا کوئی مرتب کلام اس چیلنج کے جواب میں پیش کر سکیں۔ اس کے سوا جو کچھ تدبیریں وہ کر سکتے تھے وہ سب کر لیں۔ مثلاً منصوبہ بند طریقے سے ممانعت کر دی کہ کوئی قرآن نہ سنے اور جب محمد ﷺ نے بازاروں، میلوں اور پبلک مقامات پر کھڑے ہو کر سنانا شروع کیا تو منصوبہ یہ تھا کہ اتنا شور مچایا جائے کہ محمد ﷺ کی آواز کسی کے کان میں نہ پڑ سکے۔ ❶

اگر کوئی اجنبی شخص اس شور وغل پر اعتراض کرنے لگے تو کبھی کہہ دیا جائے معاذ اللہ مجنون ہو گیا ہے۔ کبھی یہ کہہ دیا جائے کہ یہ جادوگر ہے۔ یہ منتر پڑھتا ہے تو ماں بیٹے سے نفرت کرنے لگتی ہے۔ بیوی اپنے شوہر سے اور بھائی بھائی سے جدا ہو جاتا ہے۔ ❷

یہ ابتدائی تدبیریں تھیں۔ پھر جو کچھ کیا گیا، اسلام لانے والوں کو طرح طرح ستایا گیا۔ پھر ان کا بائیکاٹ کیا گیا۔ ان کو ترک وطن پر مجبور کیا گیا اور جب وطن ترک کر چکے تو مدینہ پر بار بار حملے کر کے ان کو صفحہ ہستی سے مٹانے کی کوشش کی گئی۔ یہ سب کچھ کیا گیا مگر یہ نہ ہو سکا کہ قرآن حکیم کے چیلنج کا جواب دے دیں اور ایک سورت اس کے مقابلہ میں پیش کر کے صداقت قرآن اور صداقت محمد کی تردید

---

❶ حم سجدہ آیت ۲۶

❷ سورہ ۵۱ الذاریات آیت ۵۲، سورہ ۵۲ الطور آیت ۲۹ وغیر ذٰلک

کر دیں۔

یہ صداقت کی دوسری دلیل تھی جو آنحضرت ﷺ نے پیش کی اور یہ دلیل جس طرح آنحضرت ﷺ کے ورود مسعود میں برھان قاطع اور حجۃ کاملہ تھی۔ آج چودہ سو برس کے بعد ایسی ہی درخشاں اور تاباں دلیل ہے جو پوری دنیا کو للکار رہی ہے

"قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ﴿۸۸﴾ (بنی اسرائیل۔۸۸) [1]

ضمیر سے بغاوت کی یہ بدترین مثال تاریخ نے فراموش نہیں کی کہ قریش کے یہی سرغنہ ابو جہل، اخنس بن شریق اور ابو سفیان جو دوسروں کو قرآن شریف سننے سے منع کرتے تھے راتوں کو چھپ چھپ کر خود قرآن شریف سنا کرتے تھے۔ رات کے آخری حصہ میں جب رسول خدا ﷺ بھینی بھینی آواز سے قرآن شریف پڑھتے تھے تو قرآن پاک کی فصاحت و بلاغت صداء پر سوز میں عجیب کیفیت پیدا کر دیتی تھی۔ جو ایک دفعہ سن لیتا وہ بار بار سننے کے لئے بے چین رہتا۔ ان سرداروں کو کسی طرح سننے کا اتفاق ہو گیا تو پھر جب موقع ملتا خلوت کدہ کے آستانہ مبارک پر پہنچ جاتے اور کان لگائے سنتے رہتے۔ کبھی آپس میں مڈبھیڑ بھی ہو جاتی تو ہر ایک دوسرے کو ملامت کرتا۔ مگر یہ ایک ایسا جرم تھا جس سے باز رہنا مشکل تھا۔ البتہ نوجوانوں کو منع کرتے ہیں۔ سب کا اتفاق تھا کہ اگر وہ گرویدہ ہو گئے تو ہماری طرح اپنے ضمیر سے بغاوت نہیں کر سکیں گے۔ [2]

محمد ﷺ کی حیثیت

فرائض اور خصوصیات

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے "محمد" ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ﴿۴۶﴾

(سورہ احزاب۔۴۵،۴۶)

اے نبی ہم نے تم کو بھیجا ہے اس شان سے کہ آپ

---

[1] اگر تمام انسان اور سارے جن اس پر متفق ہو جائیں کہ اس قرآن جیسا قرآن پیش کر دیں تو وہ اس جیسا قرآن پیش نہیں کر سکیں گے۔ خواہ وہ اس میں ایک دوسرے کی کتنی ہی مدد کریں۔

[2] سیرۃ ابن ہشام ص ۱۹۳ ج ۱، البدایہ والنہایہ ص ۶۴ ج ۳، الاصابہ ص ۲۳۱ ج ۱، ذکر اخنس بن شریق

۱۔ شہادت دینے والے ہیں
۲۔ بشارت دینے والے ہیں
۳۔ آگاہ کرنے والے ہیں
۴۔ خدا کی طرف بلانے والے ہیں
۵۔ خدا کی طرف سے دعوت دینے کے مجاز ہیں
۶۔ چراغ ہیں روشنی دینے والے۔

یہ معجزانہ بلاغت ہے کہ خطاب ایسے الفاظ سے کیا گیا جس سے یہ بنیادی حیثیت پہلے ظاہر ہو گئی کہ آپ خدا کے بھیجے ہوئے نبی ہیں۔ اس کے بعد مندرجہ بالا چھ خصوصیتیں بیان کی گئی ہیں۔

پہلی خصوصیت اور نبی اور فلسفی کا فرق:

پہلی خصوصیت یہ ہے کہ آپ حق بات کو اس یقین اور ایسے وثوق اور بھروسے سے بیان کرتے ہیں جیسے کوئی آنکھوں دیکھی چیز کی شہادت دیتا ہے۔

یہ فرق ہے نبی اور فلسفی میں۔ فلسفی کے پاس قیاس، تخمینے اور تجربے ہوتے ہیں۔ تجربوں کی بنیاد اگرچہ بسا اوقات مشاہدہ پر ہوتی ہے مگر انسان کا مشاہدہ بھی بسا اوقات غلطی کرتا ہے۔

ہزاروں برس تک دنیا کے فلسفی جن میں سقراط، ارسطو اور افلاطون جیسے ماہر بھی داخل ہیں جو فلاسفہ کے امام مانے جاتے ہیں۔ یہی یقین کرتے رہے کہ چاند اور سورج آسمانوں میں گڑے ہوئے ہیں۔ آسمان زمین کو گھیرے ہوئے ہیں اور وہ زمین کے گرد گھوم رہے ہیں۔ زمین اپنی جگہ ساکن ہے یہ نہ حرکت کرتی ہے نہ کر سکتی ہے۔ یہ سب کچھ وہ اپنے مشاہدہ کی بنا پر کہتے رہے۔ ان کی عظیم الشان رصد گاہیں اسی یقین کی تصدیق کرتی رہیں اور اپنے اس یقین کی بناء پر انہوں نے نجوم، جوتش وغیرہ بہت سے فن ایجاد کئے اور یقین کرتے رہے کہ یہ تمام فنون اور ان کی یہ تمام تحقیقات صحیح اور درست ہیں، ان میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ [1] مگر آج سائنس کی تحقیق یہ ہے کہ یہ جو کچھ تھا فریب نظر تھا۔ آج کی دنیا میں اس سے بڑا احمق اور جاہل کوئی نہیں جو آسمان کو گھومتا ہوا مانے اور چاند سورج کو اس میں جڑا ہوا سمجھے۔

ان فلاسفہ کو پورا یقین تھا کہ ہماری زبان سے جو الفاظ نکلتے ہیں وہ فوراً ہی فنا ہو جاتے ہیں۔ ان کے فلسفی ضابطہ کا فیصلہ یہی تھا کہ حرکت اور اس کے اثرات کا کوئی اپنا وجود ہی نہیں ہے۔ لہذا ان کے بقاء کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہماری آواز اور ہمارے الفاظ زبان کی حرکت کا اثر ہے جو ساتھ ساتھ ختم ہوتا رہتا

---

[1] ان کے اس یقین میں بسا اوقات جارحیت ہوتی تھی۔ وہ اپنے مخالف کو سخت سزا کا مستحق سمجھتے تھے۔ انہیں کے پیش رو وہ تھے جنہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نذر آتش کرنے کے لئے جہنم تیار کیا تھا۔

ہے۔ لیکن آج مشاہدہ یہ ہے کہ جو لفظ زبان سے نکلتا ہے باقی رہتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ جو الفاظ انسانوں کی زبان سے بولے گئے وہ سب فضا میں موجود ہیں۔

بہر حال سابق فلاسفہ نے جو باتیں صرف ذہانت سے معلوم کی ہیں اور موجودہ فلسفی جن باتوں کا مشاہدہ کر رہے ہیں ان تمام تحقیقات اور مشاہدات کے باوجود یہ سب قدیم اور جدید فلاسفہ اور ماہرین سائنس یہی سمجھتے رہے اور یہی سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہماری تحقیق ہے وہ حرف آخر نہیں ہے۔ ممکن ہے کوئی جدید تحقیق اس تحقیق کو غلط قرار دے دے۔ لہٰذا یہ یقین کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں وہی حرف آخر ہے اور وہی حق ہے اس کے سوا باطل ہے یہ یقین فلسفی کو میسر نہیں آتا۔ اس کو خود اپنی تحقیق کے اندر شک رہتا ہے۔ اس بناء پر وہ اطمینان سے محروم رہتا ہے۔ اور جب اطمینان کی دولت خود اس کے پاس نہیں ہوتی تو وہ کسی دوسرے کو یہ دولت کہاں سے دے سکتا ہے؟ اور جب اس کو اپنی تحقیق پر مکمل اطمینان اور یقین نہیں ہوتا تو اس کے لئے فدا ہو جانے اور قربان ہونے کا جذبہ بھی اس کے اندر نہیں ہوتا۔ لہٰذا عمل کے لحاظ سے وہ عموماً کوتاہ رہتا ہے۔

مادہ کی طرح روح اور خدا سے تعلق رکھنے والے مسائل (مثلاً خالق کائنات کی ذات و صفات، اس سے انسان کا تعلق، حیات بعد الممات، عمل اور پاداش عمل جیسے مسائل) میں بھی فلسفی کا فیصلہ دوٹوک نہیں ہوتا۔ اس کا ترقی پذیر دماغ جس چیز کو آج روشنی سمجھتا ہے وہی چیز اگلے روز اس کو تاریک نظر آتی ہے اور سکون و اطمینان کے بجائے اس کا دماغ نئے خلجان میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اس کے پیرو کار جو بصیرت سے محروم اور اندھی تقلید کے عادی ہوں فلسفی کے کسی نظریہ کے معتقد ہو جائیں، مگر ان کی یہ تقلید بھی شک و شبہ کی گرد سے پاک نہیں ہو سکتی۔ اور یہی سبب ہوتا ہے کہ اس کے مخالف اور متضاد نظریہ کو بھی[1] حق سمجھنے لگتے ہیں۔ قرآن حکیم میں بار بار کہا گیا ہے کہ ان عقل پرستوں کے پاس جو کچھ ہے وہ "ظن" ہے جو شک و شبہ اور خلجان کے گرد و غبار سے پاک اور صاف نہیں۔ جہاں حق کی ضرورت ہو وہاں ظن کام نہیں دے سکتا۔[2]

مکڑی کا جالا کرم شب تاب کو الجھا تو سکتا ہے اس کو منزل تک نہیں پہنچا سکتا۔ قطب مینار کی بلندی تک وہی رسی پہنچا سکتی ہے جو نہایت مضبوط ہو۔ نبی کے پاس حق اور یقین کی یہی مضبوط رسی ہوتی ہے جو اس

---

[1] برادران وطن کے دھرم کا مدار وحی پر نہیں ہے کیونکہ وہ نبوت کو نہیں مانتے ان کے دھرم کا مدار فلسفہ پر ہے وہ اپنے رشیوں اور منیوں کو فلسفی ہی مانتے ہیں۔ اسی کا اثر ہے کہ کسی ایک عقیدہ اور نظریہ پر ان کو یقین نہیں ہوتا وہ ہر ایک عقیدہ کو صحیح ماننے لگتے ہیں۔ وہ اس کو وسعت نظر اور فراخی ظرف سمجھتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کا سبب گم گشتگی نظر اور فقدان یقین ہے۔

[2] سورۃ النجم ۲۸۔

کو اس کا رب اور معبود عطا کرتا ہے۔ [3] اور اس کو یقین ہوتا ہے کہ یہ رسی خود اس کے رب کی عطا کردہ ہے ۔ وہ اپنی جان قربان کر سکتا ہے مگر اس رسی کو نہیں چھوڑ سکتا۔

اس یقین کا ثمرہ وہ غیر معمولی اعتماد اور توکل ہوتا ہے جو نبی کو اپنے رب پر ہوتا ہے۔ جو بڑی سے بڑی جابر و ظالم طاقت کے مقابلہ میں بھی اس کو پہاڑ کی چٹان بنائے رکھتا ہے اور سخت سے سخت خطرہ کے موقع پر بھی اس کا تصور یہ ہوتا ہے۔

"ہم خدا پر اعتماد اور بھروسہ کیوں نہ کریں جن کا (فضل و کرم یہ ہے کہ روحانی اور مادی زندگی کے) تمام راستوں میں اس نے ہماری رہنمائی کی۔ بلاشبہ ہمیں یہ کرنا ہے کہ ہم ان تمام اذیتوں کے مقابلہ پر استقلال اور ضبط و تحمل سے کام لیں جو تم ہمیں پہنچا رہے ہو اور اللہ ہی ہے جس پر بھروسہ کرنے والوں کو بھروسہ کرنا چاہئے"۔ (سورہ ابراہیم۔۱۱)

مختصر یہ کہ اللہ کے رسول ﷺ کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ شاہد ہیں یعنی جو کچھ بتاتے ہیں وہ ایسے یقین کے ساتھ جو مشاہدہ سے بھی بڑھا ہوا ہوتا ہے، جس کی پشت پر حق و صداقت کی سرفروشانہ اور فداکارانہ پختگی ہوتی ہے۔

دوسری خصوصیت:

یہ کہ جو لوگ اس حق و صداقت کو قبول کر لیتے ہیں ان کو پہلی بشارت [1] یہ ہوتی ہے کہ انہوں نے سچائی کا راستہ پالیا اور خدا پرستی کے جس صراط مستقیم کی تلاش میں وہ سرگرداں تھے وہ صراط مستقیم ان کو مل گیا۔ وہ تشنہ کام، جو تلاش حق میں سالہا سال سے سرگرداں رہے ان کیلئے اس سے زیادہ بشارت کیا ہو سکتی ہے کہ وہ گوہر مراد ان کے دامن میں آگیا جس کے لئے وہ بے چین تھے اور جس کی جستجو میں وہ اپنی عمر کھپا رہے تھے۔ دوسری بشارت یہ ہے کہ اس کے بہترین فوائد اور نتائج ان کو موجودہ زندگی میں بھی میسر آئیں گے اور اس عالم میں بھی میسر آئیں گے جہاں حق و باطل کا فیصلہ ہوگا۔ جہاں کی زندگی حقیقی زندگی ہے اور جہاں کی کامیابی ابدی کامیابی ہے۔

تیسری خصوصیت:

یہ کہ جو لوگ سچائی کے سامنے گردن نہ جھکائیں جو اس سے منہ موڑیں ان کو آگاہ کردیں کہ وہ

---

[3] سورہ بقرہ آیت ۲۵۶ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى

[1] ایک سبق: نبی اور نہ صرف نبی بلکہ ہر ایک داعی حق کا یہ کام ہے کہ وہ پر امید رہے اور جس کو وہ دعوت دے تو پہلے اس دعوت کے فائدہ بخش اور روشن پہلو اس کے سامنے رکھے۔

موجودہ اور آخرت کی زندگی کی کامیابیوں سے منہ موڑ رہے ہیں۔ اس کے بدترین نتائج اس زندگی میں بھی ان کے سامنے آئیں گے اور اس زندگی میں بھی جو حقیقی زندگی ہے۔ آپ کی حیثیت یہ ہے کہ آپ نذیر ہیں (آگاہ کرنے والے)

چوتھی خصوصیت:

یہ کہ آپ داعی الی اللہ ہیں۔

پانچویں خصوصیت:

یہ ہے کہ آپ محض فطری خیر اندیشی اور خیر سگالی کی بناپر دعوت نہیں دیتے بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس جلیل اور عظیم خدمت کے لئے مامور ہیں۔

چھٹی خصوصیت:

وہ ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ کی پوری زندگی کالب لباب ہے۔ آپ کی تمام سوانح حیات ان دو لفظوں میں سموئی ہوئی ہے کہ آپ سراج منیر ہیں، یعنی نوع انسان کی محفل میں رونق افروز ہیں۔ مگر اس طرح کہ سراسر سوزو گداز ہیں اور یہ سوزو گداز ہی وہ نور ہے، جو دوسروں کو روشن کر رہا ہے۔
اس چھٹی خصوصیت کا مشاہدہ کرانے کے لئے حیات مقدسہ کی مختصر سوانح آئندہ صفحات میں پیش کی جارہی ہے۔(واللہ الموفق وھوالمعین)

شمع سوزاں اور سراج منیر کو گل کرنے کی کوشش

وہی محمد ﷺ، سرداران قریش جس کو الصادق اور الامین کہا کرتے تھے اس کی مقدس تعلیم کو جب انہوں نے اپنے مفادات کے لئے خطرہ عظیم اور برق خرمن سوز سمجھا تو اب رات دن ان کی کوشش یہ تھی کہ اس آواز کو دبائیں اور اس شمع کو گل کردیں۔ چنانچہ باپ دادا کے مذہب قدیم کے نام پر عوام میں اشتعال پیدا کردیا۔ جس پر وہ آنحضرت ﷺ اور گنے چنے مٹھی بھر مسلمانوں کے درپے ہوگئے۔ اس کے علاوہ خود ان کی سرگرمیاں نئے نئے ستم ایجاد کرنے میں مصروف رہنے لگیں۔ خانہ کعبہ کا حرم محترم جہاں خود ان کے عقیدے کے بموجب کسی بھی جاندار کو ستانا گناہ تھا، محمد رسول اللہ ﷺ وہاں اپنے رب کی عبادت کرتے تو ستائے جاتے اور طرح طرح سے ستائے جاتے تھے۔ ایک دفعہ ابو جہل نے اپنے ساتھیوں سے کہا: اگر میں نے دیکھ لیا کہ حرم کعبہ میں محمد اپنا چہرہ زمین پر رکھے ہوئے ہیں تو میں اسکی گردن اپنے

پیر سے روند دونگا [1]۔ ابو جہل نے تو ایسا نہیں کیا لیکن اس کا دوست عقبہ بن ابی معیط اس سے بھی زیادہ حرکت کر گزرا۔

آنحضرت ﷺ حرم کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے عقبہ بن ابی معیط نے چادر گردن میں ڈالدی اور اتنی زور سے اس کو اینٹھا کہ محبوب خدا ﷺ کا سانس گھٹ گیا آنکھیں باہر کو آنے لگیں۔ اتفاق سے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ وہاں پہنچ گئے۔ عقبہ کو دھکیل کر پیچھے کیا چادر گردن مبارک سے ڈھیلی کی اور ان دشمنان حق سے کہا:

اَتَقۡتُلُوۡنَ رَجُلًا اَنۡ یَّقُوۡلَ رَبِّیَ اللّٰهُ وَقَدۡ جَآءَكُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ مِنۡ رَّبِّكُمۡ (المومن۔۲۸)

"کیا تم ایک آدمی کو اس پر قتل کر رہے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے اور تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے وہ روشن دلیلیں لایا ہے جن کا تم انکار نہیں کر سکتے۔ [1]"

خانہ کعبہ کے قریب اکثر سرداران قریش کی نشست رہتی تھی۔ ایک روز آنحضرت ﷺ نماز میں مصروف تھے، ابو جہل نے اپنے ساتھیوں سے کہا: فلاں محلہ میں اونٹنی ذبح ہوئی ہے ایسا کرو کہ اس کا بچہ دان [2] اٹھالاؤ اور محمد کے سر پر رکھ دو۔ یہی بدبخت عقبہ بن ابی معیط کھڑا ہو گیا۔ اس محلہ میں گیا۔ بچہ دان اٹھوا کر لایا اور جب آپ سر بسجود تھے پورا ملغوبا سر مبارکہ پر ڈالدیا۔ آنحضرت ﷺ کو حرکت کرنی مشکل ہو گئی (یا بارگاہ خداوندی میں مظلومانہ التجا کے لئے قصداً حرکت نہیں کی) مگر یہ بدبخت اپنی اس بدمستی پر خوش تھے اور قہقہے مارتے ہوئے ایک دوسرے پر ڈھلک رہے تھے۔ آنحضرت ﷺ کی چھوٹی صاحبزادی سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو خبر ہوئی وہ دوڑی ہوئی آئیں اور گندگی کے اس بوجھ کو سر مبارک سے ہٹایا۔ [3]

جب حرم پاک میں رہنماؤں اور سرداروں کی یہ حرکتیں تھیں تو مکہ کے عوام، مکہ کی گلیوں، کوچوں میں جو کچھ کر گزرتے کم تھا؟ چنانچہ ایسا بھی ہوا کہ اوپر سے کوڑا کرکٹ جسد اطہر پر ڈالا گیا اور ایک پڑوسی

---

[1] بخاری شریف ص ۷۴۰ الاطئن عنقہ ۱۲

[1] بخاری شریف ص ۷۱۱

[2] سلا جزور سلا بچہ دان (بخاری شریف وغیرہ)

[3] بخاری شریف ص ۳۷ آنحضرت ﷺ کو جو تکلیف پہنچائی جاتی تھی آپ اس کا انتقام تو کیا لیتے کبھی بددعا بھی نہیں کرتے تھے۔ البتہ حقوق اللہ کی توہین کی جاتی تھی تو آپ بے چین ہو جاتے تھے اور اس وقت بددعا کے الفاظ بھی زبان مبارک پر آجاتے تھے۔ یہاں اس وقت جو کچھ کیا گیا اس میں اول حرم کعبہ کی توہین تھی جو خود عقیدہ قریش کے بموجب بھی حق اللہ کی توہین تھی، دوم یہ کہ بارگاہ خدا میں سجدہ ریزی کی توہین تھی جس کو ہر ایک سلیم الفطرت انسان کی فطرت حق اللہ کی توہین سمجھتی ہے۔ چنانچہ اس موقع پر ان سرداران قریش کے حق میں آپ کی زبان سے بددعائیہ کلمات نکلے اور وہ اس طرح پورے ہوئے کہ یہ سب سردار جنگ بدر میں مارے گئے۔ (بخاری شریف ص ۳۷)

عورت کا محبوب مشغلہ یہ تھا کہ وہ آپ کے راستے میں کانٹے بچھادیا کرتی تھی۔ ❹

اس قسم کی حرکتیں خدا جانے کتنی ہوئیں اور لطف یہ ہے کہ یہ حرکتیں اصل پروگرام سے زائد تھیں۔

منصوبہ بند کوششیں

ابھی آنحضرت ﷺ نے دعوت نہیں دی تھی۔ آپ خاموشی سے ذکر و فکر اور اپنی اور اپنے ساتھیوں کی تربیت میں مصروف تھے۔ اس وقت بھی قریش کے تاڑنے والوں نے یہ کوشش کی تھی کہ یہ سلسلہ آگے نہ بڑھے اور محمد رسول اللہ ﷺ سے کسی طرح کی مفاہمت ہو جائے۔ مگر ان کی یہ کوششیں ناکام رہی تھیں۔ لیکن جب آنحضرت ﷺ نے پورے قریش بلکہ پورے عرب کو مخاطب کر کے تبلیغ شروع کی تو مخالفانہ کوششوں کا بھی نیا دور شروع ہوا۔

قریش کے لئے یہ سوال بہت اہم اور بہت پیچیدہ تھا کہ جس کا وہ احترام کرتے رہے تھے اور جس کو الصادق اور الامین کہا کرتے تھے اب اس کی تردید کس طرح کریں اور عوام کو کس طرح مطمئن کر کے الصادق اور الامین کے خلاف مشتعل کریں۔ حج کا زمانہ قریب آیا تو یہ سوال بہت اہم ہو گیا، کیونکہ یہ یقین تھا کہ محمد ﷺ اس اجتماع عظیم سے فائدہ اٹھائیں گے۔ اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے قبائل مکہ کے ذمہ داروں کا اجتماع کیا گیا۔ بحث و مباحثہ کے بعد طے کیا گیا کہ پہلے محمد ﷺ سے الگ گفتگو کر لی جائے۔ ولید بن مغیرہ ❶ کو گفتگو کے لئے منتخب کیا گیا۔ ولید بن مغیرہ مکہ کا سب سے بڑا دولتمند تھا۔ بہترین خطیب، بلند پایہ شاعر، جہاں دیدہ، عمر رسیدہ، تجربہ کار اور ایسا سلیقہ مند کہ شاہان ایران، افریقہ اور شام کے درباروں میں جاتا رہتا تھا اور وہاں اس کی عزت کی جاتی تھی۔

ولید آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ گفتگو کی، آنحضرت ﷺ نے اپنے مقصد کی وضاحت کی اور چند آیتیں قرآن پاک کی پڑھ کر سنائیں۔

ولید آیتیں سُن کر ہکا بکا رہ گیا۔ آنحضرت ﷺ کو تبلیغ سے منع تو کیا کرتا، خود گم ہو گیا۔ خاموشی سے مجلس سے اٹھا اور جب مجلس قریش میں واپس پہنچا تو حالت عجیب تھی۔ لوگوں کو خیال ہوا ولید بہک گیا۔ محمد کا ہو گیا مگر ولید باہمہ عقل اور دانش حیران تھا کہ جو کلام سنا ہے اس کے بارے میں اور خود محمد "رسول اللہ ﷺ" کے بارے میں کیا فیصلہ کرے۔ پورے غور و فکر اور موازنہ کے بعد ولید نے ارکان مجلس سے کہا:

---

❹ یہ ابولہب کی بیوی تھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چچی بھی ہوتی تھی اور اس نے آپ کو بچپن میں گود کھلایا بھی تھا۔ (طبقات ابن سعد ص ۱۳۴ ج ۱)

❶ ولید بن مغیرہ کا آسان تعارف اب یہ ہے کہ اسلام کے مشہور اور کامیاب ترین جرنیل حضرت خالد رضی اللہ عنہ اس کے نامور فرزند تھے جو اس واقعہ سے تقریباً پندرہ سال بعد حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔

محمد کو کاذب نہیں کہہ سکتے، اس کو کاہن بھی نہیں کہہ سکتے۔ شعر و سخن کا میں ماہر ہوں اس کا کلام شعر بھی نہیں ہے۔ کاہنوں کی تک بندیوں کو بھی میں جانتا ہوں۔ محمد جو کلام پیش کرتے ہیں وہ ان سب سے بہت بلند ہے، اس کا کوئی جواب نہیں۔ اس کی تاثیر کا یہ عالم ہے کہ مجھ جیسا پختہ اور ٹھوس آدمی بھی چکرا گیا۔

اصل سوال کے متعلق ولید نے رائے دی کہ محمد ﷺ کی شائستہ اور شیریں گفتگو اور اس کلام کی غیر معمولی تاثیر کا توڑ یہی ہو سکتا ہے کہ پوری قوت سے پروپیگنڈہ کرو کہ

(۱) محمد ﷺ جادو گر ہے۔ وہ ایسے منتر پڑھتا ہے کہ گھر گھر میں پھوٹ پڑ جاتی ہے۔ لہذا اس کی بات نہ سنو۔

(۲) وہ دین سے پھر گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم سب، تمہارے باپ دادا، اور تمہارے وہ دیوتا جن کی پوجا کرتے ہو، یہ سب دوزخ کا ایندھن ہیں۔

(۳) تم یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ محمد ﷺ کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔

ولید کی رائے سے سب نے اتفاق کیا۔ اور صرف طے ہی نہیں کیا بلکہ اس شد و مد سے عمل بھی شروع کر دیا کہ ابھی قبائل کے لوگ حج کے لئے روانہ بھی نہیں ہوئے تھے کہ محمد ﷺ کی بے دینی کا چرچا ان کی گلی کوچوں تک پہنچ گیا اور نہ صرف محمد ﷺ بلکہ آپ کے خاندان "آل ہاشم" کے متعلق بھی نفرت کی لہر ان تمام قبائل میں دوڑ گئی جو حج کیلئے آنے والے تھے۔ ابو لہب کے متعلق طے کیا گیا کہ وہ محمد ﷺ کی نگرانی رکھیں گے اور جہاں وہ تقریر کرنا چاہیں یا لوگوں سے گفتگو کریں وہ ان کو منتشر کر دیں۔

"ابولہب" آنحضرت ﷺ کا سب سے بڑا چچا (تایا) تھا۔ مالدار اور با وجاہت بھی تھا۔ عرب کے قاعدے کے مطابق خاندان کا بڑا شخص خاندان کے ہر فرد کا ولی مانا جاتا تھا اور اس کو حق ہوتا تھا کہ وہ اپنے چھوٹے کے متعلق کوئی اعلان کر دے۔ قصاص وغیرہ کے قضیوں میں ایسے ولی کے قول کی خاص اہمیت ہوتی تھی۔ اسی غرض سے اس کو اس خدمت کے لئے مقرر کیا گیا تھا کہ خاندان کے سب سے بڑے شخص کی حیثیت سے لوگوں کو بتائے کہ محمد ﷺ کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ وہ اپنے خاندانی بزرگوں کو جہنمی بتاتا ہے اور دیوتاؤں کی توہین کرتا ہے۔ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ خاندان کے سب سے بڑے شخص کے قول سے زیادہ کس کی بات معتبر ہو سکتی ہے۔

حج کے موقع پر انتظام کے متعدد شعبے خصوصاً سقایہ یعنی حاجیوں کیلئے پانی کا انتظام (جو سرزمین حجاز خصوصاً مکہ میں سب سے سخت کام تھا) آل ہاشم کے سپرد ہوتا تھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ ابو لہب کے علاوہ آپ کا پورا خاندان اگرچہ مسلمان نہیں ہوا تھا مگر آپ کا حامی تھا۔ خواجہ ابو طالب ان میں پیش پیش تھے۔ سرداران قریش کے پروپیگنڈے کے باعث جو نفرت خاندان ہاشم سے عرب میں پھیل گئی تھی، خواجہ ابو

طالب کو اس کا اندازہ تھا۔ انہیں خطرہ ہوا کہ حج کے موقع پر یہ نفرت بغاوت کی شکل اختیار کر لے گی اور وہ ان خدمات سے محروم ہو جائیں گے جو حج کے موقع پر ان کے سپرد ہوتی تھیں۔ قبائلی رقابت اس فتنہ کو اور ہوا دے سکتی تھی۔

لہٰذا خواجہ ابو طالب [1] نے تقریباً سو شعر کا طویل قصیدہ لکھا۔ جس میں خانہ کعبہ، حرم شریف کی عظمت و حرمت، اس کے واجب الاحترام ہونے کے متعلق مسلمہ روایات، پھر خاندان ہاشم کی عظیم الشان خدمات کا تذکرہ کیا۔ اس قصیدہ میں آنحضرت ﷺ کی سیرت پر بھی روشنی ڈالی کہ ان کے اخلاق و اوصاف کیا ہیں اور قریش کس طرح ان کی تعظیم کرتے رہے ہیں۔ اسی قصیدہ کا وہ مشہور شعر ہے جو نعت شریف کے موقع پر عام طور سے پڑھا جاتا ہے۔

وابیض [2] یستسقی الغمام بوجھہ

ثمال الیتامیٰ عصمۃ للا ر امل

آنحضرت ﷺ کے محامد بیان کرنے کے بعد یہ بھی واضح کیا کہ اگرچہ وہ ایک نئے مذہب کی دعوت دے رہے ہیں مگر ابناءِ ہاشم جو حجاج کی خدمت کرتے ہیں وہ ان کے مذہب کے حامی نہیں ہیں۔ وہ بدستور اپنے قدیم مذہب پر قائم ہیں اور ان کے عقائد وہی ہیں جو سرداران قریش اور عام عرب کے عقائد ہیں۔ وہ اسی طرح دیوتاؤں کو مانتے ہیں اور ان کی پوجا کرتے ہیں۔ بایں ہمہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ "محمد" کو مخالفین کے حوالے کر دیں۔ خاندان ابو طالب اپنی جانیں قربان کر دیگا مگر اپنی موجودگی میں محمد ﷺ کا بال بیکا نہیں ہونے دے گا۔

عرب شعر کے دلدادہ ہوتے تھے۔ شاعروں کے قصیدے جیسے ہی پڑھتے جاتے تھے، بچہ بچہ کی زبان پر چڑھ جاتے تھے اور پھر جگہ جگہ وہ نقل کئے جاتے تھے۔ اس وقت شعراء کے قصائد کو وہی طاقت حاصل تھی جو دور حاضر میں کسی مضبوط پریس کو حاصل ہے۔ چنانچہ خواجہ ابو طالب کا یہ قصیدہ تمام قبائل میں پھیل گیا اور اس طرح وہ فتنہ فرو ہوا جو بنو ہاشم کے خلاف کھڑا کیا جا رہا تھا۔ مگر آنحضرت ﷺ کی دعوت کے متعلق اس کی وہی قوت باقی رہی بلکہ خواجہ ابو طالب کے قصیدے نے اور تائید کر دی کہ محمد ﷺ نئے مذہب کے داعی ہیں۔ چنانچہ خواجہ ابو طالب اور ان کے ساتھیوں کو تو اپنی خدمات کی انجام دہی

---

[1] ابن ہشام نے اس پورے قصیدہ کو نقل کیا ہے اور اس کی وجہ تصنیف یہی بیان کی ہے جو اوپر گزری۔ ص ۱۶۶ تا ص ۱۷۱، ج ۱

[2] یعنی محمد ﷺ کی ایک تعریف یہ ہے کہ ایسا روشن چہرہ جس کا واسطہ دیکر بادل سے بارش مانگی جاتی ہے (یہ ایک واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ بارش نہیں ہوئی تھی تو قریش نے آپ سے دعا کرائی تھی اور بارش ہو گئی تھی) یتیموں کی پناہ ہیں، بے سہارا بیوہ عورتوں کی عصمتوں کے محافظ۔

میں کوئی نئی دشواری پیش نہیں آئی مگر آنحضرت ﷺ کا تعاقب پوری طرح کیا گیا۔ آنحضرت ﷺ جہاں تشریف لے جاتے عرب کا گوراچٹا[3] ایک باوجاہت سردار (ابولہب) ان کے پیچھے ہوتا، جولوگوں کو ڈانٹتا رہتا کہ ان کی بات نہ سنو، یہ پاگل ہوگئے ہیں[1] (معاذ اللہ)

ھڑبونگ اور انتشار:

ابولہب کا یہ طریقہ انفرادی نہیں رہا بلکہ اجتماعی بن گیا۔ اور یہ طے کر دیا گیا کہ محمد رسول اللہ ﷺ جہاں بھی تقریر کریں یا قرآن پاک کی آیتیں سنائیں اتنا شور مچاؤ کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے۔ اور محمد ﷺ زچ ہو کر رہ جائیں[2]۔ قریش مکہ کی شرارت پسندی کو داد دینی چاہئے کہ کئی سال تک یہ پروگرام چلاتے رہے۔

ناکہ بندی:

ابوذر رضی اللہ عنہ قبیلہ غفار کے نمایاں شخص تھے۔ دل میں صداقت کی تڑپ رکھتے تھے۔ آنحضرت ﷺ کے دعویٰ نبوت کا چرچا آپ تک پہنچا۔ حقیقت معلوم کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ چھوٹے بھائی (انیس) سے کہا: مکہ معظمہ جاؤ اور تحقیق کر کے آؤ۔ انیس مکہ آئے، ملے جلے اور واپس جا کر رپورٹ دی۔ ایک صاحب ہیں اچھی باتیں بتاتے ہیں بری باتوں سے روکتے ہیں۔

ابوذر اس دو حرفی رپورٹ سے مطمئن نہیں ہوئے۔ خود سفر کا ارادہ کر لیا اور فوراً ہی تیار ہو کر چل دیئے۔ ابوذر رضی اللہ عنہ مکہ میں آئے لیکن تحقیق کس سے کریں؟ جہاں نام لینا بھی مصیبت کا سر لینا تھا۔ لوگ مارنے اور پیٹنے کو تیار ہو جاتے تھے، وہاں راستہ کون بتاتا اور تعارف کون کراتا۔ کئی دن اس شش و پنج میں گذر گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کو دیکھا کرتے تھے ایک روز ان کو دیکھ کر ٹھٹکے اتہ پتہ اور مکہ آنے کا سبب معلوم کیا اور جب مقصد معلوم ہو گیا تو آپ نے فرمایا کہ میرے ساتھ چلو۔ مگر اس طرح چلو کہ کسی کو معلوم نہ ہو کہ میرے ساتھ چل رہے ہو۔ میں کوئی اندیشہ محسوس کروں گا تو چپل ٹھیک کرنے کے بہانے دیوار سے لگ کر کھڑا ہو جاؤں گا تم آگے چلتے رہنا۔ غرض حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بڑی رازداری سے کام لیا، تب حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ منزل مقصود پر پہنچ سکے۔

---

[3] ابولہب کا رنگ سفید، سرخی رخساروں میں گھلی ہوئی، اس کے رخساروں کو شعلوں سے تشبیہ دیتے ہوئے اس کا لقب ابولہب رکھا گیا تھا یعنی شعلوں والا۔

[1] طبقات ابن سعد ص ۱۴۵ ج ا وغیرہ

[2] قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ (حم سجدہ۔ ۴۱)

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کی نظر روئے انور پر پڑی دل نے تصدیق کی کہ گوہر مراد حاصل ہو گیا۔ آپ نے اسلام کا پیغام معلوم کیا اور بقول ابو ذر رضی اللہ عنہ وہیں کے وہیں [3] (فوراً) مسلمان ہو گئے۔

زدو کوب اور مشق ستم:

ایمان کا نور تھا یا جرأت و ہمت کا فولاد جو ابو ذر رضی اللہ عنہ کو حاصل ہوا۔ واپس ہو کر حرم کعبہ میں پہنچے۔ قریش کے کئی سردار حرم میں موجود تھے۔ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کی نظر ان فرعون منش سرداروں پر پڑی تو جوش آ گیا۔ ایسی سیدھی راہ اور ایسی سچی بات۔ اور ان لوگوں نے اس کے ناکے بند کر رکھے ہیں اور یہ "محمد" مجسم صداقت و ہدایت ان کا کوئی نام تک زبان پر نہیں لا سکتا۔ اس تصور نے جذبہ کی قوت حاصل کی۔ چنانچہ آپ نے اُن روساء کو خطاب کر کے فرمایا: یامعشر قریش۔ انی اشھدُ ان لاالٰہ الا اللہُ۔"

قریش کے سردار اس جرأت کو کب نظر انداز کر سکتے تھے، آواز دی: قوموا الیٰ ھذا الصابی۔ اٹھ کھڑے ہو اس بے دین کی طرف (مارو اس بے دین کو)۔ سب طرف سے لوگ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ پر ٹوٹ پڑے اور جاں بلب کر دیا۔ حضرت عباس جو اب تک مسلمان نہیں ہوئے تھے وہاں موجود تھے۔ انہیں خطرہ ہوا کہ ابوذر رضی اللہ عنہ کی جان جاتی رہے گی وہ ان کے اوپر اوندھے پڑ گئے اور پکار کر کہا:

"یہ قبیلہ غفار کا آدمی ہے۔ اس کے قبیلہ والوں نے اگر تمہارا راستہ بند کر دیا تو بھوکے مر جاؤ گے۔ غلہ کا ایک دانہ تم تک نہ پہنچ سکے گا۔"

غلہ کا نام سن کر لوگوں نے ان کو چھوڑا۔

اگلے روز پھر یہی ہوا۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے اسلام کا نعرہ بلند کیا اور قریش کے نوجوانوں نے ان کو پیٹنا شروع کیا، تب بھی حضرت عباس ہی کسی طرح وہاں پہنچ گئے اور یہی کہہ کر ان کو بچایا۔ [1]

اسطرح کے واقعات اسلام لانے والوں کے ساتھ مسلسل ہوتے رہتے تھے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کئی بار اس طرح تختہ مشق بن چکے تھے مگر مارنے والوں میں کوئی بچانے والا بھی کھڑا ہو جاتا تھا جس سے جان بچ جاتی تھی۔ لیکن ایسا بھی ہوا کہ کوئی بچانے والا نہیں پہنچ سکا تو جان بھی جاتی رہی۔

حارث بن ابی ہالہ۔ جو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے لڑکے اور آنحضرت ﷺ کے پروردہ تھے، ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ کو چھڑانے آئے۔ لوگوں نے آپ کو تو چھوڑ دیا مگر ان کو اتنا مارا کہ شہید ہو گئے۔ اسلام کی راہ میں یہ پہلا خون تھا جس سے حرم مکہ کی وہ زمین رنگین ہوئی جہاں اللہ کے بندے طواف کیا کرتے ہیں۔ [2]

---

[3] اسلمت مکانی بخاری شریف ص۴۹۹

[1] بخاری شریف ص۴۹۹ ،

[2] اول من قتل فی سبیل اللہ تحت الرکن الیمانی الاصابہ (ص۳۰٦ ج۱)

حضرت عمار رضی اللہ عنہ: مشہور صحابی ہیں ان کے والد کا نام یاسر اور والدہ کا نام سمیہ رضی اللہ عنہا تھا۔ ابو جہل نے حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کے اندام نہانی میں برچھی ماری وہ غریب شہید ہو گئیں۔ یہ پہلی خاتون تھیں جو راہ خدا میں شہید ہوئیں۔ رضی اللہ عنہا [1]

حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو جلتی ہوئی زمین پر لٹاتے اور اتنا مارتے کہ بے ہوش ہو جاتے تھے، مگر زندگی تھی باقی رہ گئے۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ: امیہ بن خلف کے غلام تھے۔ جب ٹھیک دوپہر ہو جاتا تو ان کو تپتے ہوئے بالو پر لٹایا جاتا اور پتھر ان کے سینہ پر رکھ دیا جاتا کہ جنبش نہ کرنے پائیں۔ اور ان سے کہا جاتا کہ اسلام سے باز آئیں، مگر ان کی زبان سے "احد" ہی نکلتا یعنی معبود ایک ہی ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔
جب دھوپ میں تیزی نہ رہتی تو گلے میں رسی بندھوا کر لڑکوں کے حوالے کر دیا جاتا کہ مکہ کے اُس سرے سے اس سرے تک گھسیٹتے پھریں۔

حضرت ابو فکیہ رضی اللہ عنہ۔ صفوان بن امیہ کے غلام تھے۔ صفوان ان کو بھی یہی سزا دلواتا تھا کہ ان کو گھسیٹتے ہوئے تپتے ہوئے ریت پر ڈال دیا جاتا اور سینہ پر پتھر رکھ دیا جاتا۔ ایک روز اتنا بھاری پتھر سینہ پر رکھ دیا گیا کہ ان کی زبان نکل آئی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ: جو تیسرے خلیفہ ہوئے، بہت اونچے خاندان کے باحیثیت رئیس تھے۔ جب مسلمان ہوئے تو دوسروں نے نہیں خود ان کے چچا نے ان کو رسی سے باندھ کر مارا۔

حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ: اسلام لائے تو ان کے چچا ان کو چٹائی میں لپیٹ کر ان کی ناک میں دھواں دیتے تھے۔

حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ: مسلمان ہوئے تو ان کو طرح طرح کی تکلیفیں دی گئیں۔ ایک روز دہکتے ہوئے کوئلوں پر لٹا دیا گیا۔ ایک شخص چھاتی پر پیر رکھ کر کھڑا ہو گیا کہ کروٹ نہ لے سکیں۔ یہاں تک کہ کوئلے خون اور چربی سے تر ہو کر ٹھنڈے ہو گئے۔ مدتوں کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں انہوں نے یہ واقعہ بیان کیا اور پیٹھ کھول کر دکھائی جو برص کے داغ کی طرح بالکل سفید تھی۔ [2]

الغرض اس طرح کے مظلوموں کی فہرست بہت طویل ہے اور مظالم کی داستان اس سے بھی زیادہ طویل۔ مقصد یہ ہے کہ اس طرح کے مظالم جو سوچے سمجھے منصوبے کے بموجب قریش کی طرف سے کئے جا رہے تھے انہوں نے مکہ کی پوری فضا کو اس درجہ دہشت زدہ اور مرعوب کر دیا تھا کہ کھلے بدوں اعلان

---

[1] اول شہیدۃ فی الاسلام۔ الاستیعاب س ۶۳۵

[2] یہ تمام واقعات ان حضرات کے حالات میں الاستیعاب اور الاصابہ وغیرہ میں درج ہیں۔

حق تو درکنار لوگوں کو آنحضرت ﷺ کا نام نامی زبان پر لانے کی ہی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ بعض روایتوں کے بموجب ایک ماہ تک حرم شریف میں پڑے رہے۔ صرف زمزم پر گزارا رہا۔ مگر آنحضرت ﷺ تک نہ پہنچ سکے۔ کسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اندازہ ہوا تو بڑی راز داری کے ساتھ وہ آنحضرت ﷺ کے پاس لے گئے۔ (جس کی تفصیل اوپر گزری ہے)

اس طرح کے بے پناہ مظالم نے آنحضرت ﷺ کو مجبور کر دیا کہ کسی خفیہ مقام پر قیام فرمائیں۔ چنانچہ اک مدت تک دار بنی ارقم میں آپ اور آپ کے ساتھی جن کی تعداد تیس کے قریب تھی پناہ گزیں رہے۔ نہایت عجیب بات یہ ہے کہ ان تمام مظالم کے مقابلہ میں رحمۃ اللعالمین کی زبان مبارک اگر متحرک ہوتی تو صرف دعائے خیر کیلیئے۔ یہی حضرت خباب رضی اللہ عنہ جن کو انگاروں پر لٹایا گیا تھا انہوں نے ایک روز درخواست کی کہ رسول خدا ﷺ ان ظالموں کے لئے بد دعا فرمادیں۔ آنحضرت ﷺ خباب رضی اللہ عنہ کے الفاظ سنے سیدھے بیٹھ گئے۔ روئے انور سرخ ہو گیا فرمایا: پہلی امتوں میں یہاں تک ظلم ہوئے ہیں کہ لوہے کے کنگھے سے ہڈیوں اور پٹھوں تک گوشت کھرچ دیا جاتا تھا۔ کسی داعی حق کے سر پر آرہ رکھ کر بیچ سے چیر دیا گیا، مگر ان حضرات کے پائے استقلال میں جنبش نہیں آئی۔ پھر فرمایا: یہ یقینی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دین کو مکمل فرمائے گا۔ یہاں تک ایک مسافر تنہا صفا یمن سے حضر موت تک پہنچ جایا کرے گا، راستہ میں اللہ تعالیٰ کے سوا اس کو کسی کا خوف نہیں ہو گا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ بھیڑیئے کا خطرہ ہو گا جو اس کے گلہ پر حملہ کر سکے گا۔ [1]

مقصد:

حضرت عمار رضی اللہ عنہ ان کے والد اور والدہ تینوں کو طرح طرح ستایا جارہا تھا۔ آنحضرت ﷺ اس طرف سے گذرے۔ ان کو مبتلا عذاب دیکھ کر فرمایا: صبراً یا آل یاسر ان موعدکم الجنۃ۔ [2] آل یاسر! صبر کرو تم سے جنت کا وعدہ ہے۔ یعنی اس انقلابی پارٹی کی پہلی شرط یہ تھی کہ اس کے مجاہدین کی نظر صرف آخرت پر ہو گی۔ ان کی ہر قربانی اللہ کے لئے ہو گی۔ غلبہ اور اقتدار حاصل ہونے کے بعد یقیناً دنیاوی مفادات بھی حاصل ہونگے۔ مگر وہ اللہ تعالیٰ کا فضل وانعام مانا جائیگا مجاہد کا نصب العین نہیں ہو گا۔ قرآن حکیم نے اعلان فرمادیا ہے:

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِى الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ۔ [3] یہ عالم

---

[1] بخاری شریف ص ۵۴۳

[2] الاستیعاب ص ۶۳۲ نمبر ۲۷۹۳۔۲

[3] سورہ قصص ۲۸ آیت ۸۳

آخرت ہم انہیں لوگوں کے لئے خاص کرتے ہیں جو دنیا میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا۔ اور نیک نتیجہ متقی لوگوں کے لئے ہوتا ہے۔

ہجرت حبشہ

قریش اور ترقی پذیر قبائل عرب کے پاس نہ فوج تھی نہ پولیس۔ البتہ معاہدات کا سلسلہ ایسا تھا جو فوج اور پولیس کا کام دیتا تھا۔

معاہدہ ایک حصار ہوتا تھا جو جان کا بھی محافظ ہوتا تھا اور مال کا بھی۔ اور ان معاہدات کے ذریعے طاقت کا بھی توازن قائم رہتا تھا۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو اسی چیز نے بچایا تھا کہ قبیلہ غفار (جس سے قریش کا معاہدہ تھا) اگر بگڑ گیا تو قریش کا اس طرف سے گزرنا اور غلہ برآمد کرنا ناممکن ہو جائیگا۔ ابو بکر صدیق، عبدالرحمن بن عوف، سعد بن ابی وقاص (رضی اللہ عنہم) خود اپنے طور پر مختلف قبائل سے معاہدے کئے ہوئے تھے۔ ابتداء میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم براہ راست کسی قبیلہ سے معاہدہ کئے ہوئے نہیں تھے۔ مگر ان کی حفاظت کی ذمہ داری خواجہ ابو طالب نے لے رکھی تھی۔ خواجہ ابو طالب دوسرے قبائل سے معاہدے کئے ہوئے تھے، اس بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح خواجہ ابی طالب کی پناہ میں تھے اور خواجہ ابو طالب آپ کی پناہ کے ذمہ دار تھے اسی طرح وہ تمام قبائل بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے ذمہ دار تھے جو ابو طالب سے معاہدہ کئے ہوئے تھے۔ مگر اسلام سے مشرف ہونے والوں میں بڑی تعداد وہ تھی جن کے کسی سے خود اپنے معاہدے نہیں تھے کیونکہ وہ اپنے قبیلوں کے شیوخ اور سربراہ نہیں تھے، سربراہ دوسرے تھے یہ ان کے تابع تھے۔ شیوخ اور سربراہوں کے معاہدات کے باعث یہ فائدہ تو تھا کہ غیر قبیلہ کے لوگ ان کو مظالم کا نشانہ نہیں بناسکتے تھے۔ مگر خود قبیلہ کے لوگوں کی مخالفت سوہان روح تھی۔ یہ مسلمان ہوگئے تھے مگر جس مقصد سے مسلمان ہوئے تھے وہ حاصل نہیں تھا۔ یعنی یہ لوگ خدا واحد کی عبادت نہیں کرسکتے تھے۔ چھپ کر قرآن شریف پڑھتے۔ اگر راز فاش ہو جاتا تو طرح طرح کے ظلم سہنے پڑتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اذیتیں اور تکلیفیں سہ رہے تھے۔ مگر آپ کو اپنی تکلیف کا احساس نہیں تھا۔ البتہ ان ساتھیوں کی اذیت کا احساس آپ کو بے چین رکھتا تھا۔ آپ کو معلوم ہوا کہ حبش کا بادشاہ نیک نفس عیسائی ہے۔ اس کی مملکت میں لوگوں کو مذہبی آزادی حاصل ہے۔ لہٰذا آپ نے مشورہ دیا کہ جو جاسکتے ہوں وہ حبش چلے جائیں۔

اس مشورہ پر عمل ہوا۔ پہلے پندرہ صحابہ کا قافلہ روانہ ہوا۔ گیارہ مرد تھے اور چار عورتیں۔ یہ قافلہ ساحل سمندر پر پہنچا۔ ایک جہاز روانہ ہونے والا تھا، اس میں نہایت سستے محصول پر جگہ مل گئی قریش کو اس قافلہ کی روانگی کا علم ہوا تو ایک جماعت ان کو پکڑنے کے لئے دوڑادی، مگر جب وہ ساحل سمندر پر پہنچی تو جہاز روانہ ہو چکا تھا۔

ان حضرات کو وہاں اطمینان میسر آیا تو پھر اور مسلمانوں نے بھی یہ راستہ اختیار کیا۔ مکہ معظمہ سے خفیہ طور سے اکا دکا روانہ ہو کر پہلے ساحل پر جمع ہو گئے اور وہاں سے حبش روانہ ہو گئے۔ اس دوسرے قافلہ میں تقریباً ستر افراد تھے۔

قریش کے لئے یہ بہت بڑا المیہ تھا کہ اتنے مسلمان وہاں جمع ہو گئے۔ انہوں نے بہت کچھ ہدیوں اور تحفوں کے ساتھ بادشاہ حبش کے پاس سفارت بھیجی کہ یہ لوگ بھاگ کر چلے آئے ہیں ان کو حوالہ کر دیا جائے۔ بادشاہ نے مسلمانوں کو طلب کر کے ان کا مقصد معلوم کیا۔

حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کی ترجمانی کرتے ہوئے جو تقریر فرمائی وہ تمام مورخین نے نقل کی ہے اس کا اردو پیرہن یہ ہے:

بادشاہ علیجاہ!

یہ درست ہے کہ ہماری قوم بت پرست ہے، جاہل ہے، اس کو حلال حرام کی تمیز نہیں، مردار کھا جاتی ہے، بدکاریاں کرتی ہے ہمسایوں کو ستاتی ہے، بھائی بھائی پر ظلم کرتا ہے، لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیا جاتا ہے۔ جو برائی ہو سکتی ہے وہ سب ہمارے معاشرہ (سماج) میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہم پر اپنا فضل فرمایا، ہم میں ایک شخص پیدا ہوا۔ عمر کے چالیس سال اس نے ہمارے بیچ میں رہ کر اس طرح گزارے کہ پوری قوم اس کی شرافت کی قائل ہو گئی۔ اسکی صداقت اور سچائی سے یہاں تک متاثر ہوئی کہ اس کو الصادق اور الامین کہنے لگی۔ اس نے بتایا کہ خدا نے اس کو نبی بنا کر بھیجا ہے اور خدا کا حکم یہ ہے کہ صرف خدا واحد کی عبادت کرو، بت پرستی چھوڑ دو، کمزوروں کی مدد کرو، غریبوں پر رحم کرو، ایک دوسرے سے محبت کرو، آپس میں شفقت اور مہربانی سے کام لو، سچائی اختیار کرو، بری باتیں چھوڑ دو، نیک اور دیانتدار بن جاؤ۔

اے بادشاہ! ہمیں یہ باتیں اچھی معلوم ہوئیں ہم نے اس کا دامن سنبھال لیا ہے اور اس کے کہنے پر عمل شروع کر دیا ہے۔

سفارت قریش کے ارکان نے یہ دیکھا کہ بادشاہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی تقریر سے متاثر ہو رہا ہے تو انہوں نے بادشاہ سے کہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کے متعلق ان کا عقیدہ معلوم کیجئے۔ یہ کچھ اور کہتے ہیں اور عیسائیوں کی تردید کرتے ہیں۔

بادشاہ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کے متعلق ان کا عقیدہ معلوم کیا تو حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے سورہ مریم کا دوسرا پورا رکوع پڑھ کر سنا دیا، جس میں حضرت مریم علیہا السلام کی پاکدامنی بیان کر کے بتایا گیا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بیٹے نہیں ہیں بلکہ خدا کے بندے اور اس کے رسول ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے معجزے عطا فرمائے تھے۔ اور پہلا معجزہ یہ تھا کہ انہوں نے گہوارے ہی میں بولنا شروع کر دیا تھا۔

بادشاہ قرآن پاک کی آیتوں اور حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی تقریر سے یہاں تک متاثر ہوا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ پادریوں کو خطاب کر کے کہا کہ میرا یقین ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیثیت اس سے ایک تنکہ کی برابر بھی زیادہ نہیں ہے جو انہوں نے قرآن شریف کے حوالہ سے بیان کی ہے۔ پھر قریش کے سفیروں سے کہہ دیا کہ یہ لوگ آپ کے غلام نہیں ہیں، آپ کے مقروض نہیں ہیں، پھر ان کو آپ کے حوالے کیوں کیا جائے۔ مسلمانوں سے کہا کہ وہ اس کی مملکت میں اطمینان سے رہیں۔ [1]

مسلمان وہاں پر رہے۔ ایک مرتبہ ایک غنیم کا حملہ ہوا تو مسلمانوں نے شاہی فوج کی مدد بھی کی۔ [2]

قریش کا تاثر:

قریش کو اس سفارت کی ناکامی کا علم ہوا تو مسلمانوں کے خلاف ان کا غیض و غضب اور بڑھ گیا اور خواجہ ابو طالب اور آل ہاشم پر پورا زور ڈالنا شروع کر دیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری سے دست کش ہو جائیں۔ چنانچہ روساء قریش کا ایک وفد خواجہ ابو طالب کے پاس پہنچا اور بہت زور ڈالا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو منع کر دیں، ورنہ ان کو ہمارے حوالہ کر دیں۔ مجبور ہو کر ابو طالب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کی۔ آپ نے فرمایا:

> "چچا جان! آپ کی شفقت و محبت کا شکریہ! آپ یقیناً معذور ہیں۔ آپ میری امداد سے دست کش ہو جایئے۔ مگر مجھے میرے رب نے جس مقام پر کھڑا کر دیا ہے میں اس سے ذرہ برابر بھی نہیں ہٹ سکتا۔"

خواجہ ابو طالب نے یہ پختگی دیکھی تو قریش کو جواب دیدیا کہ وہ محمد کی حمایت نہیں چھوڑ سکتے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اجازت دی کہ وہ اپنا کام کرتے رہیں۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے لئے یہ نئی صورت پیدا ہو گئی تھی کہ ایک سو کے قریب مسلمان حبشہ چلے گئے تو اب صرف تیس چالیس مسلمان رہ گئے جن کے لئے مکہ کی غضبناک فضا میں زندگی اور بھی دوبھر ہو گئی تھی۔ ان میں کافی تعداد غلاموں کی تھی۔ اگرچہ ان میں سے زیادہ تر کو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خرید کر آزاد کر دیا تھا، لیکن آزادی کے بعد بھی وہ بے پناہ تھے۔ مسلمان ان کی پناہ ہو سکتے تھے مگر وہ خود چھپ چھپ کر زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا مسلمان ہونا:

---

[1] یہ بادشاہ مسلمان ہو گیا تھا۔ جب اس کا انتقال ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی روز اسکے انتقال کی خبر دیدی اور غائبانہ نماز جنازہ پڑھی۔

[2] المبسوط للسرخی ص۹۸ ج۱۰ باب نکاح اہل الحرب و دخول التجار الیہم بامان۔

مسلمانوں کی تعداد سو سے زیادہ ہو گئی تھی۔ ان میں طلحہ، زبیر، سعد بن ابی وقاص اور شیر خدا حضرت علی رضی اللہ عنہم جیسے جنگجو بہادر بھی تھے، جنہوں نے مستقبل میں عظیم الشان کارنامے انجام دیئے اور غزوات میں بہادری کے بے نظیر جوہر دکھائے۔ مگر یہ حضرات اس وقت ایسے نہیں تھے جن کی مکہ میں دھاک ہو اور جن سے پورا شہر مرعوب رہتا ہو۔ یہ بات صرف دو[1] کو حاصل تھی: عمر بن الخطاب اور ان کے ماموں ابو جہل بن ہشام کو۔ مگر یہ دونوں اسلام کے مقابلہ میں بہت سخت تھے۔ آنحضرت ﷺ دعا فرمایا کرتے تھے کہ خداوندا ان دونوں میں جو تجھے زیادہ محبوب ہو اس سے اسلام کو تقویت فرما۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی یہ جرأت ہی تھی کہ ایک روز طے کر لیا کہ محمد ﷺ کا قصہ تمام کر کے اس خلفشار کا خاتمہ کر دوں جس سے قریش کی زندگی تلخ ہو گئی ہے اور آئے دن ایک ہنگامہ برپا رہتا ہے۔

عمر بن الخطاب نے تلوار ہاتھ میں لے لی اور محمد ﷺ کی تلاش میں نکلے۔ راستہ میں ایک صاحب نعیم [2] بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے آپ کو دیکھا۔ تیور چڑھے ہوئے تھے دریافت کیا: ابن الخطاب کیا ارادہ ہے؟

عمر بن الخطاب: اُس فتنہ کو ختم کرنے جا رہا ہوں جو محمد نے برپا کر دیا ہے (ﷺ)

نعیم بن عبد اللہ: خاندان ہاشم اور جو ان کے حلیف ہیں ان سے کیسے نمٹو گے؟ اور دیکھو ابن الخطاب! محمد کو ختم کرنے سے پہلے اپنے گھر کی خبر لو۔ تمہاری بہن فاطمہ اور بہنوئی سعید بن زید مسلمان ہو چکے ہیں۔

عمر رضی اللہ عنہ ان طعن آمیز، اشتعال انگیز فقروں کو کب برداشت کر سکتے تھے وہ فوراً پلٹے اور محمد رسول اللہ ﷺ کی تلاش چھوڑ کر بہن کے مکان پر پہنچ گئے۔ وہاں حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ قرآن شریف پڑھا رہے تھے۔ جیسے ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دروازے پر پہنچ کر آواز دی، ہمشیرہ صاحبہ نے حضرت خباب رضی اللہ عنہ کو اندر کر دیا مگر تلاوت کی کچھ بھنک عمر کے کانوں میں پڑ چکی تھی۔ عمر جیسے ہی مکان میں داخل ہوئے پوچھا: تم کیا پڑھ رہے تھے؟ بہن بہنوئی نے بات کو چھپانا چاہا۔ کچھ خاموش رہے تو عمر رضی اللہ عنہ نے اسی تیزی میں کہا: میں نے سنا ہے تم بے دین ہو گئے ہو۔ یہ کہہ کر بہنوئی پر ہاتھ اٹھایا۔ بہن اپنے شوہر کو بچانے کے لئے آگے بڑھیں تو ان کے سر پر بھی اتنی زور سے مارا کہ خون بہنے لگا۔ اب بہن کو جوش آگیا۔ فرمایا: عمر رضی اللہ عنہ جو چاہو کر لو۔ ہم مسلمان ہو چکے ہیں اور ہم قرآن شریف پڑھ رہے تھے۔

بہن کے سر سے خون بہتا ہوا دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کچھ پسیجے۔ غصہ ٹھنڈا ہوا تو فرمایا: مجھے دکھاؤ کیا

---

[1] نام دونوں کا عمر، ایک عمر بن الخطاب دوسرے عمر بن ہشام جو ابو الحکم کی کنیت سے مشہور تھا پھر ابو جہل کے نام سے مشہور ہوا۔

[2] نعیم بن عبد اللہ النحام، مسلمان ہو چکے تھے۔ مگر اپنے اسلام کا اظہار نہیں کیا تھا۔ النحام، نحمہ سے ماخوذ ہے نحمہ کے معنٰی ہیں آہٹ یا کھنکار کی آواز۔ آنحضرت ﷺ نے ان کے متعلق فرمایا تھا: سمعت نحستہ فی الجنۃ میں نے جنت میں ان کا نحمہ سنا ہے۔ اسی بشارت کی بنا پر ان کا خطاب نحام ہو گیا۔ (سیرت حلبیہ ص ۳۴۹ ج ۱)

پڑھ رہے تھے۔

بہن نے فرمایا: تم دیکھنا چاہتے ہو تو پہلے غسل کرو۔ تم کافر ہو، ناپاک ہو، قرآن کو نہیں چھو سکتے۔

اب عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا غصہ ختم ہو چکا تھا اور اصل حقیقت معلوم کرنے کا شوق اتنا بڑھ چکا تھا کہ بہن کے توہین آمیز کلام کو برداشت کیا اور غسل کر کے کلام اللہ کے اوراق پڑھنے شروع کئے۔

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝١ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝٢ هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ وَ الظَّاهِرُ وَ الْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝٣ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۚ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَ مَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَ مَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَ مَا يَعْرُجُ فِيْهَا ۚ وَ هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ۚ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝٤ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝٥ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۚ وَهُوَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝٦ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ۚ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ اَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝٧ (سورہ حدید ا تا ۷)

ترجمہ: آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہے اللہ کی پاکی بیان کرتا ہے (کہ وہ ہر ایک نقص سے مبرا ہے)۔ وہ زبردست حکمت والا ہے۔ آسمانوں اور زمین کی سلطنت اسی کی ہے۔ (مستحق بادشاہت وہی ہے) وہی زندگی بخشتا ہے۔ اور موت دیتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ پہلے ہے۔ وہی پیچھے۔ وہی ظاہر ہے اور وہی مخفی (باطن)۔ اور وہ ہر چیز کا پورا علم رکھنے والا ہے۔ وہ ایسا ہے کہ اس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو چھ روز (دور) میں۔ پھر وہ عرش پر رونق افروز ہوا (پوری کائنات کو اپنے اقتدار میں لے لیا)۔ ہر چیز کا اس کو علم ہے۔ وہ جانتا ہے ہر اس چیز کو جو زمین کے اندر داخل ہوتی ہے اور جو زمین سے نکلتی ہے۔ جو آسمان سے اترتی ہے جو آسمان پر چڑھتی ہے اور وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو وہ تمہارے تمام اعمال دیکھتا ہے۔ آسمانوں اور زمین کی سلطنت اسی کی ہے اور تمام باتوں کا مرجع وہی اللہ کی ذات ہے۔ وہ ہی رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں۔ وہ دل کی باتوں کو پوری طرح جانتا ہے۔ ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر۔ اور اس مال میں سے خرچ کرو جس پر اس نے تم کو خلیفہ بنایا ہے۔ پس جو لوگ تم میں سے ایمان لے آئیں اور مال خرچ کریں ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔

اوپر کی آیتوں میں اللہ کی ذات اور صفات کا ذکر ہے۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ بیان فرمایا کرتے تھے: میں یہ آیتیں پڑھ رہا تھا اور جب اللہ کا نام آتا تھا دل کانپ جاتا تھا یہاں تک کہ جب ساتویں آیت پر پہنچا "ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر" تو بے اختیار زبان سے نکلا "اشھد ان لاالہ الاّ اللہ و اشھدان محمدا رسول اللہ"

حضرت خباب رضی اللہ عنہ جن کو اندر چھپا دیا گیا تھا انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبان سے کلمہ شہادت

سنا تو خوش ہوتے ہوئے باہر آئے اور فرمایا: عمر رضی اللہ عنہ بشارت ہو۔ آنحضرت ﷺ نے دعا فرمائی تھی کہ خداوند!! ابوجہل اور عمر میں سے جو تجھے زیادہ محبوب ہو اس سے اسلام کی تقویت فرما۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ بشارت سن کر فوراً ہی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے روانہ ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ آنحضرت ﷺ دار بنی ارقم میں کوہ صفا کے دامن میں پناہ گزین تھے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ ، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور کچھ اور صاحبان حاضر خدمت تھے۔ ان صاحبان نے عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا، تلوار ہاتھ میں لئے آرہے ہیں، کچھ خیال پیدا ہوا مگر یہ بھی سوچ لیا کہ بھرپور جواب دیا جائے گا۔ لیکن عمر رضی اللہ عنہ پہنچے تو انداز دوسرا تھا ۔ آگے بڑھے تو رحمت عالم ﷺ نے کھڑے ہو کر استقبال کیا اور چادر یا کرتے کا کنارہ پکڑ کر فرمایا: عمر کیسے آئے۔ پھر فرمایا: عمر باز نہ آؤ گے۔ کیا خدا کے قہر [1] کا انتظار کر رہے ہو۔

عمر فاروق رضی اللہ عنہ: حضرت باز آچکا ہوں۔ اشھد ان لاالہ الا اللہ واشھد ان محمداً عبدہ و رسولہ ۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مسلمان ہونے کی اتنی مسرت ہوئی کہ خود آنحضرت ﷺ نے بھی زور سے تکبیر کہی اور آپ کے ساتھیوں نے بھی زور سے تکبیر کہی۔ یہاں تک کہ یہ دامن کوہ نعرہ تکبیر سے گونج اٹھا۔ [2]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مسلمان ہو جانے سے اسلام کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اب تک یہ موقع نہیں ملتا تھا کہ مسلمان حرم کعبہ میں نماز پڑھ سکیں۔ مگر عمر فاروق رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے تو پہلے سرداران قریش میں سے ہر ایک کی ڈوڑھی پر پہنچ کر ہر ایک کو آگاہ کیا کہ عمر مسلمان ہو گیا ہے۔ اس کے بعد تمام مسلمانوں کو ساتھ لے کر حرم شریف میں داخل ہوئے اور کھلے بندوں نماز پڑھی۔ لیکن قریش نے سب کی پوری طرح تواضع کی۔ خصوصاً حضرت عمر فاروق ہر ایک کا نشانہ بنے۔ [3]

کافی مار پیٹ کے بعد کسی طرح یہ ہنگامہ ختم ہوا۔ مگر عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا مسلمان ہو جانا ایسا حادثہ نہیں تھا جس پر قریش آسانی سے صبر کر لیتے۔ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زندگی دوبھر کر دی۔ حتیٰ کہ وہ بھی مکان میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ لیکن عرب کے مشہور اور باہیبت قبیلہ بنی سہم سے ان کا معاہدہ تھا یہ معاہدہ اس وقت کام آیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے "عمر فاروق رضی اللہ عنہ مکان میں چھپے ہوئے تھے۔ باہر میدان میں اتنا ہجوم تھا کہ پوری وادی آدمیوں سے پٹی ہوئی تھی، اور یہ شور تھا کہ عمر بے دین ہو گیا ہے۔ میں مکان کی چھت پر کھڑا ہوا یہ ہنگامہ دیکھ رہا تھا۔ میں پریشان تھا کہ کیا ہو گا۔ دفعۃً

---

[1] البدایہ والنہایہ ص ۸۱ ج ۳

[2] ماخوذ از البدایۃ والنہایہ ص ۷۹ تا ص ۸۲ ج ۳۔ السیرۃ الحلبیہ ص ۳۴۹ تا ص ۳۵۴ و تاریخ الخلفاء

[3] ماخوذ از تاریخ الخلفاء جلال الدین السیوطی والبدایہ والنہایہ ص ۷۲ تا ۷۹ ج ۳ والسیرۃ الحلبیہ ص ۳۴۹ تا ص ۳۸۲ ج ۱

ایک صاحب نمودار ہوئے۔ ریشمی کفوں دار قمیض پہنے ہوئے۔ اس کے اوپر ریشمی قبااور شیوخ عرب کے قاعدے کے بموجب ایک بڑھیا چادر اوڑھے ہوئے وہ اندر مکان میں پہنچے۔ والد صاحب سے دریافت کیا۔ کیاواقعہ ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں۔ جرم یہ ہے کہ مسلمان ہو گیا ہوں ۔اس سردار نے کہا: ہر گز نہیں۔ یہ کچھ نہیں کرسکتے۔ میں آپ کو پناہ دیتا ہوں۔ یہ کہہ کر یہ سردار باہر آیا اور اعلان کر دیا کہ عمر کو میں نے پناہ دیدی ہے۔"

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جیسے ہی اس سردار نے یہ اعلان کیا وہ تمام مجمع کائی کی طرح چھٹ گیا۔ میں نے اس سے پوچھا: یہ صاحب کون ہیں۔ جواب دیا قبیلہ بنی سہم کا شیخ و رئیس عاص بن وائل سہمی۔ ❶

بایں ہمہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے سے مسلمانوں کی ڈھارس بندھی اور بقول حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ وہ قوت حاصل ہوئی جو پہلے نہیں تھی۔ ❷ ہم کھلے بندوں حرم کعبہ میں پہنچے، طواف کیا، نماز پڑھی۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مسلمان ہونا اسلام کی فتح تھی۔ ان کی ہجرت نصرت اور ان کی حکومت رحمت۔ ❸

شعب ابی طالب میں پناہ

قریش کی طرف سے قومی بائیکاٹ

پے درپے ناکامیوں نے قریش کو اور زیادہ مشتعل کر دیا۔ کھلم کھلا قتل کرنے میں قبائلی جنگ چھڑ جانے کا خطرہ تھا۔ لیکن خفیہ طور پر قتل کرنے میں پہلے ثبوت کی ضرورت تھی، جس کا مہیا کرنا بنو ہاشم کے لئے تقریباً ناممکن تھا۔ چنانچہ خفیہ طور پر جان جہاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جان لینے کی سازش ہونے لگی۔ خواجہ ابو طالب کے چوکنے دماغ نے اس کو بھانپا۔ انہیں صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہی نہیں بلکہ خاندان ہاشم کے اور لوگوں کے متعلق بھی خطرہ ہوا۔ مثلاً خواجہ ابو طالب کے بڑے صاحبزادے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ اگرچہ ہجرت کر کے حبش چلے گئے تھے لیکن چھوٹے صاحبزادے حضرت علی رضی اللہ عنہ یہیں تھے جو ہر دم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ خواجہ ابو طالب نے خاندان کے لوگوں سے مشورہ کیا اور یہ طے کیا کہ شہر کے خطرناک ماحول سے نکل کر کسی محفوظ مقام پر پناہ لی جائے۔

پہاڑیوں کے بیچ میں ایک مقام "خیف بنی کنانہ" تھا۔ یہ بنو ہاشم کا موروثی رقبہ تھا۔ طے یہ ہوا کہ وہاں

---

❶ بخاری شریف ص ۵۴۵

❷ بخاری شریف ص ۵۲۰

❸ البدایہ والنہایہ ص ۷۹ ج ۳

جاکر قیام کیا جائے۔ چنانچہ پورا خاندان (جس کے بہت سے افراد ابھی مسلمان بھی نہیں ہوئے تھے) اس مقام پر چلا گیا، جس کا دوسرا نام شعب ابی طالب تھا۔ صرف ابو لہب اور اس کا گھرانا مکہ میں رہ گیا جو اپنے خاندان کے خلاف قریش کا سرگرم حامی تھا۔ ابو طالب یہاں پہنچ کر بھی اپنے بھتیجے کی نگرانی راتوں کیا کرتے تھے۔ ان کے سونے کی جگہ بھی بدلتے رہتے تھے۔ قریش کے سرداروں نے اس کا جواب یہ دیا کہ تمام مخالف گروپوں کو ملا کر ان سب کا مقاطعہ کر دیا، جو خواجہ ابوطالب کے ساتھ اس گھاٹی میں پناہ گزیں ہوئے تھے۔ قریش کے ساتھ قبیلہ بنی کنانہ بھی اس معاہدہ میں شریک ہوا❶۔ مقاطعہ صرف رشتے ناتے کا نہیں تھا بلکہ کھانے پینے کی چیزیں بھی بند کر دیں۔ ایک عہد نامہ لکھا گیا کہ ان کے ساتھ نہ نکاح بیاہ کیا جائیگا نہ خرید وفروخت۔ اور کوشش کی جائے گی کہ مکہ سے باہر بھی کہیں سے یہ لوگ کچھ نہ خرید سکیں۔ بیوپاریوں کو آمادہ کیا گیا کہ مکہ کے راستوں کی نگرانی رکھیں اور باہر سے آنے والی جنس کو مکہ میں پہنچنے سے پہلے ہی خرید لیا کریں۔

سرداران قریش کے اس معاہدہ پر دستخط ہوئے اور یہ عہد نامہ قومی حفاظت خانہ (خانہ کعبہ کے خزانہ) میں محفوظ کر دیا گیا۔❷

نبوت کے ساتویں سال۔ محرم کی پہلی تاریخ سے یہ مقاطعہ شروع ہوا تھا۔❸ جو تقریباً تین سال تک رہا۔ اس عرصہ میں درختوں کے پتے اور جڑیں کھا کر زندگی گزارنی پڑی۔ بچے بلبلاتے تھے مگر ان کو دودھ میسر نہیں آتا تھا۔ بکریاں ختم ہو گئی تھیں اور پے درپے فاقوں سے ماؤں کے دودھ خشک ہو گئے تھے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جیسے رفقاء اگرچہ بنو ہاشم نہیں تھے مگر وہ ان کے ساتھ تھے تو مقاطعہ ان سے بھی اتنا ہی سخت تھا۔❶

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ رات کو سوکھا چمڑا ہاتھ آ گیا۔ میں نے اس کو پانی سے دھویا پھر آگ پر بھونا اور پانی ملا کر کھایا۔❷

مکہ میں جو رشتہ دار تھے ان میں وہ بھی تھے جن کو اس حالت پر ترس آتا تھا۔ مگر پابندیاں ایسی سخت تھیں کہ کوئی کچھ امداد نہیں کر سکتا تھا۔

اس معاہدہ کی کوئی مدت نہیں تھی۔ اس کی انتہا یہ تھی کہ محمد ﷺ کو قتل کے لئے حوالہ کر دیں

---

❶ بخاری شریف ص ۴۳۰

❷ البدایہ والنہایہ بحوالہ موسیٰ بن عقبہ عن الزہری ص ۸۴ ج ۳

❸ ابن سعد ص ۱۴۰ ج ۱

❶ سیرۃ ابن اسحاق بحوالہ ازالۃ الخفاء ص ۱۰ ج ۲

❷ روض الانف بحوالہ سیرۃ النبی ج ۱

❸ـ

تین سال پورے ہونے لگے تو یک طرفہ متواتر ظلم و ستم کچھ اہل قرابت کے دلوں میں نرمی پیدا کی اور یہ بحث شروع ہوئی کہ معاہدہ کی پابندی کب تک کی جائے۔ لیکن پلہ ان کا بھاری تھا جن کے سینوں میں دلوں کی جگہ پتھر بھرے ہوئے تھے۔ دفعۃً ایک قدرتی حل سامنے آ گیا۔

آنحضرت ﷺ نے چچا ابو طالب کو خبر دی کہ کیڑوں نے معاہدہ کے تمام حرف چاٹ لئے ہیں۔ صرف اللہ کا نام باقی رہ گیا ہے۔ خواجہ ابو طالب نے یہ الہامی خبر سنی تو قریش کے سرداروں کے پاس پہنچے کہ آج ہمارا تمہارا معاملہ طے ہے۔ محمد نے یہ خبر دی ہے اگر یہ خبر جھوٹی ہے تو میں تمہارے ساتھ ہوں اور اگر سچی ہے تو جب معاہدہ ہی نہیں رہا تو اس کی پابندی کیسی۔

سرداران قریش نے یہ فیصلہ منظور کیا۔ ان کو یقین تھا کہ جیت ہماری ہو گی۔ مگر جب خزانہ کھول کر دستاویز نکالی گئی تو دیکھا "الصادق الامین" کی خبر حرف بحرف صحیح ہے۔ سنگدلوں کے پیشواؤں نے پھر بھی یہ کہہ کر ٹالنا چاہا کہ یہ محمد کا جادو ہے (ﷺ)۔ مگر اب وہ اپنے اصرار میں کامیاب نہ ہو سکے اور مجبوراً تسلیم کرنا پڑا کہ معاہدہ ختم ہو گیا۔ اس قدرتی کرشمہ کے بعد ایسی فضا ہو گئی کہ بنو ہاشم شعب سے نکل کر مکہ میں آ گئے۔ ❹

ایسے سخت امتحان میں روحانی ترقی کہاں تک ہو سکتی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ چنانچہ اسی زمانہ میں آنحضرت ﷺ کو معراج کا شرف عظیم حاصل ہوا۔ معراج میں پنج وقتہ نمازیں فرض ہوئیں۔ نماز کے آخر میں التحیات پڑھی جاتی ہے جس میں نہ صرف آنحضرت ﷺ اور ان بزرگوں پر جو اس امتحان میں کامیاب ہوئے تھے بلکہ ان کے طفیل میں تمام عباد صالحین پر سلام بھیجا جاتا۔ السلام علینا وعلیٰ عباد اللہ الصالحین

پناہ کی دیواریں منہدم

قریش کا مقاطعہ جو بعثت مبارکہ کے ساتویں سال شروع ہوا تھا تین سال بعد (سہ ۱۰ بعثت مبارکہ میں) ختم ہوا۔ چند ماہ بعد رمضان کا مہینہ آیا۔ اس مہینہ میں چند روز کے فرق سے خواجہ ابو طالب اور سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات ہو گئی۔ سیدہ خدیجہ وہ خاتون تھیں جو سب سے پہلے ایمان لائیں اور ابو طالب وہ شیخ قبیلہ تھے جو آخر تک ایمان نہیں لائے اور یہ اعلان کرتے ہوئے مرے کہ میں نے اپنے باپ دادا کا مذہب نہیں چھوڑا۔ مگر آنحضرت ﷺ کے دونوں جاں نثار تھے۔

پناہ کی یہ دونوں دیواریں منہدم ہو گئیں، تو اب دشمنوں کا راستہ صاف تھا۔ عقبہ بن ابی معیط اور

---

❸ موسیٰ بن عقبہ بحوالہ زہری۔ البدایہ والنہایہ ص ۸۴ ج ۳

❹ البدایہ والنہایہ ص ۹۶ ج ۳

ابولہب جو بدترین موذی دشمن تھے اور دونوں پڑوسی تھے۔[1] ان کا طریقہ یہ تھا کہ راستہ میں کانٹے بچھوا دیتے۔ دروازہ میں غلاظت کا بھرا ہوا ٹوکرا ڈالوا دیتے تھے۔ ان کے چھوٹے ان سے بھی آگے تھے۔ وہ کاشانہ نبوی میں گھس کر برتنوں کو خراب کرتے۔ پکتی ہوئی ہنڈیا کو اوندھی کر دیتے یا اس میں پلیدی ڈال دیتے تھے۔[2]

خدا جانے کتنی مرتبہ ایسا ہوا کہ آنحضرت ﷺ باہر سے تشریف لائے۔ سر مبارک اور کپڑے گردوغبار اور پلیدی سے آلودہ۔ صاحبزادیاں یہ حالت دیکھ کر دلگیر ہو رہی ہیں، کپڑے دھو رہی ہیں، سر مبارک صاف کر رہی ہیں۔ زبان سے بددعا دیتی ہیں تو ارشاد ہوتا ہے: لاتبکی یابنیة فان الله مانع اباك[3] (بیٹی دلگیر نہ ہو اللہ تمہارے باپ کا محافظ ہے)

پناہ کی تلاش:

نبی کا بھروسہ خدا پر ہوتا ہے۔ اور شروع میں جب یہ حکم نازل ہوا تھا کہ "اپنے قریبی رشتہ داروں کو دعوت اسلام دو"[4] تو ساتھ ہی حضرت حق جل مجدہ نے یہ ہدایت بھی فرمائی تھی۔

"بھروسہ کر خدا قادر ورحیم پر جو تم کو دیکھتا رہتا ہے جب تم کھڑے ہوتے ہو اور نمازیوں کے ساتھ تمہاری نشست وبرخاست کو وہ دیکھتا رہتا ہے"۔[5]

مگر چونکہ نبی کی زندگی کا ہر ورق امت کے لئے سبق ہوتا ہے اس لئے وہ اللہ تعالیٰ پر مکمل اور کامل بھروسہ کے باوجود ظاہری ذرائع اور اسباب سے دامن نہیں جھٹکتا۔ کیونکہ اگر سلسلہ اسباب کو چھوڑ دیا جائے تو اس عالم اسباب کا نظام ہی درہم برہم ہو جائے۔ بہرحال جب خواجہ ابو طالب کی وفات کے بعد قریش کو موقع مل گیا کہ جو کچھ وہ اب تک نہیں کر سکتے تھے اس کو کر گزریں تو آپکو بھی ایسے ذریعہ کی تلاش ہوئی جو قانون عرب کے بموجب آپ کے لئے پناہ بن سکے۔

مگر مٹھی بھر مسلمانوں یا آل ہاشم کے علاوہ مکہ کا بچہ بچہ دشمن تھا اور کوئی ہمدرد بھی تھا تو کس کی ہمت تھی کہ قریش کے مقابلہ میں ڈھال بن سکے۔ لہذا آپ نے مکہ سے باہر نظر دوڑائی۔

طائف کا سفر

---

[1] ابن سعد ص ۱۳۴ ج ۱،
[2] البدایہ والنہایہ ص ۱۲۲ ج ۲
[3] ایضاً
[4] سورہ شعراء آیت ۲۱۴
[5] سورہ شعراء، آیت ۲۱۷ و ۲۱۹

طائف:

مکہ سے تقریباً چالیس میل کے فاصلہ پر ایک سرسبز پہاڑ ہے۔ نہایت زرخیز۔ وہاں بڑے بڑے باغات اب بھی ہیں اور اس وقت بھی تھے۔ مکہ کے رئیسوں کی وہاں کوٹھیاں تھیں۔ قبیلہ ثقیف کا وہاں تسلط تھا۔ وہ عرب کا طاقتور قبیلہ مانا جاتا تھا۔ قریش بھی اس کا لوہا مانتے تھے۔ اس قبیلہ سے ان کی رشتہ داریاں بھی تھیں۔

روساءِ طائف اور ان کے اجواب:

تین بھائی عبدیالیل، مسعود، اور حبیب یہاں کے رئیس اعظم اور قبیلہ ثقیف کے سردار تھے۔ آنحضرت ﷺ کی نظر ان پر پڑی کہ اگر وہ پناہ میں لے لیں تو آپ کو فریضہ تبلیغ کی ادائیگی میں آسانی ہو۔ چنانچہ آپ رمضان گزرنے کے بعد ماہ شوال میں طائف تشریف لے گئے [1]۔ دس روز وہاں قیام فرمایا۔ [2] عوام وخواص اور ہر ایک کے سامنے دعوت اسلام پیش کی۔ روساء اور معززین کے مکانوں پر پہنچ کر گفتگو کی۔ [3] ان تینوں بھائیوں سے بھی ملاقات کی۔ اپنا مقصد واضح کیا۔ مگر کسی ایک نے بھی انسانیت سے جواب نہیں دیا۔

ایک نے کہا اگر خدا نے تمہیں رسول بنا کر بھیجا ہے تو وہ خانہ کعبہ کے کپڑے کھسوٹ رہا ہے (اس کی عزت پامال کر رہا ہے)۔

دوسرے نے کہا۔ اللہ کو آپ کے سوا کوئی اور نہیں ملا تھا جس کو رسول بنا کر بھیجتا۔

تیسرے نے کہا: واللہ میں تم سے بات نہیں کروں گا۔ کیونکہ جیسا تمہارا دعویٰ ہے اگر واقعی تم خدا کے رسول ہو تو رسول کی شان یہ نہیں ہے کہ اس سے بحث کی جائے اور اگر تم خدا پر جھوٹ باندھ رہے ہو تو میری شان یہ نہیں ہے کہ میں جھوٹے سے بات کروں۔ [4]

ان لوگوں کے بھونڈے جواب سن کر آپ نے فرمایا کہ اتنی مہربانی کرو کہ میرے آنے کی خبر کسی کو نہ دو۔ آپ کو خیال ہوا کہ مکہ والوں کو میرے آنے اور ان کے جوابوں کی خبر ہو گی تو وہ اپنی حرکتوں میں اور دلیر ہو جائیں گے۔ مگر ان بدنصیبوں نے اس فرمائش کی تعمیل اس طرح کی کہ طائف کے آوارہ گردوں کو اشارہ کر دیا۔ وہ آپ کے پیچھے پڑ گئے اور گستاخیاں کرنے لگے۔ اور جب کسی طرح ان سے جان چھڑا کر آگے بڑھے تو طائف کے لوگوں نے جو دونوں طرف صف بنائے کھڑے تھے ذات اقدس پر دونوں

---

[1] یہ سفر غالباً پاپیادہ ہوا۔ کسی سواری کا کوئی تذکرہ روایتوں میں نہیں ملتا۔ محمد میاں

[2] ابن سعد ص ۱۴۲ ج ۱

[3] ایضاً

[4] البدایہ والنہایہ ص ۱۳۵ ج ۳

طرف سے پتھر برسانے شروع کر دیئے۔سنگ باری سے پنڈلیاں مجروح ہو گئیں۔ گھٹنے چور ہو گئے، بدن مبارک لہولہان ہو گیا۔ایک جاں نثار حضرت زید بن حارثہ ساتھ تھے۔ وہ کبھی آگے کبھی پیچھے بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر تنہا کیا کر سکتے تھے۔ پتھروں سے ان کا سر بھی پھٹ گیا۔ [1] بالآخر کسی طرح آبادی سے باہر نکلے تو بیہوش ہو کر گر پڑے۔ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے اٹھایا۔ قریب ہی کچھ پانی تھا۔ وہاں لے گئے تاکہ خون کے دھبے دھوویں۔ نعل مبارک اتارنے چاہے تو خون سے اس طرح جم گئے تھے کہ اتارنا مشکل پڑا۔ طبیعت سنبھلی تو قریب کے ایک باغ میں تشریف لے گئے۔ایک درخت کے سایہ میں تشریف فرما ہوئے اور اپنے معبود کی بارگاہ میں مشغول دعا ہو گئے۔ [2]

بارگاہ رب العزت میں عجز وانکسار

پتھر برسانے والوں کے حق میں خیر اندیشی اور ہمدردی

اہل طائف کی وحشیانہ حرکتوں سے مجروح و مضروب محمد رسول اللہ ﷺ انگور کی ٹہنی کے سایہ میں نڈھال بیٹھے ہیں۔ دل میں درد ہے، زخموں میں ٹیس، مگر پیشانی بارگاہ رب العزت میں جھکی ہوئی ہے اور زبان مبارک مصروف دعا ہے [3] (ترجمہ یہ ہے)

"میرے اللہ میں تجھ ہی سے اپنی بے بسی کا شکوہ کرتا ہوں۔ میں لوگوں میں ذلیل ہو رہا ہوں ۔اس کا شکوہ تجھ ہی سے کرتا ہوں۔ اے سارے مہربانوں میں سب سے زیادہ مہربان۔

ان کا رب (نگران و مددگار) تو ہی ہے جو دنیا میں کمزور سمجھے جاتے ہیں، جن کا کوئی سہارا نہیں ہوتا، جن کے پاس وسیلے اور ذریعے نہیں ہوتے اور ہاں میرا رب تو ہی ہے۔ اے میرے پروردگار تو مجھے کن کے حوالے کر رہا ہے، ان کے جو مجھ سے دور ہیں! جو مجھ سے بات بھی کرتے ہیں تو منہ بگاڑ کر، یا ان کو جو میرے دشمن ہیں۔ کیا تو نے میرے معاملہ کا مالک ان کو بنا دیا ہے؟

اے اللہ !اگر تو مجھ سے ناراض نہیں ہے، خداوندا اگر مجھ پر تیرا عتاب نہیں ہے تو مجھے کسی بات کی پرواہ نہیں ہے۔ خداوندا تیری عافیت کا دامن بہت وسیع ہے، میری سمائی تیری عافیت کی گود ہی میں ہے۔

---

[1] طبقات ابن سعد ص ۱۴۲ ج ۱

[2] البدایہ والنہایہ ص ۱۳۲ ج ۳ ،

[3] غور کیجئے کیا ایسا شخص (معاذ اللہ) کاذب یا ساحر یا شاعر ہو سکتا ہے؟

تیرے چہرہ کا وہ نور۔ جس سے اندھیریاں روشنی بن جاتی ہیں جس کے ادنیٰ جلوے سے دنیا اور آخرت کے بگڑے ہوئے کام سنور جاتے ہیں، میں اسی نور کی پناہ لیتا ہوں۔

میں پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ مجھ پر تیرا غضب پڑے یا عتاب نازل ہو۔ تجھ ہی کو منانا ہے اور اس وقت تک منانا ہے جب تک تو راضی نہ ہو۔ اے اللہ مجھ میں نہ طاقت ہے نہ زور ہے۔ جو کچھ طاقت ہے تیرا ہی صدقہ ہے۔ جو کچھ قوت ہے وہ تیری ہی عطا ہے۔ میری کوئی تدبیر کارگر نہیں کارساز تو ہی ہے بگڑی کو بنانے والا تو ہی ہے۔"

یہاں سے اٹھے دل غمگین تھا، حسرت وافسوس کے دھوئیں سے دم گھٹ رہا تھا۔ سر جھکائے ہوئے تشریف لے جا رہے تھے۔ کچھ دھیان پلٹا تو دیکھا پہاڑی سامنے ہے جس کو قرن الثعالب یا قرن المنازل کہتے ہیں۔ آپ یہاں ٹھٹکے۔ اوپر نظر اٹھی تو دیکھا ایک بادل آپ پر چھایا ہوا ہے۔ بادل پر نظر ڈالی تو دیکھا حضرت جبرائیل امین جلوہ افروز ہیں اور فرمارہے ہیں :

اللہ تعالیٰ نے سن لیا، دیکھ لیا، تم نے جو کچھ کہا جو لوگوں نے جواب دیا، جس طرح تم کو واپس کیا اور جو سلوک تمہارے ساتھ کیا وہ بھی دیکھ لیا۔ اب یہ پہاڑوں کے فرشتے (ملک الجبال) موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بھیجا ہے۔ اب حکم کیجئے یہ تعمیل کرینگے۔

پھر ملک الجبال سامنے آیا۔ سلام عرض کیا پھر کہا :

یا محمد تمہاری قوم کی تمام باتیں خدا نے سنیں، دیکھیں، اللہ تعالیٰ نے مجھے بھیجا ہے آپ جو چاہیں حکم کریں میں تعمیل کروں گا۔ آپ حکم دیں مکہ کے دونوں طرف جو پہاڑ ہیں ان کو ملا کر ان تمام گستاخ بے ادب لوگوں کو پیس ڈالوں۔

ایک آزمائش وہ تھی کہ اہل طائف ہر طرف سے پتھر برسا رہے تھے۔ دوسری آزمائش یہ ہے کہ جبرائیل امین اور ملک الجبال ان سب کو پیس ڈالنے کی فرمائش کے منتظر ہیں۔ وہ امتحان تھا صبر وضبط، تحمل اور استقلال کا۔ یہ امتحان ہے وسعت ظرف، فراخی حوصلہ اور دعویٰ رحم وکرم کا۔

جس خدا نے آپ کو اس امتحان میں ثابت قدم رکھا۔ اس نے آپ کو اس امتحان میں بھی کامیاب فرمایا۔

فرشتے کی درخواست سن کر دل مبارک بیتاب ہو گیا۔ یہ خدا کی مخلوق جو نبی کی کھیتی ہے برباد کر دی جائے؟

آپ نے فرشتوں کو جواب دیا:

ارجو ان یخرج اللہ من اصلابھم من یعبد اللہ ولا یشرك بہ شیئاً★

اگر یہ بدنصیب راہ راست پر نہ آئیں تو ان کی نسل سے میں ناامید نہیں ہوں۔ مجھے توقع ہے کہ ان کی نسل میں وہ ہوں گے جو خدا واحد کی عبادت کرینگے اور شرک سے باز رہیں گے۔ ❶

باغ کے مالک اور ان کا غلام:

یہ باغ عتبہ ❷ اور شیبہ بن ربیعہ کا تھا جو مکہ کے مشہور رئیس تھے۔ یہ دونوں بھائی باغ میں موجود تھے۔ انہیں غیرت آئی کہ شہر کے ایک شخص کے ساتھ طائف والوں نے یہ سلوک کیا۔ مگر یہ ہمت پھر بھی نہیں ہوئی کہ آنحضرت ﷺ سے آکر بات کرتے۔ انگوروں کے خوشے تھالی میں رکھ کر غلام کو دیئے کہ وہ ان مظلوم مہمانوں کے پاس لیجائے جو سایہ میں بیٹھے ہوئے ہیں۔

غلام کا نام عداس تھا، مذہباً عیسائی تھا۔ وہ آپ کے پاس انگور لے کر آیا۔ آپ نے انگوروں کی طرف ہاتھ بڑھایا تو زبان مبارک پر آیا: بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

عداس الرحمن الرحیم سن کر چونکا، کہنے لگا: یہاں کے آدمی تو الرحمن الرحیم نہیں کہتے۔ ❸

آپ نے فرمایا: تم کہاں کے ہو۔ عداس نے جواب دیا: میرا آبائی وطن "نینویٰ" تھا۔

آنحضرت ﷺ: وہی نینویٰ جو میرے بھائی یونس (علیہ السلام) کا وطن تھا۔

عداس: آپ حضرت یونس علیہ السلام کو کیسے جانتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ نے جواب دیا: میرے اور ان کے درمیان نبوت کا رشتہ ہے وہ بھی اللہ کے نبی تھے۔ میں بھی اسی خدا کا بھیجا ہوا نبی ہوں۔

عداس یہ سن کر تڑپ گیا۔ آنحضرت ﷺ کے ہاتھ پیر چومنے لگا۔ عتبہ اور شیبہ نے دور سے دیکھا تو کہنے لگے اس کو تو محمد نے بگاڑ دیا۔

جب عداس واپس پہنچا تو دونوں بھائیوں نے غلام سے پوچھا: تم یہ کیا حرکت کر رہے تھے۔

★ بخاری شریف ص۴۵۸ مسلم شریف ص۱۰۹ ج۲

❶ حضرت نوح علیہ السلام کو اس کی توقع نہیں تھی آپ نے بارگاہ رب العزت میں یہ عرض کیا تھا انك ان تذرھم یضلوا عبادك ولا یلدوا الا فاجراً کفاراً۔ (سورہ نوح۔۲۷ "اگر ان کو مہلت رہی تو یہ بندگان خدا کو گمراہ ہی کرینگے۔ اور صرف انہیں کو جنم دینگے جو بدکار اور بدترین کافر ہونگے")

❷ یہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے نانا، حضرت ابوسفیان کے خسر تھے، غزوہ بدر میں سب سے پہلے یہ دونوں بھائی اور عتبہ کا لڑکا ولید بن عتبہ ہی حضرت حمزہ، حضرت علی اور حضرت عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہم کے ہاتھ سے مارے گئے تھے۔ تفصیل سلسلہ غزوات میں ملاحظہ فرمایئے۔

❸ ملاحظہ فرمائے سورہ ۲۵ الفرقان کی آیت ۶۰ جب ان مشرکین مکہ سے کہا جاتا ہے کہ سجدہ کرو رحمن کو تو وہ (انجان بن کر کہتے ہیں) رحمن کون ؟۔

عداس: یہ نبی ہیں ان سے بہتر کوئی آدمی نہیں۔ انہوں نے مجھے دو باتیں بتائیں جو نبی ہی بتا سکتا ہے۔
دونوں رئیس: اس کی باتوں میں نہ آؤ۔ اپنے مذہب پر رہو۔ تمہارا مذہب اس کے دین سے بہت اچھا ہے۔ [1]

مطعم بن عدی کی قدردانی:

طائف میں یہ سب کچھ ہوا۔ مگر وہ سوال پھر بھی رہ گیا، جس کے لئے آپ نے یہ سفر اختیار کیا تھا۔ آپ نے مکہ پہنچنے سے پہلے یکے بعد دیگرے روساءمکہ اخنس بن شریق اور سہیل بن عمرو کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ حمایت کا وعدہ کر لیں مگر دونوں نے انکار کر دیا کہ وہ قریش کے حلیف ہیں۔ وہ قریش کے خلاف کسی کو پناہ نہیں دے سکتے۔ پھر آپ نے اس کے پاس پیغام بھیجا جس کے لئے یہ شرف مقدر تھا۔

یہ رئیس مکہ مطعم بن عدی تھا۔ اس نے حمایت کا وعدہ بھی کیا اور یہ فرمائش بھی کی کہ آپ اس کے یہاں تشریف لائیں۔

آنحضرت ﷺ مطعم کے یہاں تشریف لے گئے۔ رات ان کے یہاں گزاری۔ صبح ہوئی تو مطعم نے خود ہتھیار سجائے۔ اس کے چھ سات لڑکے تھے سب کو مسلح کیا۔ پھر آنحضرت ﷺ کو لے کر چلا۔ حرم کعبہ میں پہنچا۔ آنحضرت ﷺ سے کہا آپ طواف کریں۔ آنحضرت ﷺ نے طواف کیا۔ مطعم اور بیٹے حفاظت کرتے رہے۔ جب طواف سے فارغ ہوئے تو مطعم نے اعلان کر دیا کہ "محمد ﷺ میری پناہ میں ہیں۔"

ابوسفیان، مطعم بن عدی کے پاس آیا دریافت کیا: تم نے محمد کو اپنی پناہ میں لیا ہے یا ان کا مذہب قبول کر لیا ہے۔ مطعم نے جواب دیا میں نے مذہب نہیں بدلا صرف محمد کو پناہ دی ہے۔ ابوسفیان نے کہا: تب آپ کے اعلان کا احترام کیا جائے گا۔ [2]

---

[1] البدایہ والنہایہ ص۱۳۶ ج۳
[2] البدایہ والنہایہ ص۱۳۷ ج۳

یثرب۔ مدینۃ النبی

(۱)

مکہ معظمہ سے شمال کی جانب تقریباً دو سو میل (سوا تین سو کلو میٹر) کے فاصلہ پر ایک زرخیز علاقہ میں آبادیوں کا ایک سلسلہ ہے۔ ان میں سب سے بڑی آبادی [1] کا نام یثرب [2] ہے۔ اس کے دو طرف دو سنگلاخ ہیں ان کو لابتین [3] کہا جاتا ہے اور حرتین بھی کہلاتے ہیں۔

جانب مشرق میں تقریباً آٹھ میل تک چھوٹی چھوٹی آبادیوں کا سلسلہ چلا گیا ہے ان کو عوالی کہا جاتا ہے۔ موضع قبا اسی طرف ہے [4] دوسری جانب بھی اسی طرح کی آبادیاں ہیں۔ ان کو اسافل کہا جاتا ہے۔ [5]

یثرب کے نشیبی حصہ میں برسات میں پانی بھر جاتا ہے جس کی وجہ سے یہاں کی آب و ہوا مرطوب رہتی ہے۔ یہاں کا بخار "حمیٰ یثرب" پورے عرب میں مشہور ہے۔ یثرب نام میں آب و ہوا کی خرابی کو بھی دخل ہے۔ (کیونکہ ثرب جو یثرب کا ماخذ ہے۔ ملامت کرنے کے معنی میں آتا ہے) اس پورے علاقے میں کاشت ہوتی ہے مگر خاص پیداوار کھجور ہے۔ کھجوروں کے بڑے بڑے باغات ہیں۔ یہاں کے کھجور دور

---

[1] وکانت یثرب ام قری المدینة وھی مابین طرف قناة الیٰ طرف الجرف ومابین المال الذی یقال له البرنی الیٰ زبالة (وفاء الوفاء ص ۷ ج ۱)

[2] آنحضرت ﷺ نے یہاں قیام فرمایا تو اس کا نام مدینۃ النبی ہو گیا (ﷺ)۔ کثرت استعمال نے مدینۃ النبی کو مختصر کر کے صرف مدینہ کر دیا۔ مگر عاشقان رسول نے محبوب رب العالمین ﷺ کے شہر کے بہت سے نام رکھ ڈالے۔ طابہ، طیبہ، محبوبہ، مبارکہ، عاصمہ، مرزوقہ، قاصمہ، اکالۃ البلدان۔ غرض اس طرح نوے (۹۰) سے زیادہ نام ہو گئے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: وفاالوفاء ج ۱

[3] لابہ اور حرہ کے معنی تقریباً ایک ہی ہیں یعنی ایسا سنگلاخ جس کے پتھر اس طرح کے کالے ہوں جیسے کوئی پرانا پتھر مسلسل کالی چھٹرنے سے کالا ہو جاتا ہے۔ (مجمع البحار و قاموس) یہ کئی میل تک چلے گئے ہیں۔ ان پر نہ کاشت ہو سکتی ہے نہ ان پر آبادی ہے۔ فوج بھی ان پر نہیں گزر سکتی۔ یہ دو طرف حفاظت کی قدرتی دیواریں ہیں۔

[4] مجمع البحار و معجم البلدان

[5] معجم البلدان

دور جاتے ہیں۔

(۲)

کم و بیش ایک ہزار سال ❶ پہلے یمن سے اجڑ کر دو بھائی سرزمین حجاز میں داخل ہوئے اور یہاں آکر آباد ہو گئے۔ ان میں سے ایک کا نام "اوس" تھا دوسرے کا نام "خزرج" باپ کا نام حارثہ ماں کا نام قیلہ۔ اس لئے اوس اور خزرج کی اولاد کو بنو قیلہ بھی کہتے ہیں۔ ❷

اب (یعنی آنحضرت ﷺ کے دور مسعود میں) اوس اور خزرج دو قبیلے ہیں جن کی بہت سی شاخیں (بطن) الگ الگ نام سے مشہور ہیں (بنو نجار، بنو ساعدہ، بنو عمرو بن عوف وغیرہ) اس طرح یہ دو قبیلے بہت سے بطنوں میں بٹ گئے۔

یثرب کی آبادی تقریباً چھ ہزار ہے ❸۔ اور اتنی ہی آبادی عوالی اور اسافل کی ہے۔ ان سب کا ایک "دیوتا" ہے۔ "المناۃ الطاغیہ"۔

مشلل، مکہ اور یثرب کے بیچ میں ایک مقام ہے ❹ وہاں اس کا مندر ہے۔ یہ سب المناۃ الطاغیہ کے بھگت ہیں ❺ ۔ مگر اصل تیرتھ کعبہ ہے۔ وہاں ہر سال حج کو جاتے ہیں اور ان بتوں کی بھی پوجا کرتے ہیں۔ جو قریش نے کعبہ میں رکھ رکھے ہیں۔ قریش ان کے مہنت ہیں اور یہ سب ان کے ہم مذہب اور ان کے تابع ہیں۔ ان سب کی نسل بھی ایک ہی ہے کیونکہ یہ بھی حضرت اسماعیل اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا مورث اعلیٰ ❻ مانتے ہیں اور اس بنا پر رشتہ داریاں بھی ہیں۔ یہ سب کاشتکار اور زمیندار ہیں۔ عموماً ناخواندہ، جاہل، کسی وقت یہ اس پورے علاقہ کے فرماں روا تھے۔ اس زمانہ کے قلعوں کے اونچے اونچے آثار (کھنڈر) اس وقت بھی موجود ہیں ان کو "اطام یثرب" ❼ کہا جاتا ہے۔

---

❶ سیل عرم سے تباہ ہو کر یا بقول ابن ہشام سیل عرم سے کچھ پہلے اس سیل کے متعلق پیش گوئی سن کر۔ سیرۃ ابن ہشام ص ۷ ج ۱

❷ معجم البلدان و فتح الباری وغیرہ

❸ ہجرت کے چوتھے سال غزوہ احزاب میں تین ہزار مسلمانوں نے شرکت کی جبکہ ان میں کئی سو مہاجرین بھی شامل تھے۔ اس سے یہاں کی آبادی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

❹ قدید کے قریب، والقدید اسم موضع قریب بمکہ معجم البلدان

❺ بخاری شریف ص ۲۲۲ و ص ۲۴۱ وغیرہ

❻ احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ بخاری شریف ص ۴۹۷ باب نسبۃ الیمن الی اسماعیل علیہ السلام اور قریش سے ان کی رشتہ داری تھی۔ اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ یہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں اگرچہ ماہرین انساب کا خیال یہ بھی ہے کہ قحطان جو اہل یمن کا مورث اعلیٰ ہے وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے نہیں ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو اوس اور خزرج بنو اسماعیل یعنی عرب مستعربہ نہیں تھے بلکہ عرب عاربہ تھے۔

❼ مورخین نے بیان کیا کہ یہ قلعے زیادہ تر یہود نے بنائے تھے جب وہ تنہا اس علاقہ میں صاحب اقتدار تھے۔ اوس اور خزرج یہودیوں کے دور اقتدار میں یہاں آئے۔ پہلے یہ صرف دو بھائی تھے پھر ان کی اولاد نے ترقی کی۔ یہود کو حسد ہوا۔ انہوں نے ان کو ختم کر دینا چاہا مگر نتیجہ الٹا نکلا۔ مقابلہ ہوا تو یہود کا اقتدار ختم ہو گیا اور اوس و خزرج کے قبائل اس علاقہ کے حکمراں بن

محمد رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو اس کا نام مدینۃ النبی رکھ دیا گیا۔ پھر کثرت استعمال کے باعث صرف مدینہ (ادام اللہ شرفھا) کہا جانے لگا۔

(۳)

اس علاقہ میں دوسری نسل ❶ بنو اسرائیل ❷ کی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مانتے ہیں۔ اور یہودی

گئے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو وفاء الوفاء ص ۱۲۵ تا ص ۱۳۴ ج ا و معجم البلدان (کچھ تفصیل بعد کے حاشیہ میں ملاحظہ فرمائیے۔)

❶ یہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بھائی حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ حضرت اسحاق علیہ السلام کے فرزند رشید حضرت یعقوب علیہ السلام تھے ان کو اسرائیل بھی کہا جاتا تھا۔ ان کی اولاد کو بنو اسرائیل کہتے ہیں۔ حضرت اسحاق علیہ السلام شام میں رہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو مصر میں اقتدار حاصل ہوا تھا تو حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کے لڑکے مصر چلے گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے تک ان کی تعداد کئی لاکھ ہو گئی تھی لیکن اب اقتدار کے بجائے طوق غلامی ان کی گردن میں تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کو لے کر مصر نکلے۔ اول یہ پوری قوم تیہ میں رہی۔ پھر ان کا مرکز شام ہو گیا۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو عہد زریں اور مقدمہ سیرۃ مبارکہ۔

❷ مدینہ میں بنو اسرائیل کی آمد اور ان کا اقتدار: ایک روایت یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب اللہ تعالیٰ نے فرعون کے مقابلہ میں کامیابی بخشی اور تیہ میں جا کر مقیم ہوئے تو انہوں نے دوسرے علاقوں میں مجاہدین بھیجنے شروع کئے جو بزور شمشیر اپنے دین کی اشاعت کرتے تھے اور جو ان کے مذہب میں داخل نہ ہوتا اس کو قتل کر دیتے تھے۔ ان مجاہدین کی ایک فوج یثرب بھیجی۔ ایک روایت یہ ہے کہ اہل روم کے حملہ کے وقت کچھ لوگ شام سے یہاں چلے آئے۔ ایک روایت یہ ہے کہ بخت نصر نے جب یروشلم کو تباہ کیا تب یہ لوگ یثرب آئے۔ بہر حال روایتیں اگرچہ متعدد ہیں مگر علماء تاریخ نے ان کو متضاد قرار نہیں دیا کیونکہ ان سب روایتوں کا حاصل یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے جانشین کے زمانہ سے ان کی آمد شروع ہوئی اس کے بعد مختلف اوقات میں آمد ہوتی رہی۔ ان سیاسی محرکات اور اسباب کے علاوہ ایک مذہبی محرک بھی بیان کیا گیا ہے کہ کچھ باخدا علماء یہود کو جب توریت کے اشارات سے معلوم ہوا کہ نبی آخر الزماں کا ظہور مدینہ میں ہو گا تو وہ یثرب منتقل ہو گئے کہ اگر ان کو نبی آخر الزماں کی زیارت نہ ہو سکے تو کم از کم ان کی اولاد اس سعادت و شرف سے مشرف ہو سکے گی۔ آنحضرت ﷺ کے ظہور سے پہلے بنو قریظہ یہی کہا کرتے تھے کہ ان کے بزرگ انہیں پیشن گوئیوں کی بنا پر یہاں آ کر قیام پذیر ہوئے تھے۔

عروج: بنو اسرائیل (یہود) نے یہاں کافی ترقی کی۔ اس پورے علاقہ پر وہ چھا گئے۔ حکومت بھی تھی اور دولت بھی اور نسلیں بڑھیں تو بیس اکیس قبیلے ان کے ہو گئے اور شام تک انہیں کی بستیوں کی کثرت ہو گئی۔ وادی قری، تیاء خیبر ان کے اہم اور خاص مرکز تھے۔ اوس اور خزرج یہاں آباد ہوئے تو ان سے معاہدہ کر کے اور ان کے حلیف بن کر آباد ہوئے۔

زوال: یہودیوں میں ایک راجہ (ملک) ہوا جس کا نام فطیون تھا یہ نہایت عیاش اور بدکار تھا۔ اس نے یہ حکم دیا کہ ہر ایک دلہن اس کے عشرت کدہ میں خراج عیش دے۔ یہود نے اس کو گوارا کر لیا مگر جب اوس اور خزرج کی نوبت آئی تو انہوں نے سرتابی کی۔ اس زمانہ میں قبیلہ خزرج کا ایک سردار مالک بن عجلان تھا اس کی بہن کی شادی ہوئی تو وہ عین شادی کے دن گھر سے نکلی اور اپنے بھائی مالک بن عجلان کے سامنے سے بے پردہ گزری۔ مالک کو غیرت آئی وہ اٹھ کر گھر میں آیا اور بہن کو سخت ملامت کی۔ بہن نے کہا ہاں لیکن کل کو جو کچھ ہو گا وہ اس سے بھی سخت ہو گا۔ دوسرے دن جب حسب دستور مالک کی بہن دلہن بن کر فطیون کی خلوت گاہ میں گئی تو مالک بھی زنانہ کپڑے پہن کر سہیلیوں کے ساتھ اندر چلا گیا اور فطیون کو قتل کر کے شام بھاگ گیا۔ یہاں غسانیوں کی حکومت تھی اور ابو جبلہ حکمراں تھا اس کو یہ تکلیف دہ حالات معلوم ہوئے تو وہ لشکر لیکر آیا

کہلاتے ہیں۔ یثرب (مدینہ) کے اطراف میں تین تین چار چار میل کے فاصلہ پر ان کے قبیلے آباد ہیں۔ ان میں سے مشہور یہ تین ہیں: بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ۔ یہ سب خوش حال ہیں۔ ان کی آبادیاں قلعہ نما ہیں۔ شاداب باغات میں گھری ہوئیں ہر طرح سے محفوظ۔ باغات کے علاوہ ان کے تجارتی سلسلے بھی ہیں اور ان کا سودی کاروبار بھی بہت پھیلا ہوا ہے۔ اپنی اپنی حیثیت میں یہ سب قبیلے آزاد ہیں۔ ان کی مجموعی آبادی بھی یثرب کی آبادی کے لگ بھگ ہے۔ ان کے یہاں تعلیم کا انتظام بھی ہے۔ ایک تعلیمی ادارہ "بیت المدارس" کے نام سے قائم ہے جس میں توریت کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یثرب کے عام باشندے ان کی تعلیمی برتری سے متاثر ہیں۔ یہاں تک کہ بعض خوش عقیدہ اپنے ہونہار بچوں کو یہود کے حوالے کر دیتے ہیں کہ علمی شائستگی حاصل کر سکیں۔

اوس اور خزرج کبھی بھائی برادر کی طرح رہے ہونگے، مگر اب وہ جنگجو حریف ہیں۔ اور تقریباً سوا سو برس سے برابر لڑائی کا سلسلہ جاری ہے۔ حال ہی میں نہایت خونریز لڑائی ہوئی جو "حرب بعاث" کے نام سے مشہور ہے۔ اس جنگ میں دونوں قبیلوں کے بڑے بڑے سردار کام آچکے ہیں۔

یہودی ان لڑائیوں میں شریک نہیں ہوتے البتہ ایک کو دوسرے کے خلاف بھڑکاتے رہتے ہیں۔ پھر ان کی بدحالی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ سودی قرض دیکر ان کی بہت سی جائیدادیں قبضہ میں لے چکے ہیں
۔

یثرب کے دو لیڈر:

اوس اور خزرج کے بڑے لوگوں میں اب صرف دو باقی رہ گئے تھے۔ عبداللہ بن اُبَیّ بن سلول۔ قبیلہ خزرج کا رئیس اور لیڈر اور ابو عامر بن صیفی بن نعمان۔ قبیلہ اوس کا رئیس و امیر۔ [1]

یثرب میں آنے والے نبی کا چرچا

توریت کی پیشن گوئیوں کے موجب یہودی ایک آنے والے نبی کے منتظر تھے وہ اس کی علامتیں بھی بیان کیا کرتے تھے۔ ان یہودیوں میں کچھ خاندان وہ بھی تھے جن کے مورث اور اجداد اسی امید پر

اور اوس اور خزرج کو انعامات دیئے اور ایک عام دعوت کر کے روساء یہود کو مدعو کیا اور ان کو قتل کرا دیا۔ اب یہود کا زور ٹوٹ گیا۔ اوس اور خزرج نے قوت حاصل کر لی۔ مگر پھر ان دونوں قبیلوں میں جنگ شروع ہوئی جو سو سال سے زیادہ رہی۔ یہود نے ان کو لڑانے میں بھی اپنی تمام چالبازیاں ختم کر دیں اور ان کو سودی رقم دیکر ننگا بھی کر دیا۔ یہی حالت تھی جب آنحضرت ﷺ کا ظہور ہوا (معجم البلدان ابن ہشام)

[1] وفاء الوفاء ص ۱۵۵ ج ۱

یہاں آکر آباد ہوئے تھے کہ نبی آخر الزماں کا ظہور اس سرزمین میں ہو گا۔ مگر وہ تعصب، گروہ پرستی اور صرف اپنے گروہ کو سب سے اونچا اور خدا کا محبوب سمجھنے کا غلط عقیدہ جو ان کے ذہنوں میں رچا ہوا تھا اور ایک جذبہ بن گیا تھا اس نے اس خوش آئند تصور کو اور اس تمنا کو یقین کا درجہ دے دیا تھا کہ آنے والا نبی انہیں کے گروہ میں سے ہو گا۔ [1] اس سلسلہ میں بہت سی روایتیں بھی گھڑلی تھیں۔ [2] وہ سمجھتے تھے کہ جیسے ہی وہ نبی ظاہر ہو گا ان کا اقبال نقطہ عروج پر پہنچ جائے گا۔ چنانچہ مشرکین یعنی اوس اور خزرج سے کسی بات پر بحث ہوتی یا کسی موقع پر مشرکین کے سامنے زچ ہونا پڑتا تو یہی روایتیں اور پیشن گوئیاں بیان کرکے ان کو مرعوب کیا کرتے تھے کہ "مستقبل کی سربلندی ہمارے لئے ہے"۔ مشرکین اگرچہ ان کے ہم عقیدہ نہیں تھے مگر چونکہ جاہل تھے وہ متاثر ہو جاتے تھے۔ اس طرح ان کے کان آنے والے نبی کے تذکرہ سے ناآشنا نہیں رہے تھے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یہی آشنائی ان کے لئے مشعل راہ بنی۔ [3]

یثرب میں آنحضرت ﷺ کا ذکر خیر

اوس اور خزرج کی طویل جنگ نے ایک فریق کو اتنا دبایا کہ اس نے کسی بڑے طاقتور قبیلہ کی مدد حاصل کرنی ضروری سمجھی۔ چنانچہ اس فریق کا ایک وفد زمانہ حج میں مکہ پہنچا اور اس نے قریش کو اپنا مددگار اور حلیف بنانا چاہا۔ یہ وفد اس مقصد میں تو کامیاب نہیں ہوا مگر یہ سعادت اس کو ضرور حاصل ہو گئی کہ اس کے ایک رکن (ایاس بن معاذ) داعی حق کی صداء حق کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہ باقاعدہ مسلمان تو نہیں ہوئے مگر دعوت حق کے اثر سے اپنا دامن جھٹک بھی نہیں سکے۔ یہ وفد واپس یثرب پہنچا تو روئیداد سفر میں لامحالہ اس دعوت کا تذکرہ بھی شامل تھا۔ ایاس اگرچہ آنحضرت ﷺ کی ہجرت سے پہلے انتقال کر گئے، مگر ان کے خاندان والوں کا یقین یہ تھا کہ ان کی وفات اسلام پر ہوئی ہے کیونکہ وفات کے وقت ان کی زبان پر لاالہ الااللہ اور سبحان اللہ الحمد للہ اور اللہ اکبر کے کلمات جاری تھے۔ [4]

---

[1] ان کی یہ دلیل ایک حد تک معقول تھی کہ صدہا سال سے نبوت انہیں کے گروہ میں چلی آرہی ہے یہاں تک کہ جتنے انبیاء علیہم السلام کے نام ان کو معلوم تھے وہ سب اسرائیلی تھے۔ قرآن حکیم نے پوری اہمیت کے ساتھ یہود کے قومی جرائم شمار کرا کر اس دلیل کی تردید کی ہے۔ حاصل یہ ہے کہ یہ درست ہے کہ بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے نوع انسان کے تمام طبقات پر فضیلت دی تھی مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے ان قومی جرائم نے ان کو اس فضیلت سے محروم کر دیا۔ سورہ نساء آیات ۴۴ و ۴۶ و ۵۱ تا ۵۴ و آیات ۱۵۳ تا ۱۶۱ وغیرہ

[2] دیکھو آیت ۱۵۳ سورہ آل عمران

[3] دیکھو آیت ۸۸ سورہ بقرہ

[4] سیرۃ ابن ہشام ص ۲۵۸ ج ۱

یثرب میں اسلام

اسعد بن زرارہ اور ذکوان بن عبدالقیس مدینہ کے عمائدین میں سے تھے۔ یہ مکہ کے رئیس اعظم عتبہ بن ربیعہ کے پاس مدد حاصل کرنے کیلئے پہنچے۔ عتبہ نے کہا ہم خود عجیب پریشانی میں مبتلا ہیں۔ ہمارے یہاں ایک شخص پیدا ہو گیا ہے، توحید کا قائل ہے، ہمارے دیوتاؤں کی تردید کرتا ہے۔ نمازیں بہت پڑھتا ہے اور کہتا ہے کہ میں خدا کا رسول ہوں۔ اس نے ہمارے سارے نظام کو درہم برہم کر رکھا ہے۔ ہمیں خود اپنے سے فرصت نہیں، ہم کسی کی مدد کیا کر سکتے ہیں۔

عتبہ کے اس شکوہ نے نفرت کے بجائے ان دونوں کے دلوں میں محمد ﷺ سے ملاقات کی امنگ پیدا کر دی۔ یہ عتبہ سے رخصت ہوئے۔ ناکہ بندی کی وجہ سے پہنچنا مشکل تھا مگر ان دونوں نے کوشش کی اور کسی طرح آنحضرت ﷺ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ خدمت میں حاضر ہوئے، گفتگو کی، کلام پاک کی آیتیں سنیں، دعوت اسلام کو سمجھا، دماغ صاف تھا، دل صاف تھا، طبیعت حق کی طرف مائل تھی۔ اللہ کے کلام نے اثر کیا اور حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ مدینہ واپس پہنچے تو حضرت اسعد رضی اللہ عنہ نے اپنے دوست ابوالہیثم بن تیہان سے اپنے مسلمان ہونے کا ماجرا سنایا۔ وہ بھی مسلمان ہو گئے۔ ان دونوں کے متعلق یہ بھی روایت ہے کہ یہ پہلے ہی سے شرک سے بیزار اور توحید کی طرف مائل تھے۔ [2]

دو بزرگ اور تھے: رافع بن مالک ازرقی اور معاذ بن عفراء، یہ حج یا عمرہ کے لئے مکہ معظمہ آئے۔ اور کسی طرح آنحضرت ﷺ سے تبادلہ خیالات کا موقع مل گیا۔ یہ دونوں بھی اسلام سے مشرف ہو گئے۔ [3]

یثرب کی پہلی جماعت جس نے دعوت اسلام قبول کی

اہل طائف نے جس سعادت کی قدر نہیں کی، اہل یثرب کی خوش نصیبی نے اس کا استقبال کیا۔ طائف سے واپس ہو کر مطعم بن عدی کی پناہ میں آنحضرت ﷺ مکہ معظمہ پہنچے تو حج کہ مہینے شروع ہو چکے تھے۔ مراسم حج ادا کرنے کے دن آئے تو آنحضرت ﷺ نے اپنے دستور کے بموجب قبائل کے کیمپوں اور زائرین کی مجلسوں میں پہنچ کر تبلیغ شروع کی۔ جس سرگرمی سے آپ تبلیغ کرتے تو قریش کا تعاقب اتنا ہی شدید ہوتا تھا۔ خصوصاً ابولہب کی سرگرمی نے دیوانگی کی صورت اختیار کر لی تھی۔ لیکن قدرت کی کار فرمائیوں کا وہ مقابلہ نہ کر سکا۔ اسی گرما گرمی میں کچھ پاک نفوس ایسے بھی نکل آئے جنہوں نے متاع جان اس دعوت کے نذر کر دی۔

یہ یثرب کے چھ یا آٹھ آدمی تھے جو حج کے لئے آئے تھے۔ اور اب مراسم حج کے بموجب ایک جگہ

---

[2] طبقات ابن سعد جلد اول ص ۱۴۶

[3] طبقات ابن سعد جلد اول ص ۱۴۶

سروں کے بال منڈوار ہے تھے۔ آنحضرت ﷺ وہاں پہنچے، کچھ موقع مناسب معلوم ہوا آپ نے اپنی دعوت پیش کرنی شروع کر دی۔ کلام اللہ شریف کی آیتیں تلاوت کیں، سننے والوں کی پاک روحیں متوجہ ہوئیں، ان کے آپس میں کچھ باتیں اشاروں میں ہوئیں:

"یہودی جس نبی کی خبر دیا کرتے تھے معلوم ہوتا ہے یہ وہی نبی ہیں۔ بیشک یہ کلام سچا اور اور یہ دعوت برحق ہے۔ اب ہمیں ہمت کر کے پہل کر دینی چاہئے کہیں ایسا نہ ہو یہودی سبقت کر جائیں اور اقبال مندی کا جو تاج ہمارے سروں کو بوسہ دینے کو تیار ہے، وہ یہودیوں کو میسر آجائے"

اس طرح کی کچھ باتیں ہوئیں۔ پھر سب نے اپنی گردنیں قبول دعوت کے لئے خم کر دیں۔ ان حضرات نے کلمہ شہادت پڑھ لیا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا: میری زندگی کا مقصد اسی دعوت کی اشاعت ہے۔ مکہ کی زمین میرے لئے تنگ ہو گئی ہے۔ کیا یہ ممکن ہے میں آپ کے ساتھ یثرب چلوں اور یثرب کو دعوت و تبلیغ کا مرکز بنالوں؟ ان حضرات نے عرض کیا: ہم بسر و چشم تیار ہیں، مگر فی الحال آپ کا تشریف لے چلنا مصلحت کے خلاف ہے۔ ہمارے یہاں ابھی ایک سال پہلے بعاث کا نہایت سخت معرکہ ہو چکا ہے، جس کے زخم اب تک ہرے ہیں۔ جذبات برانگیختہ ہیں اور دماغوں میں نفرت بھری ہوئی ہے۔ اس حالت میں آپ کی دعوت صدا بصحرا ہو گی۔ کیونکہ اس وقت دونوں کا جمع ہونا ناممکن ہے۔ آپ کسی بھی فریق سے رابطہ پیدا کریں گے تو دوسرا فریق دشمن بن جائے گا۔ آپ ہمیں موقع دیں۔ ہم یثرب پہنچ کر جذبات کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کریں۔ خدا کرے کوئی اصلاح کی صورت پیدا ہو اور فضا ہموار ہو جائے تو آپ کا تشریف لے چلنا مفید ہو گا۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ آئندہ سال اسی مقام پر حاضر ہونگے اور امید ہے کہ اس وقت تک ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ آپ کو یثرب آنے کی دعوت دے سکیں۔

بات معقول اور ہمدردانہ تھی، آنحضرت ﷺ نے منظور فرمالی۔ ان کے اسماء گرامی یہ ہیں [1]:

(۱) رافع بن مالک (۲) عبادہ بن الصامت (۳) ابو عبد الرحمن یزید بن ثعلبہ (۴) عویم بن ساعدہ (۵) عوف بن حارث بن عفراء (۶) قطبہ بن عامر بن حدیدہ (۷) عتبہ بن عامر بن نابی (۸) جابر بن عبد اللہ بن رئاب۔ (رضی اللہ عنہم)

بیعت عقبہ اولیٰ

وعدہ پورا کرنے کی بہترین مثال ان چھ حضرات نے اپنے عمل سے پیش کی جو گزشتہ سال دائرہ

---

[1] (الف) ابن سعد نے چند روایتیں پیش کی ہیں اور ہر روایت میں کچھ نام شمار کرائے ہیں ہم نے مکرر نام حذف کر دیئے ہیں۔ ملاحظہ ہو طبقات ابن سعد ص ۱۴۵ تا ص ۱۴۷ ج ۱ (الجزء الاول من کتاب الطبقات فی السیرۃ الشریفہ النبویہ القسم الاول) (ب) ان حضرات میں سے دو بزرگوں کا تعلق اوس سے ہے: ابو عبد الرحمن، یزید بن ثعلبہ اور عویم بن ساعدہ.... (رضی اللہ عنہم) اور باقی چھ حضرات خزرجی ہیں۔ (ج) چھ یا آٹھ کی تعداد میں اگرچہ اختلاف ہے مگر اس پر اتفاق ہے کہ ان سب حضرات نے جو اس وقت بیعت ہوئے تھے راہ خدا میں قتل ہو کر درجہ شہادت حاصل کیا۔ (الاستیعاب ص ۱۷۹ تذکرہ رافع بن مالک)

اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ باہمی نفرت اور بغض وعداوت کے دہکتے ہوئے ماحول میں ان حضرات نے ایسے سلیقہ سے کام کیا کہ معرکہ بعاث کے اشتعال انگیز تذکرہ کے بجائے ہر ایک گھر میں اسلام اور پیغمبر اسلام کا چرچا ہونے لگا۔ اور جب حج کا زمانہ آیا تو بارہ افراد نے اپنے آپ کو محمد رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش کیا۔ مگر یہ پیشی نہایت راز داری کے ساتھ ہوئی۔

مکہ معظمہ سے چند میل کے فاصلہ پر منیٰ کا میدان ہے جہاں ۱۰ ذی الحجہ سے ۱۳ ذی الحجہ تک زائرین بیت اللہ کا اجتماع ہوا کرتا ہے۔ اس وسیع میدان میں وہ جگہ بھی ہے جس کو عقبہ کہتے ہیں، جو شہر مکہ سے تقریباً دو میل کے فاصلہ پر ہے [1] اسی کے قریب ایک گھاٹی میں یہ حضرات جمع ہوتے ہیں۔ چاندنی رات ہے، نور کی چادر پھیلی ہوئی ہے۔ اسی نورانی فضا میں محمد رسول اللہ ﷺ تشریف لاتے ہیں جو سراسر نور ہیں ۔ آپ خداءواحد کی پرستش کی دعوت دیتے ہیں سننے والوں کی دلوں کی گہرائیوں سے آمنّا کی صدا بلند ہوتی ہے۔ پھر ان سب سے چھ باتوں کا عہد لیا جاتا ہے:

۱۔ ہم صرف خداءِواحد کی عبادت کیا کریں گے۔ کسی کو اس کا شریک نہیں مانیں گے۔
۲۔ چوری نہیں کرینگے۔
۳۔ زنا نہیں کریں گے۔
۴۔ اولاد کو قتل نہیں کرینگے۔
۵۔ کسی پر بہتان نہیں باندھیں گے (جھوٹی تہمت نہیں لگائیں گے)۔
۶۔ آپ جس اچھی بات کا حکم فرمائیں گے ہم اس کی تعمیل کرینگے۔ (نافرمانی نہیں کرینگے) [2]

یہ معاہدہ عمل کرنے کے لئے تھا۔ عمل کرنے کے لئے معلم اور مربی کی ضرورت تھی۔ ان لوگوں نے معلم کی درخواست کی۔ آنحضرت ﷺ نے ایک باعمل معلم کو ان کے ساتھ کر دیا۔ یہ سیدنا حضرت مصعب بن عمیر ہیں۔ دولت مند گھرانے کے چشم و چراغ۔ ناز و نعم میں پلے۔ جب گھوڑے پر سوار ہو کر چلا کرتے تھے تو آگے پیچھے ہٹو بچو کہتے ہوئے غلام دوڑا کرتے تھے۔ بدن پر سیکڑوں درہم سے کم کا لباس نہیں ہوتا تھا، جو طرح طرح کے عطر سے معطر ہوتا تھا مگر جب دولت اسلام سے مالا مال ہوئے تو دولت دنیا ان کی نظر میں گرد بن گئی۔ روح نے وہ لذت پائی کہ ساز و سامان بار لگنے لگا۔ اب معلم خیر کا لباس ایک کمبل تھا۔

مدینہ پہنچ کر حضرت اسعد بن زرارہ کے یہاں ان کا قیام ہوا۔ اس وقت تک جتنا قرآن نازل ہو چکا

---

[1] معجم البلدان
[2] بخاری شریف ص ۵۵۰

تھا وہ لوگوں کو یاد کراتے، سمجھاتے، اس پر عمل کراتے۔ لوگ ان کو مقری [1] کہا کرتے تھے۔

نیا دار ہجرت:

اب تک حبش دار ہجرت تھا۔ اس بیعت کے بعد ایک دار ہجرت کا اضافہ ہو گیا۔ مکہ کو خیر باد کہنے والے اب یثرب آنے لگے۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا ارادہ ہجرت:

ماہ شوال ختم ہو رہا تھا۔ ذی قعدہ [2] شروع تھا کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی ہجرت کا ارادہ کر لیا۔ اجازت لینے کے لئے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے فرمایا: کچھ توقف کیجئے ۔امید یہ ہے کہ مجھے بھی ہجرت کی اجازت مل جائے گی۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے یہ ارشاد سنا تو تعجب ہوا [3] مکرر دریافت کیا۔ کیا آپ کو یہ توقع ہے میرے ماں باپ آپ پر قربان؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ہاں، امید تو یہی ہے۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے لئے اس سے زیادہ مسرت کی بات کیا ہو سکتی تھی کہ شرف رفاقت حاصل ہو۔ آپ نے اس وقت ارادہ ملتوی کر دیا اور اپنے آقا کے ساتھ سفر کرنے کی تیاری شروع کر دی۔ فوراً دو عمدہ سانڈنیاں خرید لیں۔ [4] اور اس خیال سے کہ نہ معلوم کس وقت حکم ہو جائے۔ ان سانڈنیوں کو چرواہے کے حوالے نہیں کیا بلکہ گھر پر کھڑا رکھا اور بازار سے چارہ خرید کر کھلاتے رہے۔ اس انتظار میں چار ماہ گزر گئے۔ اس اثناء میں بیعت عقبہ ثانیہ بھی ہوئی جس کا ذکر آگے آئے گا۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے دو سانڈنیاں ہی نہیں خریدیں بلکہ سفر کا نقشہ ذہن میں جما کر ضرورت کی تمام چیزیں فراہم کر لیں۔ حتیٰ کہ سفر میں ایک تحریر لکھنے کی ضرورت پیش آئی تو تحریر کا تمام سامان ساتھ تھا۔ ٹھنڈے پانی کا اور نہ صرف پانی بلکہ آنحضرت ﷺ کو پانی پلانے کے برتن کا بھی یہ انتظام تھا کہ اس کے منہ پر کپڑا باندھا رہتا تھا۔ جیسا کہ سراقہ جعشم کے واقعہ میں آئندہ معلوم ہو گا۔ (انشاء اللہ)

بیعت عقبہ دوم

---

[1] ابن سعد و استیعاب وغیرہ

[2] بخاری شریف وغیرہ کی روایتوں میں یہ ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ چار ماہ تک ان سانڈنیوں کو گھر پر رکھ کر چارہ کھلاتے رہے جن کو آپ نے سفر ہجرت کے لئے خریدا تھا۔ سفر ہجرت ربیع الاول کے آغاز میں ہوا تو ان سانڈنیوں کو شوال کے آخر یا ذیعقدہ کے شروع میں خریدا ہو گا۔

[3] ابھی تک بیعت عقبہ ثانیہ نہیں ہوئی تھی جس میں آنحضرت ﷺ کی ہجرت کی گفتگو ہوئی اور حضرات انصار سے عہد لیا گیا۔

[4] بخاری شریف ص ۵۵۳

پچھلے سال چھ مسلمانوں کی کوشش سے یثرب کے گھر گھر میں اسلام کا چرچا ہونے لگا تھا۔ اس سال حضرت مصعب بن عمیر مقری رضی اللہ عنہ کی رہنمائی میں بارہ حضرات نے کوشش کی تو نہ صرف یثرب بلکہ یثرب سے باہر موضع قبا تک اسلام پہنچ گیا۔

اسلام کیا تھا؟ صرف کلمہ توحید پڑھ لینا؟ بیشک قانونی اور فقہی نقطہ نظر سے کسی کو مسلمان قرار دینے کے لئے یہی کافی ہے۔ لیکن سیدنا مصعب بن عمیر جس کا درس دے رہے تھے وہ قانونی نمائش سے بہت بلند تھا۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کا مکتب، مکتب عشق تھا۔ یہاں ایثار اور فدائیت کا درس دیا جاتا تھا۔ مشائخ طریقت کے یہاں درجہ فنا آخری منزل ہے یہ حضرت مصعب رضی اللہ عنہ کی خانقاہ کا پہلا سبق ہوتا تھا۔

قرآن حکیم نے مومن کی شان یہ بتائی ہے: وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (البقرہ۔۱۶۵) [1]
اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لا یؤمن احدکم حتیٰ اکون احب الیہ من والدہٖ وولدہٖ والناس اجمعین [2]

حضرت مصعب رضی اللہ عنہ کی دعوت کی خصوصیت یہ تھی کہ جیسے ہی زبان پر کلمہ توحید جاری ہوتا، دل کے خلوت کدہ میں عشق و محبت کی شمع روشن ہو جاتی جو نہ صرف ظلمت دور کرتی بلکہ انانیت کو بھی فنا کر دیتی تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یثرب میں تشریف لانے کی دعوت دینا صرف ایک معزز مہمان کو بلانا نہیں تھا بلکہ ایک ہیبت انگیز اور حد سے زیادہ پر خطر اقدام تھا۔ آپ کو تشریف لانے کی دعوت دینا ایک عظیم ترین انقلاب کو دعوت دینا تھا۔ یعنی ایسی حاکمیت کو تسلیم کرنا تھا جس کے مقابلہ میں ہر ایک حاکمیت ختم ہو رہی تھی۔ اوس اور خزرج کے روسا اور شیوخ خصوصاً عبد اللہ بن ابی بن سلول رئیس خزرج اور ابو عامر بن صیفی بن نعمان رئیس اوس، جو نہ صرف حاکمیت بلکہ ملوکیت اور بادشاہت کے خواب دیکھ رہے تھے، آپ کا مدینہ تشریف لے آنا ان سب کے لئے پیغام ناکامی تھا، جو ان سب کے لئے مایوس کن تھا، جو ان کی حاکمیت تسلیم کرانے کے لئے ایسے سرگرم اور پرجوش تھے کہ عبد اللہ بن ابی بن سلول کے لئے شاہانہ تاج کی تیاری کی فرمائش بھی دے چکے تھے۔ دوسری طرف آپ کی تشریف آوری قریش کی ناکامی تھی اور تشریف آوری کی دعوت دینا قریش جیسی جماعت کے مقابلہ پر سینہ سپر ہونا تھا، جس کی عظمت کی چھاپ ہر ایک عربی بولنے والے کے دل پر تھی اور جس کی ناکامی پورے عرب کی ناکامی تھی۔ اس کے علاوہ اقتصادی مسائل بھی نہایت اہم تھے۔ مثلاً محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثار جو اہل و عیال کو ساتھ لے کر آئیں گے ان کی ضروریات زندگی کس طرح فراہم ہوں گی۔

---

[1] جو ایمان لائے وہ بہت مضبوط ہوتے ہیں اللہ کی محبت میں

[2] کوئی مومن کہلانے کے لائق نہیں ہو سکتا جب تک میں اس کو باپ اولاد اور تمام انسانوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

یہ تمام مسائل تھے۔ جو ایمان لانے والے تھے وہ دانشمند تھے۔ ان تمام باتوں کو سمجھتے تھے، مگر ان کے ایمان کی حرارت اس طرح کے تمام خطرات کے لئے برق خرمن سوز تھی:

عشق چوں خام ست باشد بستہ ناموس و ننگ
پختہ مغزان جنوں را کے حیا زنجیر پا ست
با ہر کمال اندکے آشفتگی خوش ست
ہر چند عقل کل شدہ بے جنوں مباش

یہ نو مسلم تھے ان کا اسلام نیا تھا۔ مگر یہ نیا اسلام سراسر عشق تھا، جس نے محبوب کے لئے ہر ایک قربانی اور ایثار کو محبوب بنا دیا تھا:

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

حج کا زمانہ آیا۔ اوس اور خزرج کے تقریباً پانچ سو افراد حج کے لئے روانہ ہوئے۔ یہ اہل ایمان بھی اس عزم کے ساتھ روانہ ہوئے کہ محبوب رب العالمین کو دعوت دیں کہ وہ مکہ کی خشک پہاڑیوں کو خیر باد کہیں اور یثرب کے سبزہ زار کو ایمان کا کشت زار بنائیں۔ لیکن یثرب کے سربراہ جو قریش کے ہم مشرب وہم نوا تھے اس جرائت کیلئے تیار نہیں تھے جس میں قریش سے براہ راست تصادم تھا لہذا ان فداکاروں نے اپنے منصوبہ کو پوشیدہ رکھا۔ ان کی تعداد تہتر تھی۔ [1] ان میں دو عورتیں تھیں تیس نوجوان باقی ادھیڑ عمر

-

مکہ پہنچ کر بھی اس منصوبہ کو راز ہی رکھا اور رازداری کے ساتھ ہی تاریخ، وقت اور مقام طے کیا گیا

-

۱۱ ذی الحجہ [2] کی رات چاند آدھی مسافت طے کر چکا لوگ سو گئے تو طے کردہ خفیہ قرار داد کے بموجب اسلام کے یہ جاں نثار فرداً فرداً روانہ ہوئے۔ [3] اور اسی گھاٹی میں پہنچے جہاں گزشتہ سال بیعت ہوئی تھی۔ سرور کائنات محمد رسول اللہ ﷺ اور آپ کے چچا عباس رضی اللہ عنہ وہاں رونق افروز ہو چکے تھے۔
یہ بھی خواجہ ابوطالب کی طرح آنحضرت ﷺ کے سچے بہی خواہ، محافظ اور جان چھڑکنے والے

---

[1] ابن ہشام ص ۲۶۶ ج ۱ ابن اسحاق نے ان کے نام بھی شمار کرائے ہیں ص ۲۷۳ تا ص ۲۷۹ ج ۱

[2] وسط ایام التشریق لیلۃ النفر الاول اذا ھدأت الرجل (ابن سعد ص ۱۴۹ ج ۱) فتسلل تسلل القطا مستخفین (ابن ہشام ص ۲۶۶ ج ۱)

[3] سب سے پہلے رافع بن مالک زرقی رضی اللہ عنہ باریاب ہوئے۔ ابن سعد ص ۱۴۹ ج ۱

مددگار تھے اور اگرچہ عمر میں صرف دو سال بڑے تھے مگر خود کو اپنے عزیز بھتیجے کا سرپرست سمجھتے تھے [1] اور تجارتی کاروبار کے باعث باہر آنا جانا رہتا تھا تو قبائل سے واقف تھے، شیوخ قبائل سے تعلقات تھے ان کو جانتے پہچانتے تھے۔ اس تعارف کے ساتھ خوبی یہ تھی کہ بات کرنے کا بھی اچھا سلیقہ تھا۔ چنانچہ جب آنے والے آ گئے تو سلسلہ کلام آپ نے ہی شروع کیا:

آپ جس ارادہ سے آئے ہیں یقین ہے کہ اس کی ذمہ داری کا بھی آپ صاحبان نے بخوبی اندازہ کر لیا ہو گا۔ محمد کی حمایت پورے عرب کی مخالفت ہے۔ محمد اپنے خاندان کے سب سے زیادہ باعزت رکن ہیں۔ خاندان کا ہر فرد ان کی حفاظت کے لئے سربکف رہتا ہے جو ان کے ہم نوا ہو گئے ہیں وہ ہم نوائی کی وجہ سے اور جو ان کے ہم نوا نہیں ہوئے ہیں وہ خاندانی حمایت، قرابت اور خود ان کے اخلاق و کردار کی وجہ سے ان کے جاں نثار ہیں۔ محمد کی حفاظت سے ہم نہ اکتائے ہیں نہ تھکے ہیں۔ محمد نے خود ہی آپ کی دعوت منظور کی ہے اور وہ ہم سے الگ ہو کر آپ کے یہاں جانا چاہتے ہیں۔

آپ پوری طرح غور کر لیں، اپنی طاقت اور ہمت کا موازنہ کر لیں۔ پورے عرب کی متحدہ طاقت سے آپ کو مقابلہ کرنا ہو گا۔ سارا عرب ایک کمان سے آپ پر پتھر برسائے گا۔ کیا آپ میں مقابلہ کی طاقت ہے؟ آپ صاحبان کو لڑائیوں کا تجربہ ہے؟ کیا آپ لوگ نامعلوم مدت تک پامردی اور استقلال سے پورے عرب کے مقابلے میں ثابت قدم رہ سکیں گے؟ صاف بات اچھی ہوتی ہے پوری طرح سوچ لو جدا ہونے سے پہلے پختہ فیصلہ کر لو۔ بعد کی شرمندگی سے اس وقت کی صاف بات ہزار درجہ بہتر ہے۔ [2]

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی بات ختم ہوئی تو حضرت براء بن معرور [3] رضی اللہ عنہ نے مجمع کی ترجمانی کرتے ہوئے فرمایا: آپ نے جو فرمایا ہم پہلے سے ہی سمجھے ہوئے ہیں۔ ہم وفاداری، سچائی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت میں اپنی جانیں قربان کر دینے کا عزم مصمم لے کر یہاں آئے ہیں لیکن ہم چاہتے ہیں حضرت والا (جن کے لئے سر ہتھیلی پر رکھ کر ہم یہاں آئے ہیں) وہ خود فرمائیں کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔

---

[1] تعمیر کعبہ کے وقت جب پتھر ڈھو رہے تھے تو آپ نے اسی بزرگانہ شفقت کی وجہ سے بھتیجے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمائش کی تھی کہ لنگی کھول کر مونڈھے پر رکھ لیں تاکہ پتھر کی رگڑ نہ لگے۔

[2] ابن سعد ص ۱۴۹ ج ۱

[3] یہ سب سے زیادہ سن رسیدہ اور اپنی جماعت کے سردار تھے۔ سیدنا و کبیرنا (کعب بن مالک رضی اللہ عنہ) (سیرۃ ابن ہشام ص ۲۶۴ ج ۱) مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ میں تشریف آوری سے ایک ماہ پہلے وفات پا چکے تھے (فتح الباری)

لطیفہ: جب یہ حضرت (براء بن معرور رضی اللہ عنہ) یثرب سے روانہ ہوئے تو راستہ میں سوال یہ پیدا ہوا کہ نماز کس رخ پر پڑھنی چاہئے۔ شام کا رخ کر کے یا کعبہ کا رخ کر کے۔ سب کی رائے ہوئی کہ شام کی طرف۔ مگر حضرت براء رضی اللہ عنہ نے طے کیا کہ وہ کعبہ کی طرف نماز پڑھا کرینگے۔ راستہ بھر یہی رہا کہ ساتھی شام کی طرف نماز پڑھتے رہے اور یہ کعبہ کی طرف۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے استفسار کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شام کی طرف نماز پڑھنے کی ہدایت فرمائی۔ (سیرۃ ابن ہشام ۲۶۴۔۲۶۵ ج ۱)

آنحضرت ﷺ نے کلام پاک کی چند آیتیں تلاوت فرمائیں، پھر فرمایا: میں

(الف) اپنے رب (پروردگار) کے لئے یہ چاہتا ہوں کہ صرف اُسی "وحدہ لاشریک لہ" کی عبادت کرو۔ اس کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرو۔

(ب) اپنی ذات اور اپنے صحابہ (ساتھیوں) کے لئے یہ چاہتا ہوں کہ ہمیں رہنے کو جگہ دو، ہماری مدد کرو اور جس طرح تم اپنی جانوں کی حفاظت کرتے ہو ہماری بھی حفاظت کرو۔

ایک روایت میں ہے کہ جس طرح اپنے بچوں اور عورتوں کی حفاظت کرتے ہو ہماری حفاظت کرو۔ مجمع نے دریافت کیا: ہمیں کیا ملے گا، [1] فرمایا: "جنت" [2]

اس کے بعد جوابی تقریریں شروع ہوئیں۔

(۱) سید القوم حضرت براء بن معرور رضی اللہ عنہ نے دست مبارک پر اپنا ہاتھ رکھا اور عرض کیا: یقیناً ہم اسی طرح حفاظت کرینگے۔ ہم کسی کے مقابلہ سے جان چرانے والے نہیں ہیں۔ (ہم ابناء الحروب ہیں) لڑائیوں کی گود میں پلے ہیں۔ آباؤاجداد سے یہی ترکہ میں ملا ہے۔

(۲) عباس بن عبادہ بن نضالہ انصاری رضی اللہ عنہ مجمع کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

حضرات! آپ سمجھتے ہیں کیا ہو رہا ہے۔ ہم عہد کر رہے ہیں کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی حمایت میں پوری دنیا کا مقابلہ کرینگے۔ ہر ایک گورے اور کالے کے مقابلے میں سینہ سپر ہونگے، جانیں قربان کرینگے۔ مال لٹائیں گے۔ ہمارے سردار مارے جائیں گے، کیا ہم تیار ہیں؟ اگر ایسا نہ کر سکیں تو کل کے بجائے آج الگ ہو جائیں۔ آج دامن بچا لینا کل کی رسوائی سے بہت بہتر ہے۔

(۳) حضرت ابو الہیثم تیہان: یارسول اللہ! گستاخی معاف۔ ایک بات واضح کرنی ہے: یہودیوں اور دوسرے قبائل سے ہمارے تعلقات ہیں۔ یہ تعلقات اب باقی نہیں رہیں گے۔ مگر ایسا تو نہ ہو گا کہ جب اللہ تعالیٰ آپ کو کامیاب فرمادے آپ ہمیں چھوڑ کر اپنے لوگوں میں چلے جائیں۔

آنحضرت ﷺ نے یہ الفاظ سنے تو مسکراتے ہوئے فرمایا:

یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ کا خون میرا خون، آپ کی ناکامی میری ناکامی، میں آپ کا آپ میرے، جن سے تمہاری جنگ ان سے میری جنگ، جن سے تمہاری صلح ان سے میری صلح۔

اس کے بعد سلسلہ بیعت شروع ہوا۔ حضرت براء بن معرور رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے بیعت کی۔ [1]

---

[1] مسند امام احمد ص ۱۲۰ ج ۳ وسیرۃ ابن ہشام ص ۲۶۶ ج ۱

[2] کسی دنیاوی ترقی یا برتری کا وعدہ نہیں ہے جو کچھ ہو آخرت کے لئے ہو۔ صرف اسی کا وعدہ ہے اور یہی نصب العین ہے۔ محمد میاں عفی عنہ

[1] ابن اسحاق کا بیان ہے کہ بنو نجار کا دعویٰ ہے کہ سب سے پہلے حضرت اسعد بن زرارہ نے بیعت کی اور بنو عبد الاشہل کہتے ہیں کہ سب سے پہلے حضرت ابو الہیثم بن تیہان نے بیعت کی۔ مگر ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ یہ حضرات بہت پہلے مسلمان

بیعت میں اسی عہد کو دہرایا گیا ❷ وپہلی بیعت (عقبہ اولیٰ) کی بیعت کے وقت کیا گیا تھا کہ (۱) خدا واحد کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرینگے (۲) اللہ کا کسی کو شریک نہیں گردانیں گے (۳) چوری نہیں کرینگے (۴) زنا نہیں کرینگے (۵) اپنی اولاد کو قتل نہیں کرینگے (۶) کسی پر بہتان نہیں باندھیں گے، جس اچھی بات کا حکم کیا جائے گا تعمیل کرینگے (نافرمانی نہیں کرینگے)۔

اس کے علاوہ یہ بھی عہد لیا گیا:

(۷) کسی کو ناحق قتل ❸ نہیں کرینگے (۸) لوٹ نہیں ڈالیں گے ❹ (۹) ہر موقع پر حق بات کہیں گے، کسی کی مذمت و ملامت کا خوف ہمیں کبھی بھی حق بات کہنے سے نہیں روک سکے گا۔ (۱۰) جب رسول اللہ ﷺ یثرب تشریف لے آئیں گے تو اپنی اولاد اور خود اپنی جانوں کی طرح ان کی حفاظت کرینگے۔ ❶ ان سب باتوں کا بدلہ جنت ہو گا۔ ❷

ہو چکے تھے اس وقت ان حضرات نے مکرر بیعت کی۔ نئے بیعت کرنے والوں میں اس وقت حضرت براءہی تھے رضی اللہ عنہم، واللہ اعلم بالصواب۔

❷ سورہ ممتحنہ میں آنحضرت ﷺ کی فرمائش کی گئی ہے کہ جو عورتیں ہجرت کرکے آئیں ان سے آپ بیعت لیجئے۔ اس بیعت میں انہیں چھ چیزوں کا تذکرہ ہے۔ اس مناسبت سے اس بیعت کو بیعت نساء کہتے ہیں۔ مردوں سے اس موقع پر انہیں باتوں کا عہد کرایا گیا۔ اس کے بعد بہت سے موقع آئے ہیں جن میں آنحضرت ﷺ نے خاص اس موقع کے لحاظ سے صحابہ کرامؓ سے بیعت لی ہے۔ مثلاً ایک مرتبہ اس پر بیعت لی اور عہد کرایا کہ کسی سے کوئی سوال نہیں کرینگے۔ ایک مرتبہ اس پر بیعت لی کہ ہر ایک کے حق میں خیر خواہی کرینگے۔ (بخاری شریف ص ۱۳) یا مثلاً حدیبیہ کے موقع پر بیعت لی گئی، جس کو بیعت رضوان کہا جاتا ہے کہ مر جائیں گے مگر میدان سے نہیں ہٹیں گے۔

❸ ولا تقتلوا النفس التی حرم اللہ الا بالحق ولا ننہب ولا نعصی۔ بخاری شریف ص ۵۵۰-۵۵۱

❹ یاد رکھئے غنیمت کو لوٹ نہیں کہا جاسکتا۔ لوٹ کو آنحضرت ﷺ نے گناہ کبیرہ قرار دیا ہے۔ جس طرح مثلہ (ناک کان کاٹ ڈالنے) سے منع فرمایا ایسے ہی (لنھبہ) لوٹ سے منع فرمایا: اس پر بیعت لی کہ لوٹ نہیں ڈالیں گے۔ (بخاری شریف ص ۳۳۶) لوٹ ڈالنے والے کے متعلق فرمایا: لیس منا سیکا (ابوداؤد شریف) گویا وہ مسلمان ہی نہیں ہے۔ لوٹ کا مقصد ذاتی مفاد ہوتا ہے۔ خوف خدا اجتماعی نظم یا امانت اور دیانت کا کوئی ضابطہ لوٹ میں نہیں ہوتا۔ غنیمت میں یہ تمام باتیں شرط ہوتی ہیں۔ غنیمت میں جو کچھ لیا جاتا ہے وہ پوری احتیاط اور دیانتداری کے ساتھ جمع کرایا جاتا ہے۔ ایک شخص میدان جنگ میں مارا گیا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ھوفی النار (یہ دوزخ میں گیا)۔ صحابہؓ کو تعجب ہوا۔ سامان کی تلاشی لی تو ایک عبا (اچکن) برآمد ہوئی جو مال غنیمت میں سے بلا اجازت اس شخص نے رکھ لی تھی۔ (بخاری شریف ص ۴۳۲) انتہا یہ کہ جوتہ کے تسمہ کے متعلق بھی یہی ارشاد ہوا شراك وشراكين من نار (بخاری شریف ص ۶۰۸) غنیمت کے متعلق یہی کہا جاسکتا ہے کہ غنیمت کے مال کو سرکاری طور پر ضبط کرلینے کا نام غنیمت ہے۔ کچھ ناآشنا ادب مصنف جو بظاہر اپنا درجہ حضرات صحابہؓ سے کم رکھنا نہیں چاہتے وہ غنیمت کے لئے بلا تکلف لوٹ کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ معاذ اللہ

❶ بیہقی بحوالہ البدایہ والنہایہ ص ۱۶۳

❷ بخاری شریف ص ۵۵۱

بارہ نقیب:

آنحضرت ﷺ نے اس جماعت میں بارہ نقیب منتخب فرمائے تاکہ حالات [3] کی نگرانی رکھیں۔ ان کے نام خود انصار نے پیش کئے تھے۔ ان میں سے نو خزرج کے تھے اور تین اوس کے۔ بردایت ابن اسحاق [4] ان کے نام یہ ہیں:

ابو امامہ، اسعد بن زرارہ، سعد بن ربیع، عبد اللہ بن رواحۃ، رافع بن مالک، براء بن معرور، عبد اللہ بن عمرو حرام، عبادہ بن صامت، سعد بن عبادہ، منذر بن عمرو بن خنیس، اسید بن حضیر، سعد بن خیثمہ، رفاعہ بن عبد المنذر (رضوان اللہ علیہم اجمعین)

جلسہ ختم ہوا۔ سب حضرات اپنی اپنی قیام گاہوں پر خاموشی سے واپس ہوگئے۔ طے یہ ہوا کہ صبح سویرے الگ الگ اپنی اپنی قیام گاہ سے مدینہ روانہ ہو جائیں گے۔

حضرات نقباء کا تعارف اور مختصر حالات

حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ:

کنیت ابو امامہ۔ یہ سب سے کم عمر تھے مگر اسلام میں سب سے مقدم، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ سب سے پہلے یثرب میں اسلام کا تعارف انہیں کے ذریعے ہوا۔ پھر ہر بیعت کے موقع پر حاضر اور ہر بیعت میں شریک رہے۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ مبلغ اور معلم بن کر آئے تو انہیں کے یہاں قیام رہا۔ دعوت و تبلیغ میں ان کے شریک رہے۔ نماز جمعہ کا سلسلہ بھی آپ ہی نے شروع کیا۔ مگر عمر نے وفا نہیں کی۔ ابھی مسجد نبوی کی تعمیر ہو رہی تھی کہ وفات ہوگئی۔ آنحضرت ﷺ بار بار مزاج پرسی کے لئے تشریف لے گئے۔ علاج میں بھی شریک مشورہ رہے۔ آنحضرت ﷺ کے تشریف لے جانے کے بعد مدینہ میں سب سے پہلے انہیں کی وفات ہوئی۔ خود آنحضرت ﷺ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ یہ سب سے پہلی نماز جنازہ تھی جو پڑھائی گئی۔ (الاستیعاب واصابہ) یہودیوں نے طعنہ دیا کہ محمد اپنے ساتھی کو بچا نہ سکے تو اور کیا کر سکیں گے۔ (مسند احمد)

حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ:

---

[3] لیکونوا نقبآء علیٰ قومهم بمافیهم (ابن ہشام ص ۲۶۷ ج ۱)

[4] سیرۃ ابن ہشام ص ۲۶۷ ج ۱ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے ایک قصیدہ میں ان سب ناموں کو جمع کر دیا ہے (ص ۲۶۸ ج ۱ ابن ہشام)

آنحضرت ﷺ نے حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ مہاجر سے مواخاۃ (برادرانہ رشتہ قائم فرمایا تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اپنے مہاجر بھائی سے کہا کہ میں انصار میں سب سے زیادہ خوش حال اور صاحب جائیداد ہوں۔ آدھی جائیداد آپ کی ہے اور میری دو بیویاں ہیں ان میں سے جس کو آپ مناسب سمجھیں مجھے بتادیں، میں طلاق دیدوں گا آپ نکاح کرلینا۔ عبدالرحمن نے جواب دیا: اللہ تعالیٰ آپ کے اہل اور مال میں برکت دے۔ مجھے تو (زیادہ چلنے والا) بازار بتادیجے۔ میدان احد میں معرکہ ٹھنڈا ہوا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ سعد بن ربیع کو تلاش کرو۔ یہ میدان میں پڑے ہوئے تھے۔ بارہ زخم جسم مبارک پر تھے۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ جو تلاش کرنے گئے تھے ان سے کہا کہ آقا دوجہاں سے میرا اسلام عرض کردینا اور مسلمانوں کو یہ پیغام پہنچادینا کہ اگر ان میں سے کوئی ایک بھی زندہ رہ گیا اور سرتاج دوعالم شہید ہوگئے تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ان کی کوئی معذرت قابل قبول نہیں ہوگی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ان کی صاحبزادی آئیں تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی چادر بچھادی۔ اس پر ان کو بٹھایا اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے فرمایا یہ ان کی صاحبزادی ہیں جو مجھ سے بھی بہتر تھے اور تم سے بھی۔ وہ آنحضرت ﷺ کے سامنے راہ خدا میں قربان ہوگئے اور میں بھی زندہ ہوں اور تم بھی زندہ ہو (الاصابہ)

حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ:

شاعر تھے۔ ان کے ترانے بڑے شوق سے سنے جاتے تھے اور پڑھے جاتے تھے۔ خود آنحضرت ﷺ کو بھی دلچسپی ہوتی تھی۔ صلح حدیبیہ کے بعد جب آنحضرت ﷺ حسب معاہدہ عمرہ کرنے کے لئے تشریف لے گئے تو مکہ میں آنحضرت ﷺ کے آگے آگے یہ ترانہ پڑھتے جارہے تھے:

خلوابنی الکفار عن سبیلہ　　الیوم نضربکم علی تنزیلہ
ضرباً یزیل الھام عن مقیلہ　　ویذھل الخلیل عن خلیلہ

ترانہ کا مفہوم یہ ہے کہ "کافر بچو! راستہ سے ہٹ جاؤ، آج ہم بزور شمشیر اپنے آقا کو یہاں اتاریں گے، ہماری شمشیر زنی ایسی ہوگی جو کھوپڑیوں کو گردنوں سے اڑادے گی اور دوست کو دوست سے جدا کردیگی"۔

آنحضرت ﷺ نے حضرت مقداد بن الاسود سے رشتہ اخوت قائم کیا تھا۔ وہ بھی ایسے ہی جوشیلے تھے۔ جاں باز عبداللہ بن رواحہ نے غزوہ موتہ میں جام شہادت نوش کیا۔ رضی اللہ عنہ۔

حضرت رافع بن مالک رضی اللہ عنہ:

مدینہ کے سب سے پہلے مسلمان ہونے والے ہیں۔ پہلی بیعت میں بھی شریک تھے جس میں چھ یا آٹھ آدمیوں نے بیعت کی تھی، پھر بارہ اور ستر میں بھی شریک تھے۔ جتنا قرآن اس وقت تک نازل ہوا تھا سب حفظ کر لیا تھا۔ غزوہ احد میں درجہ شہادت حاصل کیا۔ (استیعاب و اصابہ)

حضرت براء بن معرور رضی اللہ عنہ:

جب یہ قافلہ مکہ جارہا تھا تو راستہ میں اور ساتھیوں نے بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی مگر انہوں نے کعبہ کی طرف نماز پڑھی۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے مسلمان ہیں جنہوں نے کعبہ کی طرف نماز پڑھی۔ آنحضرت ﷺ ابھی ہجرت کر کے مدینہ میں تشریف لائے تھے کہ ان کی وفات ہو گئی مگر وفات کے وقت وصیت کر دی کہ ترکہ کا ایک ثلث آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیا جائے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے صاحب خیر ہیں جنہوں نے تہائی ترکہ کی وصیت کی۔

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن حرام رضی اللہ عنہ:

غزوہ بدر میں شریک نہیں ہو سکے، بہت صدمہ ہوا، غزوہ احد ہوا تو تمنا پوری ہوئی۔ بیٹے کو بٹھا کر رات ہی کو سمجھا دیا۔ مجھے امید ہے کہ میں کل کو سب سے پہلے جان فدا کروں گا۔ آنحضرت ﷺ کے بعد مجھے سب سے زیادہ تم محبوب ہو۔ تم سب سے پہلے میرا قرض ادا کرنا اور اپنی بہنوں کا خیال رکھنا بہنیں سات تھیں۔ جابر ان کے سعادت مند صاحبزادے تھے۔ یہودی کا قرض تھا۔ خیال تھا کہ باغ کے پھل سے قرض ادا نہیں ہو سکے گا، لہٰذا کچھ اب وصول کر لے کچھ بعد میں۔ مگر یہودی راضی نہیں ہوا۔ آنحضرت ﷺ نے سفارش کی تب بھی راضی نہیں ہوا۔ آنحضرت ﷺ باغ میں تشریف لے گئے ٹوٹے ہوئے کھجوروں کے ڈھیر پڑے تھے، ان سب کے پاس پہنچ کر ملاحظہ فرمایا: پھر حکم دیا کہ تمام قرض ادا کر دو۔ یہ آنحضرت ﷺ کی برکت تھی کہ تمام قرض ادا کر دیا۔ اور کھجوروں کے ڈھیر جوں کے توں باقی رہ گئے۔

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ:

آنحضرت ﷺ نے حضرت ابو مرثد غنوی رضی اللہ عنہ سے برادرانہ رشتہ قائم فرمایا۔ تمام معرکوں میں شریک رہے۔ سنہ ۴۵ھ میں وفات ہوئی۔

حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ:

قبیلہ خزرج کے سردار، رئیس گھرانے کے چشم و چراغ بہت بڑے حوصلہ مند سخی، باپ دادا بھی ایسے ہی رئیس اور سخی تھے۔ آنحضرت ﷺ نے ان کے گھر کو بیت جود فرمایا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا گیا تو انہوں نے بیعت نہیں کی مگر کوئی مخالفت بھی نہیں کی بلکہ وطن چھوڑ کر شام چلے گئے۔ حوران میں قیام کیا وفات دفعۃً ہوگئی، غسل خانہ میں مردہ پائے گئے۔ یہ سنہ ۱۱ھ کا واقعہ ہے یا ۱۴ھ یا ۱۵ھ کا (علیٰ اختلاف الاقوال) الاستیعاب

حضرت منذر بن عمرو بن خنیس رضی اللہ عنہ:

آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے برادرانہ رشتہ قائم فرمایا۔ بیر معونہ کے حادثہ میں شہید ہونے والے ستر حضرات جو اس موقع پر شہید کئے گئے وہ انہیں کی قیادت میں سفر کر رہے تھے (الاستیعاب و بخاری وغیرہ) یہ سب حضرات خزرجی تھے قبیلہ اوس کے یہ تین حضرات تھے مندرجہ ذیل

حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ:

قبیلہ اوس کے سردار بہت بڑے سخی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ۲۰ھ یا ۲۱ھ میں وفات ہوئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے وصی تھے۔ چار ہزار دینار قرض چھوڑا، جس کو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے باغ کی آمدنی سے ادا کیا۔ (الاستیعاب) غزوہ بدر میں مشیر خاص تھے۔

حضرت سعد بن حیثمہ رضی اللہ عنہ:

جب آنحضرت ﷺ کا قباء میں قیام تھا تو عام نشست ان کے یہاں ہوئی تھی۔ جو حضرات مہاجرین تن تنہا آئے تھے وہ بھی انہیں کے یہاں ٹھرتے تھے۔ جب غزوہ بدر کے موقع پر آنحضرت ﷺ روانہ ہونے لگے تو باپ (خثیمہ) اور بیٹے سعد نے طے کیا کہ ہم میں سے ایک مکان پر رہے ایک ساتھ جائے، پھر باپ بیٹے میں بحث ہوئی کہ کون ساتھ جائے۔ بحث ختم کرنے کے لئے قرعہ ڈالا تو قرعہ میں بیٹے (حضرت سعد رضی اللہ عنہ) کا نام نکلا۔ باپ نے بیٹے سے اپیل کی کہ اپنا حق مجھے دیدیں اور مجھے جانے دیں تو بیٹے نے کہا کوئی اور معاملہ ہوتا تو میں آپ کے لئے اپنا حق بخوشی چھوڑ دیتا مگر یہ راہ خدا میں قربان ہونے اور رضا مولیٰ حاصل کرنے کا معاملہ ہے اس میں تو میں اپنا حق نہیں چھوڑ سکتا۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ گئے اور جام شہادت نوش جان کیا۔ (رضوان اللہ علیہم اجمعین)

حضرت رفاعہ بن عبد المنذر رضی اللہ عنہ:

ابولبابہ کنیت، یہ کنیت ہی سے مشہور ہیں ۔غزوہ بدر اور غزوہ سویق کے موقع پر جب آنحضرت ﷺ تشریف لے گئے تو انہیں کو مدینہ کا ناظم امور (والی) بنا گئے۔ غزوہ خندق کے بعد بنو قریظہ کا مسئلہ پیش ہوا۔ جنہوں نے غزوہ خندق کے وقت غداری کی تھی۔ بنو قریظہ منتظر تھے کہ ان کے متعلق کیا فیصلہ کیا جائیگا۔ ابولبابہ رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا تو انہوں نے گردن کی طرف اشارہ کیا کہ سب غداروں کو قتل کیا جائے گا۔ پھر احساس ہوا کہ میں نے راز فاش کر دیا تو مسجد شریف میں آکر اپنے آپ کو کھنبے سے باندھ دیا اور کھانا پینا سب بند۔ نماز کے وقت ان کی صاحبزادی آکر ان کو کھول دیتی تھیں تو نماز میں شریک ہو جاتے تھے ۔ چھ روز تک اور بعض روایتوں کے بموجب چودہ پندرہ دنوں تک اسی طرح بندھے رہے۔ پھر سورہ توبہ نازل ہوئی، آپ کو بشارت دی گئی اور کھولنے کا ارادہ کیا گیا۔ آپ نے منع کر دیا کہ میں قسم کھا چکا ہوں کہ جب تک آنحضرت ﷺ خود نہ کھولیں گے میں نہیں کھولوں گا ۔ چنانچہ خود سرور کائنات ﷺ نے اپنے دست مبارک سے ان کو کھولا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ان کی وفات ہوئی۔ بغیر کھائے پیئے بندھے رہنے کا اثر ظاہری جسم پر یہ پڑا کہ قوت سماعت ختم ہو گئی تھی۔ (الاستیعاب)

قریش کا تعاقب:

یہ اجلاس جو پہاڑ کی گھاٹی میں ریت کے فرش پر چاند کی چاندنی میں کیا گیا تھا بہت ہی خفیہ تھا۔ جانے والے بھی ایک ایک کر کے گئے تھے۔ اسی طرح نہایت خاموشی سے واپس ہوئے۔ لیکن پچھتر آدمیوں کی نقل و حرکت چھپنے والی نہیں تھی۔ لوگوں نے بھانپا، کچھ بھنک قریش کے کانوں میں بھی پڑی۔ فوراً دوڑے اور جیسے ہی صبح ہوئی تحقیقات شروع کر دی۔ اہل مدینہ کے خیموں میں پہنچے اور کہا :

”ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ لوگ اس لئے آئے ہیں اور کوئی ایسا معاہدہ کر چکے ہیں کہ اس صابی (آنحضرت ﷺ) کو اپنے ساتھ لے جائیں گے اور ہمارے مقابلہ پر محاذ قائم کرینگے۔ ہم آگاہ کئے دیتے ہیں محمد کو لے جانا ہمارے لئے چیلنج ہو گا۔ طاقت آزمائی ہو تو ایسا کر لو۔“

رؤسا مدینہ عبداللہ بن ابی بن سلول وغیرہ سے قریش کے تعلقات تھے انہیں سے تعارف تھا۔ انہیں سے تحقیقات کا سلسلہ شروع کیا گیا اور انہیں سے یہ باتیں کہی گئیں۔ ان میں سے کوئی بھی اس بیعت میں شریک نہیں ہوا تھا نہ ان کو خبر تھی، انہوں نے قسمیں کھا کھا کر انکار کیا۔ عبداللہ بن ابی بن سلول نے کہا: میری قوم اگر ایسا کرتی تو وہ یقیناً مجھ سے مشورہ کرتی ورنہ کم از کم خبر ضرور دیتی۔ یہ ممکن نہیں میری اطلاع کے بغیر کوئی ایسا عمل ہو جائے۔ یہ انکار کرنے والے سچے تھے لیکن بیعت کرنے والوں کو فکر تھی کہ ان سے دریافت کیا گیا تو کیا جواب دینگے ۔ وہ خاموش تھے اور ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ دفعۃً حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی نظر ایک قریشی رئیس زادے حارث بن ہشام مخزومی کی نئی جوتیوں پر پڑ

گئی جو قیمتی اور خوبصورت تھیں۔ انہیں مذاق کرنے اور لوگوں کی توجہ ہٹانے کا موقع مل گیا۔ انہوں نے عبداللہ بن ابی بن سلول کو مخاطب کر کے کہا: دیکھئے جوتیاں ایسی ہونی چاہئیں۔ آپ رئیس مدینہ اور قوم کے سردار ہیں۔ آپ بھی ایسی ہی جوتیاں پہنا کیجئے۔ اس مزاحیہ فقرہ کو حارث نے طنز سمجھا۔ اس نے دونوں جوتیاں نکال کر کعب رضی اللہ عنہ کی طرف پھینک دیں۔ لو تم پہنو ضرور پہنو خدا کی قسم ضرور پہنو۔

حضرت کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن ابی نے دیکھا کہ حارث کو ناگواری ہوئی تو اس نے مجھے ڈانٹا: تم نے خواہ مخواہ ان کو ناراض کر دیا۔ ان کی جوتیاں واپس کر دو۔ میں نے کہا یہ دے چکے ہیں اب میں واپس نہیں کروں گا اور دل میں سوچا یہ فال نیک ہے عنقریب وہ وقت آئے گا کہ میں ان تکلفات کو ان لوگوں سے ختم کر دوں گا۔

بہرحال اس طنز اور مذاق میں اصل بات رل گئی ہماری جان بچ گئی۔ ہم سے کسی نے نہیں پوچھا۔ جب یہ لوگ ہمارے خیموں سے باہر نکل گئے تو طے شدہ پروگرام کے بموجب بیعت کرنے والے حضرات نے کھسکنا شروع کیا۔ قریش کو پھر احساس ہوا۔ وہ پھر دوڑے۔ مگر ہم سب نکل چکے تھے۔ دو آدمی کسی طرح باقی رہ گئے تھے ان کو راستہ میں پکڑ لیا۔ یہ قبیلہ خزرج کے رئیس سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ تھے اور اسی قبیلہ کے دوسرے صاحب منذر بن عمرو رضی اللہ عنہ۔ یہ دونوں نقیب بھی منتخب ہوئے تھے۔ حضرت منذر رضی اللہ عنہ پھر بھی کسی طرح بچ کر نکل آئے لیکن حضرت سعد رضی اللہ عنہ نہ نکل سکے۔ اونٹ کے کجاوہ میں سے چمڑہ کا تسمہ نکال کر ان کی مشکیں کس دیں ان کے سر پر بڑے بال تھے۔ مارتے پیٹتے اور ان کے بڑے بال کھینچتے ہوئے مکہ میں لے گئے۔ وہاں لوگوں نے بہت ذلیل کیا، مارا پیٹا، کسی نے منہ پر بھی تھوک دیا۔

انہیں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک شخص آیا، بظاہر نہایت سنجیدہ نیک خصلت، شریف صورت تھا۔ مجھے خیال آیا کہ یہ مجھ پر رحم کرے گا اور میری جان چھڑا دے گا۔ مگر

"بھولی بھالی شکل والے ہوتے ہیں جلاد بھی"

میرے پاس پہنچا تو اس نے رحم کے بجائے بڑے زور سے کھینچ کر طمانچہ مارا۔ تب میں نے سوچا کہ ان انسان نما وحشیوں میں کم از کم مسلمانوں کے حق میں شرافت کا نام و نشان نہیں رہا۔ ایک اور شخص جو غالباً یہ حرکتیں دیکھتے دیکھتے تھک گیا تھا، اس نے کہا کیا مکہ میں تمہارا کوئی حلیف نہیں ہے۔ تب مجھے خیال آیا میں نے کہا: میرے بہت سے حلیف ہیں۔ جبیر بن مطعم بن عدی سے میرے تجارتی تعلقات بھی ہیں۔ حارث بن حرب بن امیہ سے بھی میرے تعلقات گہرے ہیں۔ آپ کی عنایت ہو گی ان میں سے کسی کو خبر کر دو۔ یہ شخص گیا حرم کعبہ کے قریب ان سے ملاقات ہو گئی۔ ان کو میرا نام بتایا یہ دونوں آئے اور ان

ظالموں سے مجھے نجات دلائی۔ [1]

مکہ معظمہ میں اصول کار (پروگرام) ہاتھ نہیں اٹھا سکتے

تیرہ سال مکہ معظمہ میں گزرے۔ اس طویل مدت میں پروگرام یہ تھا:

۱۔ کُفُّوْٓا اَیْدِیَکُمْ [2]	ہاتھ روکو
۲۔ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ	نماز قائم کرو (اللہ سے تعلق مضبوط کرو)
۳۔ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ [3]	زکوٰۃ ادا کرو۔
۴۔ وَ اَقْرِضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا [4]	اللہ تعالیٰ کو قرض حسن دیتے رہو

مگر اس موقع پر جب بیعت اس پر بھی لی گئی کہ حضرات انصار جس طرح اپنی جانوں اور اپنی اولاد کی حفاظت کرتے ہیں آنحضرت ﷺ کی بھی حفاظت کرینگے تو امام المغازی ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ یہ اس طرف اشارہ تھا کہ ہاتھ روکنے کا پروگرام آئندہ نہیں رہے گا۔ بلکہ ہاتھ اٹھانے کی بھی اجازت ہوگی [5] ۔ چنانچہ جب بیعت ہو چکی تو ایک منچلے بہادر حضرت عباس بن عبادہ بن فضلہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ اگر اجازت ہو تو ہم صبح ہی کو ان لوگوں کو تلوار کے ہاتھ دکھادیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ابھی مجھے اس کا حکم نہیں ملا ہے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو ہجرت مدینہ کی اجازت

فتنہ کفر سے بچنے اور اپنے ایمان کو محفوظ رکھنے کی خاطر کسی امن کی جگہ جا کر پناہ لینے کا سلسلہ پہلے سے جاری تھا، اسی غرض سے ایک جماعت حبشہ گئی تھی اور حضرت ابو سلمہ رضی اللہ عنہ، حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ، حضرت عبد اللہ بن جحش بن رئاب رضی اللہ عنہ وغیرہم کو جب معلوم ہوا کہ یثرب میں ان کو امن مل سکتا

---

[1] طبقات ابن سعد ص ۱۵۰ ج ۱، یہ تفصیل امام المغازی ابن اسحاق کی روایت سے ماخوذ ہے۔ سیرۃ ابن ہشام ص ۲۷۰ ج ۱۔

[2] سورہ نساء آیت ۷۷

[3] یہ پہلے گزر چکا ہے کہ مکہ معظمہ میں زکوٰۃ اور قرض حسن کا فرق محض مصرف کے لحاظ سے تھا یعنی غریبوں مسکینوں کو جو کچھ دیا جاتا وہ زکوٰۃ اور غلاموں کو خرید کر رہا کرنا یا دوسرے ملی اور اجتماعی کاموں میں خرچ کو قرآن حکیم میں قرض سے تعبیر فرمایا گیا۔ حاصل یہ کہ جو کچھ ہو خرچ کر ڈالو اور جو کچھ خرچ کروگے اللہ تعالیٰ کے یہاں اس سے بہتر ملے گا۔ (واللہ علم بالصواب)

[4] سورہ المزمل آیت ۲۰

[5] سورہ حج اگرچہ مدنی ہے مگر ماہرین قرآن کی ایک جماعت کی تحقیق یہ ہے کہ اذن قتال کی آیت ۳۹ (اذن للذین یقاتلون۔ تا آخر) مکہ معظمہ ہی میں نازل ہو چکی تھی یعنی الفاظ بیعت میں جس کی طرف اشارہ تھا اس کے متعلق صریح حکم بھی مکہ معظمہ ہی میں نازل ہو چکا تھا۔ البتہ ابھی عمل کا حکم نہیں ہوا تھا۔ عمل کا حکم جب ہوا جب مدینہ منورہ میں طاقت مجمع ہوگئی اور محاذ قائم ہو گیا۔ واللہ اعلم بالصواب (ماخوذ از سیرۃ ابن ہشام ص ۲۸۰ ج ۱)

ہے تو وہ بیعت عقبہ سے پہلے ہی یثرب چلے آئے تھے۔ ❶

پھر جب مدینہ کے چند افراد کو آنحضرت ﷺ نے اسلام کی دعوت دی تو آپ نے اس خواہش کا بھی اظہار فرمایا تھا کہ آنحضرت ﷺ بہ نفس نفیس ان کے ساتھ چلیں۔ مگر مدینہ کی فضا خانہ جنگی کے باعث خراب تھی تو ان حضرات نے اس وقت تعمیل فرمائش سے معذرت کر دی تھی۔ لیکن سب باتیں اس وقت تک اس بناء پر تھیں کہ وہاں امن مل جانے کی توقع تھی۔ لیکن جس مقصد عظیم کے لئے آنحضرت ﷺ کی بعثت ہوئی تھی اس کو سامنے رکھ کر کس مقام کو مرکز بنایا جائے جو ضرورت کے وقت ایک مضبوط محاذ بھی ثابت ہوسکے یہ اب تک طے نہیں ہوا تھا۔ اسی اثناء میں ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ مجھے تین ❷ مقامات بتائے گئے ہیں ان میں سے کسی کو منتخب کرلو۔ مدینہ، بحرین، یا قنسرین۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں مکہ سے ہجرت کرکے ایک ایسے مقام پر جارہا ہوں جہاں کھجور کے باغات ہیں۔ مجھے خیال ہوا کہ یہ مقام یمامہ ہوگا یا ہجر۔ ❸ لیکن جس طرح اہل مدینہ نے اسلام کا استقبال کیا اس نے طے کر دیا کہ یہ مرکز وہ ارض پاک ہے جس کو یثرب کہا جاتا تھا۔ جس نے بعد میں مدینۃ النبی ا کا غیر فانی اسم گرامی اختیار کیا۔

انتہا یہ کہ مقام عقبہ پر جو آخری بیعت ہوئی اس میں باقاعدہ وعدہ ہو گیا کہ حضرات مہاجرین وہاں پہنچیں گے اور اہل مدینہ ان کا انتظام کرینگے۔ چنانچہ اس کے بعد نہ صرف یہ کہ آنحضرت ﷺ نے اجازت دیدی بلکہ ایک اصول طے ہو گیا کہ جو دائرہ اسلام میں داخل ہو اس پر لازم ہے کہ وہ مدینہ منورہ کو اپنا قیام گاہ بنائے۔ ❹

سیدنا بلال رضی اللہ عنہ روئے انور ﷺ کے عاشق، جاں نثار اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام۔ یہ ان دونوں سے جدا ہونا نہیں چاہتے تھے۔ مگر اسی اصول کی پابندی نے ان کو ہجرت پر مجبور کیا۔ ❶ چنانچہ بیعت عقبہ کے بعد ہجرت کرنے والوں میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ، حضرت عمار بن یاسر اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے اسماء گرامی سب سے پہلے ہیں۔ ان کے بعد سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ بیس نفر کے قافلہ کے ساتھ تشریف

---

❶ سیرۃ ابن حشام ص ۳۸۱، ج ۱، فتح الباری ص ۱۸۰، ج ۷

❷ ترمذی شریف و فتح الباری ص ۱۸۱، ج ۷

❸ بخاری شریف ص ۵۵۱

❹ قرآن حکیم نے سچا مومن اسی کو قرار دیا جو ہجرت کرکے آئے یا ہجرت کرنے والوں کے لئے قیام کا انتظام کرے اور راہ خدا میں جان اور مال سے جہاد کرے۔ (سورہ انفال کی آخری آیت)

❶ فتح الباری ص ۲۰۸ ج ۷

لائے اور قبا میں رفاعہ بن عبد المنذر کے یہاں فروکش ہوئے۔ [2] پھر رفتہ رفتہ جس کو موقع ملا وہ مکہ سے نکل کر مدینہ پہنچتا رہا۔

شوق استقبال :

حضرات انصار نے اس دعوت پر ہی اکتفا نہیں کی جو بیعت عقبہ کے سلسلہ میں دے چکے تھے۔ بلکہ بیعت کے بعد جب مدینہ واپس آگئے تو یہاں سے چند حضرات مکہ تشریف لے گئے اور حضرات مہاجرین کے ساتھ واپس ہوئے ان کو مہاجر انصاری کہا جاتا ہے۔ [3]

آنحضرت ﷺ کو دعا کی تلقین اور ہجرت کا اشارہ

سورہ اسراء کی چند آیتیں یہ ہیں:

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ﴿۷۸﴾ وَ مِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰۤى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴿۷۹﴾ وَ قُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّ اجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا ﴿۸۰﴾

ترجمہ: اے رسول نماز قائم کر سورج ڈھلنے [4] کے وقت سے لے کر رات کے اندھیرے کے وقت تک (ظہر، عصر، مغرب، عشاء کے وقتوں میں) اور نماز فجر میں خاص اہتمام سے قرآن پڑھو۔ بلاشبہ صبح کے وقت تلاوت قرآن ایک ایسی تلاوت ہے جس میں حاضری زیادہ سے زیادہ ہوتی ہے۔ [5]

اور اے نبی رات کا کچھ حصہ (یعنی پچھلا حصہ) شب بیداری میں بسر کر یہ تیرے لئے ایک مزید عمل ہے۔ قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے ایسے مقام پر پہنچادے جو نہایت پسندیدہ مقام ہو (جس کی تعریف کی جاتی ہے) اور تیری دعا یہ ہونی چاہئے کہ اے پروردگار (مجھے جہاں کہیں پہنچا تو) سچائی کے ساتھ پہنچا اور (جہاں کہیں سے نکال تو) سچائی کے ساتھ نکال۔ اور مجھے اپنے حضور سے قوت عطا فرما۔ ایسی قوت کہ ہر حال میں مدد گاری کرنے والی ہو۔ (آیات ۷۸ تا ۸۰ سورہ ۱۷ اسراء)

تشریحات: (۱) سورہ اسراء جس کا آغاز معراج کے واقعہ سے ہوا۔ اسی کے نویں رکوع کی یہ آیات ہیں

---

[2] ایضاً ص ۲۰۹ ج ۷

[3] ان حضرات کے اسماء گرامی یہ ہیں: حضرت ذکوان بن عبد قیس، حضرت عقبہ بن وہب بن کلدہ، حضرت عباس بن عبادہ بن فضلہ، حضرت زیاد بن لبید رضی اللہ عنہم (ابن سعد ص ۱۵۲ ج ۱)

[4] آفتاب پرستوں کی عبادت طلوع آفتاب کے وقت ہوتی ہے اور توحید پرستوں کی عبادت اس سے پہلے ہوتی ہے یا اس وقت جب ان معبودان باطل کا زوال ہوتا ہے۔

[5] رات اور دن کے کارپرداز فرشتے اس وقت جمع ہوتے ہیں (بخاری شریف ص ۶۸۶ و ۰۹)

جن میں اس دعا کی تلقین ہوئی ہے۔ قُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ جہاں سے نکالنا ہو سچائی کے ساتھ نکال اور جہاں پہنچنا ہو سچائی کے ساتھ پہنچا جن میں بقول ابن عباس (رضی اللہ عنہ) ہجرت [1] کا ایماء ہے۔

(۲) معراج شریف ابتلاء اور آزمائش کے اس نازک دور میں ہوئی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے حامی اور مددگار یعنی بنو ہاشم شعب ابی طالب میں پناہ گزیں اور محصور تھے اور اہل مکہ اور بالفاظ دیگر پوری دنیا آپ سے بائیکاٹ کئے ہوئے تھے۔ اسی شب میں پانچ نمازیں فرض ہوئیں۔ جن کی طرف ان آیتوں میں اشارہ ہے۔ ان کی تشریح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیم اور عمل متواتر سے فرمائی۔

شعب ابی طالب میں محصور ہونے کا دورہ اور اس کے بعد کے سال وہ تھے جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفقاء کی مظلومیت، لاچارگی اور بے مائگی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ ایسی حالت میں کون امید کر سکتا تھا کہ انہیں مظلومینوں سے فتح اور کامرانی پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن وحی الٰہی نے صرف فتح و کامرانی ہی کی بشارت نہیں دی کیونکہ فتح و کامرانی کی عظمت کوئی غیر معمولی عظمت نہیں تھی بلکہ ایسے مقام تک پہنچنے کی خبر دی جو نوع انسان کے لئے عظمت اور ارتفاع کی سب سے آخری منزل ہے۔ عَسٰٓی اَنْ یَّبْعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (بنی اسرائیل۔۷۹)

فضل و کمال کا ایسا مقام جہاں پہنچ کر محمودیت خلائق کی عالمگیر اور دائمی عظمت حاصل ہو جائے۔ کوئی عہد ہو، کوئی ملک ہو، کوئی نسل ہو لیکن کروڑوں دلوں میں اس کی ستائش ہو گی۔ ان گنت زبانوں پر اس کی مدحت طرازی ہو گی۔ محمود یعنی سر تا سر محمود ہستی ہو جائے گی:

ماشئت قل فیه فانت مصدق فالحب یقضی والمحاسن تشهد

"جو تعریف تم کرنا چاہو کر لو، تمہاری تعریف درست اور تم راست گو ہو گے، محبت کا یہی تقاضا ہے اور محاسن و کمالات اس کی شہادت دیتے ہیں"

یہ مقام انسانی عظمت کی انتہا ہے اس سے زیادہ اونچی جگہ اولاد آدم کو نہیں مل سکتی، اس سے زیادہ انسانی رفعت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ انسان کی سعی اور ہمت ہر طرح کی بلندیوں تک اڑ سکتی ہے لیکن یہ بات نہیں پا سکتی کہ روحوں کی ستائش اور دلوں کی مداحی کا مرکز بن جائے، خالق کائنات اس کی مدح کرے اور وہ کائنات انسانی کی اس وقت مدد کرے جس وقت ہر ایک نفس خواہ وہ نفس عوام ہو یا نفس خواص، کسی ولی مقرب کا نفس ہو یا کسی اولو العزم نبی مرسل کا نفس "نفسی نفسی" پکار رہا ہو۔

(۳) جس اولو العزم نبی اور رسول کے بلند ترین درجات کا زینہ معراج تھا اور سطح اعلیٰ مقام محمود۔ اسی کی حیات مقدسہ کا اہم واقعہ ہجرت ہے۔

---

[1] ترمذی شریف کتاب التفسیر ص ۱۴۲ ج ۲

یہ ترک وطن معاذ اللہ جان بچانے کے لئے نہیں تھا بلکہ اس جہاد عظیم کے لئے تھا جس کا ثمرہ مقام محمود ہے۔

یعنی رحمت کاملہ اور امن عالم کی وہ مقدس دعوت جس کا نام اسلام ہے، جس کے مبلغین اور داعیان کرام کی تربیت تیرہ سال تک مکہ کی سنگلاخ امتحان گاہ میں ہوتی رہی، اب وقت آیا ہے کہ اس کو وقف عام کیا جائے اور ایک شہر یا ایک علاقہ یا ملک کی تنگنائی سے نکال کر پورے عالم کو اس سے آشنا کیا جائے، اور وہ تمام مشقتیں برداشت کی جائیں اور تمام مصیبتیں جھیلی جائیں۔ جن کی نذر پیش کرنا ایسی غیر معمولی عظیم الشان دعوت کے لئے ضروری ہے، جس کی بناپر رہتی دنیا تک آنحضرت ﷺ کی تعریف ہوتی رہے اور قیامت کو مقام محمود کا شرف اعظم حاصل ہو۔

یہ ترک وطن اسی جہاد عظیم کے لئے تھا۔ اسی لئے یہ ایک ایسا شرف تھا کہ اگر اللہ رب العالمین کو منظور نہ ہوتا کہ یہ شرف عطا کیا جائے تو محبوب رب العالمین) ﷺ (مکی یا ہاشمی اور قریشی ہونے کے بجائے حضرات انصار میں سے ہوتے۔ [1]

اسی ہجرت نے اس موقف کی بنیاد رکھی جہاں سے رحمۃ اللعالمین ﷺ اعلان فرمایا:

قُلۡ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ اِلَيۡكُمۡ جَمِيۡعَا ۨ الَّذِىۡ لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ

(سورہ اعراف آیت ۱۵۸)

(اے افراد نسل انسانی میں تم سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا آیا ہوں، وہ خدا کہ آسمانوں اور زمین کی ساری بادشاہت اسی کی ہے۔)

مسجد جو اسلامی تعلیمات کے بموجب حیات اجتماعی کی علامت بلکہ شرط اول ہے، اس ہجرت کے بعد ہی وہ پہلا دن میسر آیا جس میں تاسیس مساجد کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ [2] اسی پہلے دن کو اسلام کی نشات اجتماعی کا پہلا دن مانا گیا جس سے اسلامی سنہ (سنہ ہجری) کا آغاز کیا گیا۔ [3]

مخالفین کا منصوبہ

اِنَّهُمۡ يَكِيۡدُوۡنَ [1] كَيۡدًا وَّ اَكِيۡدُ كَيۡدًا فَمَهِّلِ الۡكٰفِرِيۡنَ اَمۡهِلۡهُمۡ رُوَيۡدًا

---

[1] لولا الهجرة لكنت امرأ من الانصار (بخاری شریف ص ۵۳۳)

[2] قال الله تعالیٰ: لمسجد اسس علی التقویٰ من اول یوم قال السهیلی من اول یوم حل النبی صلی الله علیه وسلم بدار الهجرة (تفسیر مظہری)

[3] بخاری شریف ص ۵٦۰ حدیث سہل رضی اللہ عنہ

[1] قال ابن عباس هذا وعید من الله عزوجل وقد اخذهم الله یوم بدر (تفسیر مظہری)

(سورہ طارق۔۱۵ تا ۱۷)

"وہ ایک منصوبہ بنارہے ہیں اور میں ایک منصوبہ بنارہاہوں سوڈھیل دیجئے منکروں کو تھوڑے دن ڈھیل دیجئے۔ ❷"

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ۭ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ

(سورہ الانفال ۳۰)

"اور (اے نبی) وہ وقت یاد کرو جب مکہ میں کافر تیرے خلاف اپنی چھپی تدبیروں میں لگے تھے کہ تجھے باندھ کر ڈال دیں۔ ❸ یا قتل یا جلاوطن کردیں اور وہ اپنی مخفی تدبیریں کررہے تھے اور اللہ اپنی مخفی تدبیر کررہا تھا اور اللہ بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔"

وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا

(سورہ بنی اسرائیل آیت ۷۶، ۷۷)

اور انہوں نے اس میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی کہ تجھے اس سرزمین (ملک عرب) سے عاجز کرکے نکال دیں اور اگر ایسا کر بیٹھے تو (یاد رکھیں) تیرے (نکالے جانے کے پیچھے) مہلت نہ پاتے مگر بہت تھوڑی، (وہ سب تباہ کردیئے جاتے) ہم تجھ سے پہلے جو پیغمبر بھیج چکے ہیں، ان سب کے معاملہ میں ہمارا قاعدہ یہی رہا ہے اور ہمارے ٹھہرائے قاعدے کو تو بدلتا ہوا نہ پائے گا۔"

تشریح: جس قوم نے اپنا نصب العین یہ بنا رکھا تھا کہ اسلام کا نام و نشان مٹا ڈالے اس کی ناکامی اس سے زیادہ کیا ہوسکتی تھی کہ جس کو وہ مٹانا چاہتی تھی وہ بڑھ رہا تھا، پھیل رہا تھا، اس کی حفاظت اور ترقی کے مرکز قائم ہورہے تھے۔

عرب سے باہر افریقہ میں (مملکت حبش میں) مسلمانوں کی ایک جماعت پہنچی ہوئی تھی وہ ایک مرجع اور ایک مرکز بن گئی تھی۔ قریش کا نمائندہ وفد جو اس کو اکھاڑنے کے لئے گیا تھا وہ ناکام ہوچکا تھا۔ اب تازہ ناکامی یہ تھی کہ یثرب میں اور خاص ان میں جو نہ صرف قریش کے ہم عقیدہ اور پیرو تھے بلکہ ان میں قریش کی رشتہ داری اور قرابت بھی تھی ❶ اسلام کی جڑیں مضبوط ہورہی تھیں۔ یہاں تک کہ ساری دنیا کا مقابلہ کرنے

---

❷ البتہ وہ لگے ہیں ایک داؤ کرنے میں اور میں لگا ہوں ایک داؤ کرنے میں۔ سوڈھیل دے منکروں کو۔ ڈھیل دے ان کو (صبر کر) (حضرت شاہ عبدالقادرؒ)

❸ تجھ کو بٹھادیں (حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ)

❶ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور ان کے تقریباً تیس ساتھی یمن سے بذریعہ جہاز روانہ ہوئے کہ خدمت مبارک میں حاضر ہوکر اسلام قبول کریں۔ مگر باد مخالف نے جہاز کو بندرگاہ حجاز کے بجائے افریقہ کی بندرگاہ پر پہنچادیا۔ وہاں معلوم ہوا کہ

کے عزم اور حوصلہ کے ساتھ فداکاروں کی ایک جماعت منظم ہو چکی تھی۔ وہ سخت جان جو دس بارہ سال تک مکہ میں ہر طرح کی مصیبتیں جھیل کر اور امتحان و آزمائش کی بھٹی میں تپ کر کندن ہو چکے تھے وہ مکہ سے نکل نکل کر یثرب پہنچ رہے تھے، اور اس طرح ایک محاذ مضبوط ہو رہا تھا۔ اس پر قریش کے رہنما جتنے بھی خوف زدہ ہوں جتنے بھی چراغ پا ہوں کم تھا۔ کیونکہ زندگی اور موت کا سوال جو پہلے چلمن کے پیچھے سے جھانک رہا تھا اب بے نقاب ہو کر سامنے آ چکا تھا۔ لہٰذا ضروری تھا کہ قریش کے تمام سردار سر جوڑ کر بیٹھیں اور پوری سنجیدگی سے اس مسئلہ پر غور کریں۔ چنانچہ مکہ کے تاریخی پنچائت گھر یا کونسل ہاؤس (دارالندوہ) میں خاص اجلاس طلب کیا گیا۔ ارکان ندوہ کے علاوہ دوسرے ہمنوار ہنماؤں کو بھی اس میں شرکت کی دعوت دی۔ ایجنڈا (غور طلب اور فیصلہ طلب مسئلہ) یہی تھا کہ اسلام اور اس کے داعی کا قصہ کس طرح ختم کیا جائے۔

ربیع الاول کے پہلے ہفتہ میں یہ اجتماع ہوا اور پوری سنجیدگی سے مسئلہ پر غور کیا گیا۔ چند تجویزیں پیش کی گئیں:

(۱) محمد [2] ﷺ کو بیڑیاں پہنا کر لوہے کی سلاخوں کے پیچھے باندھ کر ڈال دو [3]۔ نجد کا ایک شخص جو وہاں وقت پر پہنچ گیا تھا اس نے کہا: اس سے محمد ﷺ کی مقبولیت بڑھے گی۔ لوگوں کی ہمدردیاں زیادہ ہونگی اور بہت ممکن ہے اس کے ساتھی کسی طرح اس کو چھڑا کر لے جائیں، اس سے قریش کی بدنامی اور ہوا خیزی ہوگی۔

(۲) محمد ﷺ کو وطن سے نکال دو۔ [4] تمہیں چھٹی مل جائے گی۔ تم اپنا نظام قائم کر سکو گے اور موجودہ انتشار ختم ہو جائے گا۔

نجدی شیخ: بہت غلط رائے ہے، وہ ہوشیار ہے اور اس کے کلام میں ایسی طاقت ہے کہ جہاں جائے گا اپنا جتھا بنا لے گا۔ تمہارے لئے عذاب بن جائے گا۔

مسلمانوں کی ایک جماعت حبش میں موجود ہے تو اس کے پاس پہنچے اور اسلام قبول کر کے اس کے ساتھ رہنے لگے اور فتح خیبر کے موقع پر سنہ ۷ھ میں وہ سید الانبیاء ﷺ کی بارگاہ اقدس میں باریاب ہوئے۔ (بخاری شریف ص ۵۴۷ وغیرہ)

[2] پیش کرنے والا: رئیس قریش ابو البختری ' مقتول غزوہ بدر

[3] لِيُثْبِتُوكَ (الانفال۔۳۰)

[4] اَوْ يُخْرِجُوْكَ (الانفال۔۳۰) نیز آخری آیت وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ۔ (بنی اسرائیل۔۷۶) پورا ترجمہ اوپر گزر چکا ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تجویز بھی کافی اہمیت اختیار کر چکی تھی کہ وہ آنحضرت ﷺ کو پریشان اور عاجز کر کے سرزمین عرب سے ہی نکال دیں۔ بظاہر اس پر عمل اس لئے نہیں ہوا کہ اس میں یہ خطرہ محسوس کیا گیا کہ یہ جہاں پہنچ جائیں گے وہاں اپنا مرکز قائم کر کے حملہ کر دیں گے اور قریش کو تباہ کر دینگے۔ مگر ارشاد ربانی کا تقاضا ہے کہ حضرت حق جل مجدہ اس قوم عرب یا قبیلہ کو برباد کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے یہ تجویز منظور کی گئی کیونکہ اگر وہ ایسا کرتے تو سنت اللہ یہ ہے کہ وہ قوم برباد ہو جاتی ہے جو اپنے نبی کو جلاوطن کر دے۔

(۴) ابوجہل: میری تو قطعی رائے یہ ہے کہ محمد کا کام تمام کر دیا جائے۔ باقی یہ خطرہ کہ اس کے ولی (بنو ہاشم) انتقام لیں گے اور اس طرح قبائلی جنگ بھڑک اٹھے گی تو اس سے نجات کی صورت یہ ہے کہ کسی ایک قبیلہ کے آدمی قتل نہ کریں بلکہ ہر ایک قبیلہ سے آدمی منتخب کئے جائیں، یہ سب مل کر حملہ کریں اس صورت میں خون کی ذمہ داری سب پر ہو گی۔ بنو ہاشم اس اجتماعی طاقت کا مقابلہ نہ کر سکیں گے۔ لامحالہ دیت اور خون بہا طے ہو گا جس کو ہم لامحالہ سب مل کر ادا کرینگے۔

تمام اراکین نے ابوجہل کی تجویز سے اتفاق کیا اور اس کی تیاری شروع کر دی۔ [1]

مُخْرَجَ صِدْقٍ (مکہ سے ہجرت) اور امداد خداوندی

اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ (بنی اسرائیل آیت ۸۰)

"اے رب جہاں سے تو مجھ کو نکالے تو سچائی کے ساتھ نکال"

اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (توبہ آیت ۴۰)

"اگر تم مدد نہ کرو گے رسول کی تو اللہ نے اس کی مدد کی ہے جب نکالا اس کو کافروں نے"

گرمیوں کا موسم، ستمبر کی ۱۳ تاریخ، ربیع الاول کی یکم [2]، پیر کا دن، مکہ والے گرمیوں میں مکان سے باہر ڈیوڑھیوں کے سامنے راستہ کے کنارے پر چارپائیاں بچھالیتے ہیں اور آدھی رات تک گپ شپ کرتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ کا معمول یہ ہے کہ تہائی رات تک نماز عشاء سے فارغ ہو جاتے ہیں پھر کچھ سورتوں کی تلاوت فرماتے ہوئے باوضو بستر پر اور عموماً کھری چارپائی پر آرام فرماتے ہیں اس وقت کچھ آنکھ لگ جاتی ہے۔ صحن میں آپ تنہا ہی ہوتے ہیں یا آپ کی زوجہ مطہرہ۔

لیکن آج خلاف معمول آرام نہیں فرما رہے اور آج آپ تنہا بھی نہیں ہیں آپ کے چچازاد بھائی حضرت علی رضی اللہ عنہ جن کی عمر تقریباً بائیس سال ہے وہ بھی حاضر ہیں اور کچھ باتیں ہو رہی ہیں جیسے حساب سمجھا رہے ہیں۔

دوسری طرف عجیب بات یہ ہے کہ مکان سے باہر کچھ آدمی آرہے ہیں، تلواریں ان کے ہاتھ میں

---

[1] البدایہ والنہایہ ص۱۷۵و۱۷۶ ج۳ وغیرہا۔ من کتب السیر

[2] جو حضرات سفر ہجرت کے رفقاء یا اس سفر کے مددگار تھے انہوں نے تاریخ یا دن نہیں بیان کیا دوسرے حضرات نے بیان کیا ہے۔ چونکہ ڈائری یا روزنامچہ کا رواج نہیں تھا اور مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی تقویمات (جنتریوں) میں اختلاف رہتا تھا۔ اس لئے قدرتی طور پر تاریخوں کے بیان میں اختلاف ہو گیا۔ ہم نے تقویم ہجری عیسوی مرتبہ ابو النصر محمد خالدی صاحب ایم اے (عثمانیہ) کے لحاظ سے یہ تاریخ اور دن مقرر کیا ہے (واللہ علم بالصواب)

ہیں۔ یہ نہایت خاموشی سے آتے ہیں اور دروازے کے قریب بیٹھ جاتے ہیں۔ رفتہ رفتہ دس بارہ آدمی آ گئے ہیں ان میں ابو جہل بھی ہے ابو لہب بھی۔ اور عقبہ بن ابی معیط اور امیہ بن خلف بھی۔ ان میں سے کوئی اٹھتا ہے اور کواڑوں کی دراز سے اندر جھانکتا ہے۔

اب آدھی رات گذر چکی ہے۔ آخری پہر شروع ہو گیا پورے مکہ پر سناٹا چھا گیا۔ یہ کافر جو باہر آ گئے تھے غالباً کھڑے کھڑے تھک گئے۔ اس لئے قطار لگا کر دروازہ کے سامنے بیٹھ گئے ہیں۔ دفعۃً آنحضرت ﷺ اٹھتے ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے بستر پر لٹاتے ہیں اپنی چادر ان کے اوپر ڈال دیتے ہیں پھر دروازہ سے باہر تشریف لاتے ہیں۔ سورہ یٰسین تلاوت فرما رہے ہیں اور جب کافروں کے برابر پہنچتے ہیں تو یہ آیت زبان مبارک پر ہے:

وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ

(یٰسین۔ ۹)

ترجمہ: ”کر دی ہم نے ان کے آگے دیوار اور ان کے پیچھے دیوار، پھر اوپر سے ڈھانک دیا۔ سو ان کو نظر نہیں آتا۔“

اب نہیں کہا جاسکتا کہ ان کافروں کو نیند آ گئی تھی یا جیسا کہ آیت کا مفہوم ہے ان کی آنکھوں کے سامنے دیوار کھڑی کر دی گئی تھی۔ لیکن جو اطمینان آنحضرت ﷺ کو ہے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سامنے قدرت نے کوئی دیوار کھڑی کر دی ہے جس کو آپ محسوس فرما رہے ہیں (ﷺ)۔ اطمینان کی بھی انتہا ہوئی کہ آپ یونہی نہیں گذر جاتے بلکہ دست مبارک میں مٹی [1] لیتے ہیں اور ہر ایک کے سر پر مٹی رکھتے ہوئے تشریف لے جاتے ہیں۔ یہ نبی کا اعتماد، وثوق اور یقین ہے خدا پر اور خدا کے کلام پاک پر۔

خدا پر بھروسہ اور اطمینان کی دوسری مثال یہ نوجوان علی رضی اللہ عنہ پیش کر رہے ہیں کہ وہ بستر پر آرام سے لیٹے ہیں۔ وہ سمجھ رہے ہیں کہ آج کی شب، شب مقتل ہے۔ دشمن اسی لئے اکٹھے ہو رہے ہیں کہ اس بستر والے کو ذبح کریں، آرام گاہ کو ذبح خانہ بنائیں۔ بستر والا نہ ہو تو جو بستر پر ہو گا وہ ذبح ہو گا۔ مگر یا تو اللہ کی حفاظت پر اطمینان کامل ہے یا دیدار محبوب کے شوق مضطر نے موت کو بھی محبوب بنا دیا ہے۔

اگر مشاہدہ دوست از پس مرگ است　　حیات خضر و مسیحا نصیب دشمن باد

یہی تسکین بخش اطمینان ہے کہ جیسے ہی لیٹتے ہیں سو جاتے ہیں۔ خدا جانے کتنی دیر تک یہ دشمن جو تلواریں لئے بیٹھے تھے غافل بیٹھے رہے۔ انہیں ایک شخص نے آخر چونکایا جس نے خبر دی کہ جس کو تم قتل کرنے آئے تھے وہ نکل گیا اور تمہاری غفلت کی انتہا ہے کہ خاک تمہارے سروں پر ہے اور تمہیں خبر نہیں

[1] ابن سعد و ابن ہشام (وغیرہ)

۔اب یہ گھبرا کر اٹھے، سروں پر ہاتھ پھیرے تو خاک آلود تھے۔یقین ہو گیا کہ یہ شخص سچ کہتا ہے۔دروازہ دیکھا تو وہ بھی کھلا ہوا تھا۔

کسی کے مکان میں گھسنا بہت معیوب تھا، مگر یہ لوگ ضابطہ اخلاق سے دامن جھاڑ کر خاص منصوبہ کے تحت آئے تھے اور اب ناکامی کی جھونجل بھی تھی۔غصہ اور جوش میں اندر گھس گئے، دیکھا کہ ایک سن رسیدہ (محمد ﷺ فداہ روحی) کی جگہ خواجہ ابو طالب کا سب سے چھوٹا لڑکا علی بستر پر دراز خراٹے لے رہا ہے۔

حواس باختہ دشمنوں نے جھنجھوڑ کر اٹھایا۔پوچھا محمد ﷺ کہاں ہے؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: مجھے کیا خبر؟جواب صحیح تھا، انہیں خبر نہیں تھی بہت پوچھ گچھ کی ڈرایا دھمکایا مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کچھ نہیں بتا سکے۔

یہاں سے دوڑتے ہوئے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے مکان پر گئے۔ایک لڑکی (بڑی صاحبزادی حضرت اسماء) سامنے آئی۔پوچھا تمہارے باپ کہاں ہیں؟مجھے خبر نہیں۔لڑکی نے جواب دیا۔ابو جہل نے اس معصومہ کے اتنی زور سے طمانچہ مارا کہ کان کی بالی گر گئی۔[1]

جب ان بد بختوں کو یقین ہو گیا کہ شکار ہاتھ سے نکل گیا تو اس کی تلاش میں دوڑے۔مکہ کی گلی گلی چھان ماری اور جب کہیں پتہ نہ چلا تو فوراً منادی کرادی کہ جو محمد اور اس کے ساتھی کو زندہ گرفتار کر کے لائے یا ان کا سر لائے اس کو (ایک دیت کے بموجب) سو اونٹ انعام میں دیئے جائیں گے [2] ۔سو اونٹ کا انعام معمولی نہیں تھا۔انعام کے شوق میں بہت سے من چلے دوڑے مگر کامیابی کسی کو بھی نہیں ہوئی۔کیونکہ رب محمد اپنے محمد کی مدد کر رہا تھا۔(ﷺ) یہی تو ہے ارشاد خداوندی فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ (التوبہ۔۴۰) بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اس کی (آنحضرت ﷺ کی مدد کی) اور وہ جو دعا بتائی گئی تھی جس کا ایک جز تھا "وَّاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا" (بنی اسرائیل۔۸۰) "اور مجھے اپنے حضور سے قوت عطا فرما ایسی قوت جو ہر حال میں میری مددگار ہو" تو اس اطمینان سے زیادہ جس سے پوری طرح مسلح ہو کر آنحضرت ﷺ بستر سے اٹھے اور روانہ ہوئے تھے، سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا[3] کیا ہو سکتا ہے۔

صادق وامین کی امانت داری:

---

[1] ابن سعد وابن ہشام وغیرہ

[2] بخاری شریف ص ۵۵۴

[3] ایسی قوت جو ہر حال میں مددگار ہو

دشمنوں نے اگرچہ یہ خطاب [1] اب چھوڑ دیا تھا [2] مگر آپ کی صداقت و امانت ان دشمنوں کی خاطر نہیں تھی۔ بلکہ اس لئے تھی کہ آپ کی فطرت مبارکہ کا جوہر تھی۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جو سمجھا رہے تھے وہ ان امانتوں کا حساب ہی تھا جو انہیں دشمنوں کی آپ کے پاس تھیں، جو اب منصوبہ قتل ناحق کو کامیاب بنانے کے درپے تھے۔ آپ نے اس خطرناک اور ہیبت ناک فضا میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اسی لئے چھوڑا تھا کہ جن کی امانتیں ہیں ان کو واپس کر کے اور پوری طرح حساب سمجھا کر تشریف لائیں۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تین دن بعد روانہ ہوئے جب امانتیں ادا کر چکے اور حساب سمجھا چکے۔

غار ثور میں قیام اور ضروری انتظامات

ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ هُمَا فِی الْغَارِ اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (التوبہ۔۴۰)

"صرف دو تھے دو میں سے ایک اللہ کے رسول تھے۔ جب کہ یہ دونوں غار میں تھے اور اللہ کے رسول اپنے صاحب (ساتھی) سے کہہ رہے تھے غمگین نہ ہو، یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔"

انبیاء علیہم السلام خدا پر پورا بھروسہ رکھتے ہیں۔ وہ اعلیٰ درجہ کے متوکل بلکہ آداب توکل کے معلم اور متوکلین کے امام و پیشوا ہوتے ہیں۔ اس غیر معمولی توکل اور اعتماد کے نتیجہ میں غیبی تائید اور نصرت خداوندی کی وہ غیر معمولی صورتیں بھی پیش آتی رہتی ہیں جو انہیں کے ساتھ مخصوص ہوتی ہیں جن کو معجزہ کہا جاتا ہے۔ اس کے باوجود وہ ظاہری اور مادی اسباب کو نظر انداز نہیں کرتے کیونکہ وہ صرف خانقاہ نشین درویش نہیں ہوتے، ان کی زندگی صرف ان کے لئے نہیں ہوتی وہ نوع انسان کے معلم ہوتے ہیں اور ان کی زندگی پوری نوع انسان کے لئے سبق ہوتی ہے۔ مکان سے نکلتے وقت قدرت نے خاص طرح کی مدد

---

[1] آنحضرت ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ عجیب بات ہے اللہ تعالیٰ نے میرے نام کو سب و شتم سے بچالیا۔ ان کو میرا نام لینا گوارا نہیں ہوتا یہ مذمم کو برا بھلا کہتے ہیں حالانکہ میں محمد ہوں میرا نام مذمم نہیں۔ (بخاری شریف ص ۵۰۱)

[2] یہ خطاب استعمال نہیں کرتے تھے مگر آپ کی صداقت اور امانت سے انکار نہیں تھا۔ مانتے تھے، جانتے تھے، پہچانتے تھے کہ آپ صادق و امین ہیں۔ اسی پر تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ اَمْ لَمْ یَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ (مومنون۔۶۹) کیا ان لوگوں نے اپنے رسول کو پہنچانا نہیں ہے کہ اس کا انکار کرتے ہیں۔ قرآن حکیم نے اصل مرض کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا (البقرہ۔۱۶۵) (معبودان باطل) کی محبت ان لوگوں سے یہ حرکتیں کراتی تھی وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا یُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (بقرہ۔۱۶۵) کچھ لوگ وہ ہیں جو اللہ کو چھوڑ کر ان کو مانتے ہیں جن کو انہوں نے خدا کا شریک ٹھہرا رکھا ہے اور ان سے ایسی ہی محبت کرتے ہیں جیسی خدا سے کرنی چاہئے اور جو ایمان والے ہیں وہ بہت سخت ہوتے ہیں اللہ کی محبت میں۔ حب اَنْدَاد یعنی معبودان باطل کی محبت اور خدا کی محبت میں یہ فرق ہوتا ہے کہ اللہ سے محبت کرنے والا ہٹ دھرمی نہیں کر سکتا کیونکہ اللہ کا حکم ہے کہ ہر موقع پر عدل و انصاف سے کام لو، حق کی شہادت دینے والے رہو، كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ (نساء۔۱۳۵) اور معبودان باطل کا کوئی حکم ہی نہیں اگر ہے تو باطل پرستی لہٰذا وہ جو کچھ کر بیٹھے کم ہے۔

کی، مگر آپ نے اور آپ کے رفیق خاص نے روپوش رہنے اور خفیہ روانگی کا جو نظام قائم کیا تھا وہ امت کے لئے بہترین سبق ہے۔ اس کی تفصیل خاص طور پر قابل مطالعہ ہے۔

دارالندوہ کا وہ اجلاس جس میں آپ کے متعلق غیر معمولی تجویز منظور کی گئی اور مشترکہ طور پر شہید کرنے کا منصوبہ طے کیا گیا۔ وہ غالباً صبح کے وقت ہوا۔ اس کی اطلاع بطور تائید غیبی آنحضرت ﷺ کو فوراً ہی ہو گئی [1] اور فوراً ہی آپ نے روانگی کی تیاری شروع کر دی۔

سیدہ [2] عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ کا معمول یہ تھا کہ روزانہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے یہاں تشریف لایا کرتے تھے مگر صبح یا شام کو۔ ایک روز ہم نے دیکھا کہ ٹھیک دوپہر کے وقت تشریف لا رہے ہیں۔ سر مبارک پر کپڑا اڈالے ہوئے ہیں چہرہ مبارک کو بھی کچھ کپڑے سے چھپائے ہوئے ہیں۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو خبر دی گئی فوراً حاضر ہوئے۔ یا رسول اللہ آپ پر میرے ماں باپ قربان یہ ناوقت تشریف آوری کیسی؟

ارشاد ہوا: کچھ بات کرنی ہے تنہائی ہونی چاہئے۔ کوئی غیر آدمی ہو تو اسے ہٹا دو۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ: غیر کوئی نہیں دو لڑکیاں ہیں ایک آپ کی خادمہ عائشہ دوسری اس کی بہن اسماء۔

فرمایا تمہیں معلوم ہے؟ مجھے ہجرت کی اجازت [3] مل گئی ہے۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ: یہ خادم ساتھ رہے گا۔ [4] آپ پر میرے ماں باپ قربان یا رسول اللہ۔

آنحضرت ﷺ: بہت اچھا۔

یہ اجازت ایسی بشارت تھی کہ فرط مسرت سے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا کہ خوشی میں آنسو آجاتے ہیں۔

پھر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: دو سانڈنیاں [1] تیار ہیں ان میں سے ایک منظور فرمائیے۔

---

[1] ابن سعد کی روایت کا مفہوم یہ ہے کہ یہ منصوبہ طے کر کے لوگ منتشر ہو گئے (اجلاس ختم ہو گیا) جبرئیل علیہ اسلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے یہ خبر سنائی اور کہا کہ آج کی شب اپنے اس بستر پر آرام نہ فرمائیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو بکر صدیقؓ کے یہاں پہنچے ص ۱۵۳ ج ۱ اس تفصیل سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اجلاس صبح کے وقت ہوا ۔

[2] بخاری شریف ص ۵۵۲ تا ۵۵۴

[3] یعنی آج یہ سفر اس لئے نہیں ہے کہ دشمنوں نے قتل کا منصوبہ بنا رکھا ہے بلکہ اس لئے ہے کہ اب تک ہجرت کی اجازت نہیں تھی آج مل گئی ہے۔ اور اگر دارالندوہ کا اجلاس رات کے وقت ہوا تھا تو اگرچہ اس کی اطلاع آنحضرت ﷺ کو فوراً مل گئی تھی مگر دوپہر تک آپ نے روانگی کا قصد اس لئے نہیں کیا کہ اب تک ہجرت کی اجزات نہیں ملی تھی۔ اب جیسے ہی اجازت ملی آپ نے تیاری شروع کر دی۔ واللہ اعلم بالصواب

[4] یہ ہے عشق رسول۔ اہل وعیال، مال اور جدائیداد وغیرہ کا کوئی تصور سامنے نہیں تھا قلب مضطر کی تڑپ صرف یہ ہے: الصابة بابی انت یا رسول اللہ (بخاری شریف ص ۵۵۳) آپ کی رفاقت میرے باپ آپ پر قربان یا رسول اللہ۔

آنحضرت ﷺ: ضرور مگر قیمت لینی ہو گی۔ ❷

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم نے بڑی تیزی سے سامان سفر کی تیاری شروع کر دی اور جلدی جلدی میں جو ناشتہ ❸ تیار ہو سکتا تھا وہ تیار کر لیا، پھر ہم نے چمڑے کے تھیلے میں ناشتہ بھر دیا۔ ایک مشکیزے میں پانی بھر دیا، لیکن تھیلے کا منہ بند کرنے کے لئے کپڑے کی ضرورت تھی اور مشکیزے میں بھی تسمہ نہیں تھا❹ جس سے اس کو اٹھایا جا سکے، تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بڑی ہمشیرہ (حضرت اسماء رضی اللہ عنہا) نے فوراً اپنے نطاق ❺ کے دو حصے کر لئے ❻ ایک میں کھانے کا تھیلہ باندھ دیا، دوسرے میں مشکیزہ باندھ دیا تاکہ اس کو اٹھایا جا سکے۔

روانگی: آنحضرت ﷺ دولت کدہ سے روانہ ہو کر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے یہاں پہنچے۔ پھر یہ دونوں مکان کی پشت کی ❼ طرف سے کھڑکی سے نکل کر کوہ ثور کی طرف روانہ ہو گئے جو مکہ معظمہ سے تقریباً تین میل کے فاصلہ پر ہے، اور جس کی چوٹی پر یہ غار ہے جس نے غار ثور کے نام سے غیر فانی شہرت حاصل کی۔

جب آپ روانہ ہوئے تو یہ دعا زبان مبارک پر تھی ❽:

"الحمدللہ الذی خلقنی ولم اك شیئاً اللّٰھم اعنّی علیٰ ھول الدنیا و بوائق الدھر ومصائب اللیالی والایام۔ اللّٰھم اصحبنی فی سفری واخلفنی فی اھلی و بارك لی فیما رزقتنی ولك فذللنی وعلی صالح خلقی فقومنی والیك رب فحبنی والی الناس فلاتکلنی۔ رب المستضعفین وانت ربی۔ اعوذ بوجھك الکریم الذی اشرقت له السمٰوٰت والارض وکشفت به الظلمات وصلح علیه امرالاولین والاخرین ان تحل علیّ

---

❶ یہ پہلے گزر چکا ہے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ چار ماہ پہلے یہ سانڈنیاں خرید چکے تھے اور اس خیال سے کہ نہ معلوم کس وقت حکم ہو جائے۔ ان اونٹنیوں کو چرواہے کے سپرد نہیں کیا تھا بلکہ گھر پر کھڑا کر کے ان کو چارہ کھلاتے رہے تھے۔

❷ واقدی کی روایت ہے کہ ان دونوں کی قیمت آٹھ سو درہم تھی۔ آنحضرت ﷺ نے جو سانڈنی منظور فرمائی وہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے قبیلہ بنی قشیر سے خریدی تھی۔ اس کا نام قصواء رکھا گیا۔ یہ آنحضرت ﷺ کی سواری میں آخر تک رہی اور آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد بہت کم زندہ رہی۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں اس کی زندگی کا خاتمہ ہوا۔ (فتح الباری ص ۱۸۷ ج ۷)

❸ پراٹھے نہیں تھے صرف ابلا ہوا بھنا ہوا بکری کا گوشت تھا (فتح الباری بحوالہ واقدی ص ۱۸۸ ج ۷)

❹ لیس فیھا عصام (سیرۃ ابن ہشام ص ۲۹۲ ج ۱)

❺ نطاق خاص قسم کا تہہ بند ہوتا تھا اس کا عرض تقریباً ڈھائی میٹر (۹۰ انچ) ہوتا تھا۔ اس کو بیچ سے باندھ دیا جاتا۔ پھر اوپر کا حصہ نیچے لٹکا دیا جاتا جس سے یہ دہرا ہو جاتا تھا۔ (مجمع البحار و فتح الباری ص ۱۸۸ ج ۷)

❻ یہ ایثار عند اللہ مقبول ہوا۔ چنانچہ آپ کا خطاب ذات النطاقین ہو گیا۔ (بخاری شریف ص ۸۱۱)

❼ سیرۃ ابن ہشام ص ۲۹۱ ج ۱ البدایہ والنہایہ ص ۱۷۸ ج ۳

❽ ایضاً البدایہ والنہایہ ص ۱۷۸ ج ۳

غضبك وتزل بی سخطك۔ واعوذبك من زوال نعمتك وفجائة نقمتك وتحول عافیتك وجمیع سخطك۔ لك العقبیٰ۔ عندی خیرما استطعت لاحول ولاقوۃ الابك"[1]

سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ ساتھ ساتھ تھے مگر جذبہ بیتاب قابل دید تھا۔ کبھی آگے چلتے کبھی پیچھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا تو عرض کیا یارسول اللہ آگے چلتا ہوں کہ حضور کو کوئی گزند نہ پہنچے۔ خیال آتا ہے کہ شاید پیچھے سے تعاقب کرنے والے پہنچ جائیں تو پیچھے ہو جاتا ہوں۔ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہیں اپنی جان کا خطرہ نہیں ہے۔ عرض کیا حضرت وہ تو قربان ہونے کے لئے ہی ہے۔[2]

راستہ طے ہوا۔ غار کے کنارے پہنچے تو عرض کیا: حضرت ذرا توقف فرمائیں، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ غار کے اندر اترے، صاف کیا پھر آقا دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تشریف لایئے۔

ان کو کیا فکر جن کا ساتھی اللہ ہو:

سو اونٹ کا انعام جو قریش کی طرف سے مقرر کیا گیا تھا معمولی نہیں تھا۔ مکہ والوں کی بہت سی ٹولیاں انعام کے شوق میں دوڑ پڑیں۔ کچھ ٹولیاں اس طرف بھی آئیں۔ ایک ٹولی غار کے قریب پہنچی تو وہاں سے کبوتر اڑے۔ ایک ٹولی جھاڑ کے قریب تک پہنچی، اس نے دیکھا کہ جھاڑ پر مکڑی کا جالا تنا ہوا ہے۔ وہ جالا دیکھ کر واپس ہو گئی۔[3]

---

[1] ترجمہ: "اس خدا کی حمد جس نے مجھے پیدا کیا درانحالیکہ میں کچھ بھی نہیں تھا (مجھے نیست سے ہست کیا) اے اللہ میری مدد فرما، دنیا کی دہشت، زمانہ کے ہلاکت انگیز واقعات، رات اور دنوں (گردش روز و شب) کی مصیبتوں کے مقابلہ پر اے اللہ تو میرا ساتھی بن، وہ میرے سفر میں اور میرا قائم مقام بن میرے اہل و عیال میں میرے بعد، (میری غیبوبت میں تو ان کا محافظ اور نگراں رہ) اور اے اللہ جو تو مجھ کو رزق دے اس میں برکت عطا فرما اور اے اللہ صرف اپنی ذات کے لئے ہی ایسا کر کہ مجھے اپنا مطیع اور اپنے سامنے عاجز بنا کسی اور کے سامنے مجھے عاجز اور ذلیل نہ کر۔ اے اللہ نہایت صالح اور مناسب اعمال پر میری تربیت فرما! افعال خیر کے بہترین سانچے میں مجھے ڈھال دے اور اے میرے رب صرف اپنی طرف کی محبت ہی میرے اندر بھر دے اور جہاں تک انسانوں کا تعلق ہے اے اللہ مجھے تو ان کے حوالے مت کر۔ اے کمزوروں کے رب تو ہی میرا رب ہے۔ میں تیری اس باعزت ذات کی جس کی برکت سے آسمان اور زمین روشن ہیں اور جس سے تمام تاریکیاں فنا ہو جاتی ہیں اور جس کے فضل و کرم سے پہلے لوگوں اور بعد والوں کا سب کا معاملہ درست ہوا۔ پناہ لیتا ہوں اس سے کہ میرے اوپر تیرا غضب اور تیری ناراضگی نازل ہو۔ میں تیری پناہ لیتا ہوں اس سے کہ تیرا انعام مجھ کو نصیب نہ ہو یا اس سے کہ تیرا عتاب دفعۃً مجھ پر نازل ہو جائے اور پناہ چاہتا ہوں اس سے کہ تیری معافی جو مجھے میسر ہے اس میں تبدیلی آجائے اور میں ایسی ہر چیز سے پناہ چاہتا ہوں جو تیری ناراضی کا سبب ہو انجام کار تیرے ہی لئے ہے۔ میں جہاں تک میرے امکان میں ہے خیر اور بھلائی ہی کی کوشش کرتا ہوں (مگر) تیرے بغیر نہ کوئی طاقت ہے نہ کوئی قوت ہے جو کچھ قوت و طاقت ہے وہ تجھ سے ہی ہے"۔

[2] دلائل النبوت للبیہقی بحوالہ فتح الباری ص۱۸۹ ج ۲

[3] طبقات ابن سعد جلد اول ص ۱۵۴

ایک ٹولی اوپر چڑھی اور غار کے کنارے کے اوپر سے اس طرح گزر گئی کہ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کے پاؤں دیکھے۔ یہ ٹولی گزر چکی تو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا۔

لو ان احدھم نظر الی قدمیہ لابصرنا

"اگر ان میں سے کوئی اپنے پیروں پر نظر ڈالتا تو ہمیں دیکھ لیتا"

یہ نبی کا اطمینان و اعتماد تھا کہ برجستہ جواب دیا۔

اسکت یا ابابکر اثنان اللہ ثالثھا [1]

"خاموش رہو ابو بکر ہم دو ہمارا تیسرا اللہ ہے۔"

وفی روایۃ ماظنک یا ابابکر باثنین اللہ، ثالثھا [2]

ایک روایت میں یہ ہے: ابو بکر! ان دو کے متعلق تم کیا گمان رکھتے ہو جن کا تیسرا اللہ ہے۔

سرور کائنات ﷺ کی یہ زحمت [3] سفر، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی رفاقت اور رحمۃ اللعالمین ﷺ کا یہ اعتماد بارگاہ رب العزت میں قبول ہوا۔ چنانچہ سورہ توبہ کی اس آیت (مذکورہ عنوان) میں اس کا ذکر فرمایا گیا۔

سب کچھ قربان

یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ وَلَوْ کَانَ بِھِمْ خَصَاصَۃٌ (الحشر-۹)

(وہ مقدم رکھتے ہیں اپنے نفسوں پر باوجودیکہ خود انکو شدید حاجت اور سخت ضرورت ہوتی ہے)

یہ آیت اگرچہ ہجرت سے کئی سال بعد حضرات انصار (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کے بارے میں نازل ہوئی مگر اس کی عملی مثال حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پہلے ہی پیش کر چکے تھے۔ جب آپ نے سفر ہجرت کے وقت اپنی پوری پونجی ساتھ لے لی تھی۔ پانچ چھ ہزار آپ کے پاس نقد تھے۔ آپ روانہ ہوئے تو آپ نے سب رقم ساتھ لے لی اور اہل و عیال کو خدا کے نام پر چھوڑ دیا۔ آپ کے بچوں کا ایثار یہ تھا کہ اس کی نہ ان کو کوئی ناگواری ہوئی نہ تہی دستی سے پریشانی، گویا خود ان کی بھی یہی خواہش تھی۔ انتہا یہ کہ جب حضرب ابو بکر رضی اللہ عنہ کے والد ابو قحافہ کو خبر ہوئی کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ چلے گئے تو بچوں کے پاس آئے اور فرمایا: ابو بکر رضی اللہ عنہ تو چلے ہی گئے کچھ تمہارے لئے بھی چھوڑ گئے ہیں؟ میرا خیال یہ ہے کہ جو کچھ ان کے پاس تھا سب لے گئے۔ جان سے تو گئے ہی مال بھی لے گئے۔ تمہیں خالی چھوڑ گئے۔ تو بڑی صاحبزادی حضرت اسماء رضی اللہ عنہا

---

[1] بخاری شریف ص ۵۵۸

[2] ایضاً ص ۵۱۶ و فتح الباری

[3] یہ بھی خیال رکھنا چاہئے کہ یہ سفر اور غار میں قیام ستمبر کے مہینہ میں ہوا جو سخت گرمی کا مہینہ ہوتا ہے۔

نے فوراً جواب دیا: نہیں دادا جی ہمارے لئے بہت کچھ چھوڑ گئے ہیں۔ ابو قحافہ کچھ مطمئن نہیں ہوئے تو حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے اس جگہ جہاں رقم رہا کرتی تھی کنکریاں تھیلی میں بھر کر رکھ دیں۔ دادا کی بصارت جاتی رہی تھی۔ ان کا ہاتھ پکڑ کر لے گئیں اور تھیلی پر ہاتھ رکھ کر بتادیا کہ یہ رقم محفوظ ہے۔ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ یہ محض دادا کو مطمئن کرنے کے لئے کر دیا ورنہ واقعہ یہ تھا کہ جو کچھ تھا حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سب لے آئے تھے۔ ہمیں خالی چھوڑ آئے تھے۔ [1]

حالات سے باخبر رہنے اور دوسری ضروریات کا انتظام

تین آدمیوں کے خاص خاص کام سپرد کئے گئے تھے۔ [2]

۱۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے فرزند ارجمند عبد اللہ رضی اللہ عنہ [3] نوجوان تھے [4] مگر نہایت ہوشیار، بہت تیز، بات کو تاڑنے والے، پرکھنے والے۔ ان کے ذمہ یہ تھا کہ مخالفین کے اقدامات پر نظر رکھیں، حالات کا جائزہ لیتے رہیں۔

یہ دن بھر مکہ معظمہ میں کنسوئیں لیتے رہتے۔ دن چھپے اندھیرا ہو جاتا تو غار پر پہنچتے تھے۔ تمام روئیداد سنا دیتے۔ حالات سے باخبر کر دیتے۔ پھر آخر پہر میں مکہ معظمہ پہنچ جاتے گویا رات بھر یہیں رہے ہیں۔

۲۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ [5] غلام عامر بن فہیرہ جن کو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہجرت کی اجازت نہیں دی تھی بلکہ روک لیا تھا۔ ان کے ذمہ یہ تھا کہ تازہ دودھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرتے رہیں۔ شام کو جب اندھیرا ہو جاتا یہ بکریاں غار پر لیجاتے دودھ دھتے پھر اس کو گرم کرتے اور سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم اور اپنے آقا ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پیش کر دیتے۔ پھر بکریوں کو ہکا کر صبح سے پہلے تڑکے میں مکہ پہنچ جاتے۔

۳۔ اس زمانہ میں سڑکیں نہیں تھیں اس لئے راستوں اور خصوصاً پہاڑی راستوں سے واقف ہونا بھی ایک خاص فن تھا۔ اس کے ماہر کو "خریت" کہا کرتے تھے۔ قافلہ کے ساتھ خریت ضرور ہوتا تھا۔

---

[1] سیرت ابن ہشام ص ۲۹۳ ج ۱

[2] ماخوذ از بخاری شریف ص ۵۵۴

[3] ان کے حالات آئندہ آئیں گے زیر عنوان متعلقین کی آمد حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔

[4] غلام شاب، ثقف لقن (بخاری شریف ص ۵۵۳)

[5] مگر آقاؤں کے آقا۔ بیر معونہ کے حادثہ میں ان کو شہید کر دیا گیا۔ قاتلوں کے سردار عامر بن طفیل نے لوگوں سے دریافت کیا یہ لاش کس کی ہے؟ میں نے دیکھا کہ اس کو اٹھا کر آسمان کی طرف لیجایا گیا۔ پھر احتیاط سے نیچے اتارا گیا اور رکھ دیا گیا۔ (بخاری شریف ص ۵۸۷)

اس کی معقول اجرت ہوتی تھی۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے قبیلہ بنی ویل کے ایک شخص کو جس کا نام عبد اللہ بن اریقد تھا (اور عبد اللہ بن اریقط بھی کہلاتا تھا) اس خدمت کے لئے طے کر لیا تھا۔

یہ مسلمان نہیں تھا بلکہ مشرکین مکہ کا ہم مسلک تھا۔ عاص بن وائل سہمی کے خاندان کا حلیف تھا۔ یہ تو نہیں معلوم کہ اجرت کیا طے ہوئی تھی البتہ ان دونوں بزرگوں کو اس پر پورا اطمینان تھا[1] یہاں تک کہ دونوں سانڈنیاں اس کے حوالے کر دی تھیں اور بتادیا تھا کہ تین رات گزرنے کے بعد وہ چوتھے دن صبح سویرے غار ثور میں پہنچ جائے۔

یہ خریت وعدہ کے مطابق ٹھیک وقت پر پہنچا اور یہ حضرات سوار ہو کر روانہ ہو گئے۔ خریت نے سیدھا راستہ چھوڑ کر ساحل سمندر کا راستہ اختیار کیا جو چکر کاٹ کر مدینہ پہنچتا تھا۔ ایک ہفتہ بعد ۱۲ ربیع الاول[2] کو پیر[3] کے دن یہ مقدس قافلہ منزل مقصود پر پہنچا۔

باہوش و باتدبیر رفاقت

غار ثور سے روانہ ہوئے تو تمام رات چلتے رہے۔ اگلے دن دوپہر کا وقت ہو گیا، دھوپ تیز ہو گئی۔ اس کھلے ہوئے لق و دق میدان میں پتھر کی چٹان کے نیچے کچھ سایہ تھا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اس کو غنیمت سمجھا۔ میں چٹان پر پہنچا۔ آنحضرت ﷺ کو ساتھ لے گیا۔ میرے ساتھ ایک فروۃ چمڑے کا بستر تھا۔ میں نے اس کو سایہ میں بچھا دیا اور اپنے آقا (آقاء دوجہاں) کو اس پر لٹا دیا۔

پھر میں نے نظر دوڑائی تو ایک چرواہے کو دیکھا جو بکریوں کے چھوٹے سے گلہ کو ہکاتے ہوئے اس طرف لا رہا تھا۔ اور وہ بھی اس چٹان کے سایہ میں آرام کرنا چاہتا تھا۔ میں اس کے پاس پہنچا اور دریافت کیا یہ بکریاں کس کی ہیں؟ تمہارا کون مالک ہے؟ چرواہے نے ایک شخص کا نام لیا۔ جس کو میں جانتا تھا میں نے دریافت کیا کہ کیا کوئی بکری دودھ دیتی ہے اور کہا تم دودھ دے سکتے ہو؟ اس نے اقرار کیا۔ چنانچہ وہ ایک بکری پکڑ کر لے آیا۔ میں نے کہا پہلے تم بکری کے تھن پونچھ کر صاف کرو، پھر اپنے ہاتھ صاف کرو، پھر دودھ نکالو۔ اس نے میری فرمائش پر عمل کیا۔ اور تھوڑا سا دودھ دوھ کر مجھے دیا۔

میں نے آنحضرت ﷺ کے لئے ایک چھاگل میں پانی رکھ چھوڑا تھا اس کے منہ پر کپڑا باندھ رکھا تھا

---

[1] اطمینان کا سبب بظاہر یہ حلف ہی تھا۔ اس کی تفصیل مقدمہ میں ملاحظہ ہو۔ زیر عنوان معاہدات

[2] ابن سعد ابن ہشام وغیرہ

[3] عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے: آنحضرت ﷺ کی ولادت پیر (دوشنبہ) کے روز ہوئی۔ پیر ہی کو نبوت عطا ہوئی، پیر کے دن ہی مکہ معظمہ سے روانہ ہوئے اور پیر کے دن ہی مدینہ منورہ میں رونق افروز ہوئے۔ (مسند احمد) ابن سعد اور ابن ہشام وغیرہ نے بھی پیر کا دن ہی بیان کیا ہے لیکن تقویم سنہ عیسوی و سنہ ہجری کے لحاظ سے یکم ربیع الاول پیر کے دن ہوتی ہے تو ۱۲ ربیع الاول کو پیر کا دن نہیں ہوتا بظاہر تقویمات کا فرق ہے۔

کہ گرد وغبار نہ پڑے۔ میں نے دودھ میں اتنا پانی ڈالا کہ تلی تک تمام دودھ ٹھنڈا ہو گیا(دودھ کی لسی بنالی) پھر میں نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ نے نوش فرمایا۔ میرا جی خوش ہو گیا۔ [1]

راستہ کی مختصر سرگزشت

وَاللّٰہُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (المائدہ۔۶۷)(اور اللہ آپ کی حفاظت کرے گا لوگوں سے)

آیت کا نزول اگرچہ بعد میں ہوا مگر حفاظت خداوندی کا عجیب وغریب ظہور اس سفر میں ہو چکا تھا۔ سراقہ بن مالک بن جعشم [2] کا واقعہ اس کی مثال ہے۔ یہ قبیلہ بنی مدلج کا ایک شیخ تھا۔ اعلانچی اس کے یہاں بھی پہنچے تھے اور یہ اعلان اس نے بھی سنا تھا جو قریش نے آنحضرت ﷺ اور آپ کے رفیق سفر کے گرفتار کرنے یا قتل کرنے والے کے متعلق کیا تھا۔ سراقہ بیان کرتے ہیں کہ میں قبیلہ میں ایک چوپال میں بیٹھا ہوا تھا کہ کچھ آدمیوں نے آکر کہا کہ سمندر کے کنارے جاتے ہوئے کچھ آدمیوں کی پرچھائیاں سی نظر آئی ہیں، ہمارا خیال ہے کہ محمد اور اس کے ساتھی ہیں۔(ﷺ)

سراقہ کہتے ہیں کہ میرے ذہن میں بھی یہی آیا کہ ان کا خیال صحیح ہے۔ مگر اس شوق میں کہ سارا انعام تنہا میں حاصل کرلوں میں نے ان کی بات ٹال دی۔ میں نے کہا کہ محمد یہاں کہاں؟ فلاں فلاں آدمی ہمارے سامنے سے گزرے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہونگے۔ خبر دینے والوں نے میری بات مان لی۔ کسی اور نے کچھ خیال نہیں کیا۔ میں تھوڑی دیر وہاں بیٹھا رہا پھر خاموشی سے اٹھا اپنے مکان میں گیا۔ باندی سے کہا میری گھوڑی ٹیلے کے پیچھے چر رہی ہے اس کو لے آ اور تیار کردے۔ میں نے بھی ضروری سامان ٹھیک کر لیا۔ پھر میں نے نیزہ لیا اور اس خیال سے کہ لوگ نیزہ دیکھ نہ لیں، اسکی بھال ہاتھ میں لی اور پھولی زمین پر ڈال کر کھینچتا ہوا چلا اور مکان کی پشت کی طرف سے نکل کر گھوڑی پر سوار ہو گیا۔ وہ کبھی دلکی اور کبھی پویا دوڑتی ہوئی مجھے لے چلی۔ یہاں تک کہ میں آنحضرت ﷺ کے قریب پہنچ گیا۔ اچانک گھوڑی کے ٹھوکر لگی اور میں زمین پر آرہا۔ میں فوراً اٹھا میرے ترکش میں فال معلوم کرنے والے تیر تھے۔ میں نے ان کو نکالا اور میں نے یہ معلوم کرنا چاہا کہ میں ان کو نقصان پہنچاسکوں گا یا نہیں۔ اتفاق سے میری مرضی کے خلاف فال نکلی۔ مگر میں نے اس کا خیال نہیں کیا۔ میں نے فال کے فیصلہ سے بغاوت کی۔ پھر گھوڑے پر سوار ہوا اور اس کو تیز دوڑادیا اور اتنے قریب پہنچ گیا کہ آنحضرت ﷺ کی تلاوت کی آواز میرے کانوں میں آنے لگی

آنحضرت ﷺ تلاوت کلام اللہ میں مشغول تھے۔ آپ کسی اور طرف دھیان قطعاً نہیں دے رہے

---

[1] بخاری شریف ص ۵۵۶ وص ۳۳۰ وغیرہ

[2] ماخوذ از بخاری شریف ص ۵۵۶

تھے۔ البتہ ابو بکر رضی اللہ عنہ دائیں بائیں سب طرف دیکھتے ہوئے چل رہے تھے۔

جب میں اتنے قریب پہنچ گیا تو دفعتہ میری گھوڑی کے پاؤں گھٹنوں تک زمین میں دھنس گئے اور میں نیچے گر گیا۔ میں اٹھا میں نے گھوڑے کو اٹھایا اس کو ڈانٹا، اس کے پیر زمین سے بڑی مشکل سے نکلے۔ ساتھ ساتھ پیروں کی جگہ سے دھوئیں کی طرح غبار نکلا جو آسمان کی طرف چڑھ رہا تھا۔ اب میں نے پھر فال نکالی۔ اس مرتبہ بھی فال میری مرضی کے خلاف ہی نکلی۔ تو میں نے ہمت ہار دی، فال کی مخالفت نہیں کی اور میرے دل میں یہ بات جم گئی کہ محمد رسول اللہ (ﷺ) ضرور کامیاب ہونگے میں نے وہیں سے پکار کر کہا: میں آپ صاحبان سے امن چاہتا ہوں۔

یہ حضرات ٹھہرے۔ میں نے ان کے قریب جا کر قریش کی تمام باتیں جو اب تک کر چکے تھے اور جو وہ آئندہ کرنے والے تھے ان کو سنا دیں۔ میں نے آپ کی خدمت میں کچھ ناشتہ اور کچھ سامان پیش کرنا چاہا مگر میری پیش کش ان حضرات نے منظور نہیں فرمائی۔

میں نے یہ بھی [1] عرض کیا کہ میرے اونٹ آپ کو راستہ میں ملیں گے ان کے ساتھ چرواہے بھی ہیں۔ میں اپنا تیر دیئے دیتا ہوں یہ ان کو دکھا دیں اور جتنے دودھ کی ضرورت ہو آپ ان سے لے لیں۔ مگر ان حضرات نے میری کوئی پیش کش منظور نہیں فرمائی۔ صرف ایک فرمائش کی کہ کسی کو ہماری خبر نہ کرنا۔ میں نے وعدہ کیا اور ساتھ ہی یہ بھی درخواست کی کہ میرے لئے امن کا پروانہ لکھ دیں۔

آنحضرت ﷺ نے عامر بن فہیرہ کو حکم فرمایا انہوں نے چمڑے کے ایک ٹکڑے پر پروانہ امن لکھ کر سراقہ کو دے دیا۔ پھر یہ حضرات مدینہ کی طرف روانہ ہوگئے اور سراقہ مکہ کی طرف واپس ہوا۔

سراقہ نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ راستہ میں جو ملتے رہے ان کو اطمینان دلا کر واپس کرتا رہا کہ میں دور تک دیکھ آیا ہوں اس طرف کوئی نہیں ہے۔ اس طرح بقول حضرت انس رضی اللہ عنہ سراقہ بن مالک بن جعشم کی مختصر روائداد یہ ہے کہ صبح کے وقت حملہ آور، شام کے وقت محافظ۔ [2]

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے ملاقات اور پیش کش:

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا عجیب کرشمہ ہے کہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے اپنا نطاق چاک کر کے اس میں ناشتہ دان اور مشکیزہ باندھا تھا۔ ان کے شوہر حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں خلعت پیش کیا۔ (جس کی تفصیل یہ ہے)

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھ کچھ اور تاجر بسلسلہ تجارت شام گئے تھے وہاں سے واپس ہو رہے تھے کہ راستہ میں ان مقدس مہاجرین سے ملاقات ہوگئی۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے سفید کپڑے کا

---

[1] بخاری شریف ۵۵۶

[2] بخاری شریف ص ۵۵۴ '

جوڑا آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش کیا اور ایک جوڑا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو پہنایا۔[1] ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس قافلہ میں حضرت عمر، حضرت طلحہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ واپسی کے وقت حضرت زبیر رضی اللہ عنہ آگے آگئے تھے جب مدینہ کے قریب پہنچے تو باقی حضرات سے ملاقات ہوئی۔ وہاں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے بھی ان دونوں حضرات کی خدمت میں جوڑے پیش کئے۔

یثرب میں ورود مسعود

وَقُل رَّبِّ اَنزِلۡنِیۡ مُنزَلًا مُّبٰرَكًا وَّ اَنۡتَ خَیۡرُ الۡمُنۡزِلِیۡنَ (سورہ مومنون۔۲۹)

”کہو! اے میرے پروردگار مجھے برکت کے ساتھ اتار اور تو بہتر اتارنے والا ہے“

یا معشر العرب هذا جدکم الذی تنتظرون الله اکبر جاء محمد الله اکبر جاء محمد ﷺ

تذکرہ سیدنا نوح علیہ السلام کے ضمن میں اس دعا کی تلقین مکہ معظمہ میں ہوئی تھی۔ آنحضرت ﷺ اس کی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ آج آپ کے حق میں اس کی مقبولیت ظاہر ہو رہی ہے جبکہ معصوم بچیوں کے معصوم جزبات اس ترانہ سے آپ کا استقبال کر رہے ہیں:

طلع البدر علینا من ثنیات الوداع

وجب الشکر علینا ماد عالله داع

” ثنیات[2] الوداع سے چودھویں کا چاند طلوع ہوا، ہم پر اللہ کا شکر واجب ہو گیا جب تک کوئی دعا کرنے والا دعا کرے (ہمیشہ ہمیشہ کے لئے)

مدینہ میں روانگی کی خبر :

ڈاک کا سلسلہ اس وقت نہیں تھا مگر آنے جانے والوں کے منہ زبانی خبریں پہنچ جاتی تھیں۔ مشتاقان دیدار کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ ان کا محبوب مکہ معظمہ سے نکل چکا ہے۔ اب انتظار کے دن اور گھڑیاں گنی جا رہی تھیں۔ طلوع آفتاب سے بہت پہلے، پو پھٹنے کے وقت لوگ اٹھتے اور مدینہ سے باہر حرہ[1] پہنچ کر آفتاب رسالت کے طلوع ہونے کا انتظار کرنے لگتے۔ اسی انتظار میں دوپہر ہو جاتا۔ مسافروں کی آمد کا وقت ختم ہو جاتا تو مرجھائے دلوں کو بے تاب سینوں میں دبائے ہوئے واپس ہو جاتے۔ ایک روز اسی

---

[1] فتح الباری ص ۱۹۳ ج ۷

[2] ثنیہ: گھاٹی اور وداع کے معنٰی ہیں رخصت کرنا۔ چونکہ لمبا سفر کرنے والوں کو رخصت کرنے کے لئے اہل یثرب یہاں تک آیا کرتے تھے اس لئے یہ نام پڑ گیا (معجم البدان)

[1] بخاری شریف ص ۵۵۵

پژمردگی اور افسردگی کے ساتھ واپس ہوئے تھے کہ ایک آواز نے عورتوں اور بچوں تک کو وارفتہ مسرت بنادیا۔

یامعاشر [2] العرب ھذا جدکم الذی تنتظرون

ایک یہودی اپنی کسی ضرورت سے ایک پرانے قلعہ کی اونچی اٹاری پر چڑھا تھا اس کی نظر چند سفید پوش سواروں پر پڑی جو اس طرف چلے آرہے تھے۔ اس کے دل نے گواہی دی کہ انتظار کرنے والوں کی مراد پوری ہوگئی۔ یہ خود بے تاب نہیں تھا مگر انتظار کرنے والوں کی بیتابی کا اس پر یہ اثر تھا کہ خود قابو میں نہ رہا اور زور سے چیخ اٹھا۔

"اہل عرب ! یہ ٹھیک تمہارے وہی مہمان آگئے جن کا تمہیں انتظار ہے۔"

اہل قبا کی خوش نصیبی تھی کہ یہ آواز ان کے کانوں میں پڑی۔ اب کوئی کیا بتائے جاں بازوں، جاں نثاروں اور فداکاروں کا کیا حال تھا۔ وہ کس بے تابی سے دوڑے اور حرہ پہنچ کر کس طرح رحمتہ اللعالمین ﷺ کے زیر پا اپنی آنکھیں بچھائیں۔ نظر اشتیاق کو فرش راہ بنایا۔ قبیلہ بنی عمرو بن عوف جو اوس کا بطن تھا [3] یہاں آباد تھا۔ یہ خوش نصیب اسی قبیلہ [4] کے لوگ تھے جنہوں نے یہودی کی آواز سنی اور دوڑے۔ [5]

عرب کا دستور تھا کہ معزز مہمانوں کا استقبال ہتھیاروں سے آراستہ ہو کر کیا کرتے تھے۔ اس بے تابی میں انہوں نے اپنی اس آن کو نہیں چھوڑا پہلے ہتھیاروں کی طرف لپکے پھر استقبال کو دوڑے۔

حرہ سے آنحضرت ﷺ نے دہنی طرف رخ کیا [6] اور پھر پورے مجمع کے ساتھ قبیلہ بنی عمرو بن عوف میں رونق افروز ہوگئے۔ لوگ آنے شروع ہوئے وہ اپنے قاعدہ سے سلام کرتے تھے اور بیٹھ جاتے تھے۔ سید الکونین ﷺ خاموش تشریف فرما تھے۔ رفیق سفر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کھڑے تھے اور آنے والوں کا استقبال کر رہے تھے۔ جنہوں نے آنحضرت ﷺ کو پہلے نہیں دیکھا تھا وہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہی کو سلام کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ آنحضرت ﷺ پر دھوپ آگئی تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے سر مبارک پر اپنی چادر سے سایہ کر لیا، تب لوگ پہچان سکے کہ خادم کون ہے اور مخدوم کون۔ [1]

---

[2] اے اہل عرب یہ آگئے تمہارے آقا، جن کا تم انتظار کر رہے تھے۔

[3] فتح الباری ص ۱۹۴۔

[4] طبقات ابن سعد ص ۱۵۸ ج ۱۔

[5] فثار المسلمون الی السلاح۔ بخاری شریف ص ۵۵۲۔

[6] بخاری شریف ص ۵۵۵۔

[1] ایضاً ص ۵۵۵۔

آرام گاہ اور نشست گاہ:

کلثوم بن ھدم قبیلہ کے بڑے آدمی تھے، یہ شرف ان کو حاصل ہوا کہ آپ نے قیام [2] ان کے یہاں فرمایا۔

دوسرے صاحب سعد بن خثیمہ رضی اللہ عنہ تھے۔ ان کا مکان خالی تھا۔ ان کے متعلقین نہیں تھے۔ مکہ سے جو صحابہ رضی اللہ عنہ اس طرح کے آتے تھے وہ بھی انہیں کے یہاں ٹھہرتے تھے۔ اس لئے اس مکان کو بیعت العزاب [3] کہا جانے لگا۔ یہ مکان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نشست کے لئے طے کیا گیا [4]۔ تلقین و تذکیر بھی یہیں فرماتے تھے۔ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سنح میں قیام فرمایا [5]۔ یہ پیر کا دن تھا [6] جس روز آفتاب رسالت مدینہ کے خط استواء پر پہنچا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امانتیں پہنچانے کے لئے مکہ معظمہ چھوڑا تھا، تین دن بعد وہ بھی تشریف لے آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قیام کیا۔ [7]

حق پرستوں کا اعتراف حق

سرزمین یثرب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا خطاب

حصین بن سلام ایک یہودی عالم تھے۔ مطالعہ نہایت وسیع، طبیعت انصاف پسند، اور اپنی قوم کے معزز سردار تھے۔ جو بشارتیں یہود کی کتاب میں پڑھی تھیں ان کی بنا پر آنے والے نبی کے منتظر تھے۔ یہ

---

[2] اکثر صحابہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے مدینہ آچکے وہ بھی انہیں کے یہاں اترے تھے۔ چنانچہ حضرت ابوعبیدہ الجراح، حضرت مقداد بن اسود، حضرت خباب، حضرت سہیل، حضرت صفوان، حضرت عیاض، حضرت عبد اللہ بن مخرمہ، حضرت وہب بن سعد، حضرت معمر بن ابی سرح، حضرت عمیر بن عوف رضوان اللہ علیہم اجمعین اب تک انہیں کے مہمان تھے۔ (ابن سعد تذکرہ کلثوم بن ھدم) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے چندماہ بعد ان کی وفات ہوگئی (رضی اللہ عنہ) محمد بن الحسن بن زبالہ نے اخبار المدینہ میں وثوق سے بیان کیا ہے کہ کلثوم بن ھدم اس وقت تک مشرک ہی تھے مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ (فتح الباری ص ۱۹۴ ج ۷ وفاء الوفاء ص ۱۷۴ ج ۱) اگر یہ صحیح ہے تو اس سے اہل مدینہ کی معاشرت کا پتہ چلتا ہے کہ مذہبوں کے فرق کے باوجود آپس میں تعاون مکمل تھا۔

[3] عزاب: عازب کی جمع ہے۔ اس شخص کو کہتے ہیں جس کے بیوی نہ ہو۔

[4] ابن سعد ص ۱۵۸ ج ۱ و ابن ہشام ص ۲۹۶ ج ۱

[5] خبیب بن یساف خزرجی یا خارجہ بن زید خزرجی کے یہاں۔ (ابن ہشام ص ۲۹۶ ج ۱)

[6] تاریخوں میں بہت اختلاف ہے۔ اگر مکہ معظمہ سے روانگی یکم ربیع الاول کو پیر کے دن ہوئی تھی جیسا کہ راقم الحروف نے لکھا ہے، تو اس پیر کو ربیع الاول کی پندرہ ہوگی۔ خبر المدینہ ابن زبیر نے ابن شہاب (زہری) سے یہی روایت نقل کی ہے کہ نصف ربیع الاول (۱۵ ربیع الاول) کو تشریف آوری ہوئی (فتح الباری ص ۱۹۴ ج ۷)

[7] ابن ہشام ص ۲۹۶ ج ۱

اپنے باغ میں کام کر رہے تھے کہ خبر سنی: اللہ کے نبی تشریف لے آئے۔ [1]

فوراً کام چھوڑ کر نبی کی زیارت کے لئے دوڑے۔ جیسے ہی چہرہ مبارک پر نظر پڑی دل نے شہادت دی۔

انہ لیس بوجہ کذاب "جھوٹے آدمی کا چہرہ تو نہیں ہے"

آپ فرماتے ہیں: کان اول شیءتکلم بہ ان قال یاایھاالناس افشوالسلام واطعموالطعام وصلوا والناس نیام تدخلوالجنۃ بسلام (ترمذی شریف ص ۷۱ ج ۲)

"سب سے پہلے جو بات آپ نے فرمائی وہ یہ تھی کہ اے لوگو سلام کا رواج عام کرو، (پھیلاؤ) کھانا کھلاؤ، اور اس وقت نماز پڑھو جب لوگ سو رہے ہوں۔ اطمینان سے جنت میں داخل ہو جاؤ۔"

یہی حصین بن سلام ہیں جن کا اسلامی نام عبد اللہ بن سلام ہے۔ رضی اللہ عنہ۔ ان کا سلسلہ نسب حضرت یوسف علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ [2]

قبا سے مدینہ منورہ

جمعہ [1] کے روز صبح سویرے مدینہ کے حضرات آراستہ ہوئے، تلواریں سجائیں اور آقاءِ دوجہان کو اپنے

---

[1] بخاری شریف کی روایت ص ۵۵۶ کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ قبا میں نہیں بلکہ مدینہ میں حاضر خدمت ہوئے جب آنحضرت ﷺ نے حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے یہاں قیام فرمایا: مگر بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے استاد ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے تصریح کی ہے کہ آپ قبا میں قبیلہ بنی عمرو بن عوف میں تھے اس وقت عبد اللہ بن سلام حاضر ہوئے۔ (سیرۃ ابن ہشام ص ۱۳۰ ج ۱)۔ اس لئے ہم نے اس واقعہ کو اس موقع پر ذکر کر دیا حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ کے یہاں پہنچنے پر دوسرا واقعہ ہوا۔ بخاری کے راوی صاحبان نے ان دونوں کو ایک ساتھ ذکر کیا تو اشتباہ ہو گیا کہ یہ واقعہ بھی حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ کے یہاں قیام کے دوران ہوا۔ مگر حقیقت یہ نہیں ہے ابن اسحاق کی روایت جو صرف ایک واسطہ سے ہے وہ یہ ہے کہ حضرت عبد اللہ بن سلام مسلمان ہو گئے تو انہوں نے چاہا کہ یہود کی افتراپردازی اور غلط بیانی کا تجربہ آنحضرت ﷺ کو کرا دیں۔ چنانچہ ابھی عبد اللہ بن سلام کے اسلام لانیکی شہرت نہیں ہوئی تھی کہ حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے اصرار پر آنحضرت ﷺ نے یہود کے نمائندگان کو بلا کر دریافت کیا کہ حصین بن سلام کیسے آدمی ہیں انہوں نے بہت تعریف کی اور کہا کہ سید بن سید اعلم بن اعلم اور ہم میں سب سے بہتر ہےں لیکن جیسے ہی ان یہودی علماء کو معلوم ہوا کہ وہ مسلمان ہو چکے تو فوراً پلٹ گئے اور اسی مجلس میں کہہ دیا کہ یہ بھی جھوٹے ان کے باپ بھی جھوٹے یہ بھی بدترین انسان ہیں اور ان کے باپ بھی بدترین انسان تھے۔ (ابن ہشام و بخاری شریف وغیرہ)

[2] الاصابہ

[1] مدت قیام میں اختلاف ہے۔ چار روز، چودہ روز، اٹھارہ روز اور ۲۴ روز تک کی روایتیں ہیں۔ لیکن اس پر اتفاق ہے کہ قبا سے روانگی جمعہ کے روز ہوئی اور تشریف آوری پیر کے روز ہوئی تھی۔ اور اس پر بھی اتفاق ہے کہ قبا اور مدینہ دنون جگہ نزول اجلال ربیع الاول کے مہینہ میں ہوا تو بظاہر تاریخوں کا تعین اس طرح ہوتا ہے کہ دولت کدہ سے روانگی یکم ربیع الاول دوشنبہ

یہاں لانے کے لئے قبا پہنچ گئے۔

کچھ دن چڑھا تو تاجدار دوعالم اناقہ قصواء[2] پر سوار ہوئے۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو ساتھ[3] بٹھایا (ردیف بنایا) تقریباً پانچ[4] مسلح انصار کی دو صفیں دائیں بائیں ہو گئیں۔

راستہ پر زیارت کرنے والے مردوں کا اور کوٹھوں اور چھتوں پر خانہ نشین خواتین کا ہجوم تھا، جو مسلمان نہیں ہوئے تھے وہ بھی دیدار کے لئے بیتاب تھے۔ لڑکے اور بچے جوش مسرت میں نعرہ لگارہے تھے۔

اللہ اکبر جاء محمد اللہ اکبر جاء محمد[5]

یثرب اور اہل یثرب کے لئے اس سے زیادہ مسرت کا دن کونسا ہو سکتا ہے؟ آج آسمان نبوت کا آفتاب زمین یثرب پر اتر رہا ہے۔ آج وہ نبی رونق افروز ہو رہا ہے جس کی بشارتیں کتب سابقہ کے صفحات میں اور اہل کتاب کی زبانوں پر عرصہ سے تھیں۔ آج ہر طرف یہی صدا ہے یہی چرچا ہے، جاء نبی اللہ جاء نبی اللہ[6]، اللہ کے نبی آگئے اللہ کے نبی آگئے۔

قبیلۂ بنی سالم تک پہنچے تھے کہ نماز کا وقت ہو گیا۔ آپ نے جمعہ کی نماز یہیں ادا فرمائی[7]۔ نماز جمع کے بعد آپ سوار ہونے لگے تو قبیلہ والوں نے مہار تھام لی اور اصرار کیا کہ آپ یہیں قیام فرمائیں۔ اس کے بعد حضرات انصار (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کا جو قبیلہ بھی آتا[8] رہا یہی اصرار کرتا رہا کہ غریب خانہ کو دولت خانہ بنائیے۔ مکان حاضر ہے، مال حاضر ہے، جان حاضر ہے۔ لیکن وہ رؤف رحیم جس کا دامن شفقت ہر ایک کے لئے پھیلا ہوا تھا، جس کو کسی کی دل شکنی گوارا نہیں تھی جس طرح اس کا پورا سفر غیبی اشاروں پر ہوا

کے روز غار ثور سے روانگی ۴ربیع الاول پنج شنبہ، قبا میں تشریف آوری ۱۵ ربیع الاول پیر کے روز مدینہ منورہ میں تشریف آوری ۲۶ ربیع الاول یوم جمعہ، واللہ اعلم بالصواب

[2] یہ وہی ناقہ ہے جس پر آپ نے سفر ہجرت طے فرمایا تھا (ابن سعد)

[3] بخاری شریف ص۵۵۶ و ص۵۶۰

[4] فتح الباری ص۱۰۶ ج۷ بحوالہ تاریخ صغیر للبخاری والبدایہ والنہایہ ص۱۹۷ ج۳ بحوالہ مسند احمد

[5] البدایہ والنہایہ ص۱۹۷ ج۳

[6] بخاری شریف ص۵۵۶۔۵۶۰

[7] ابن سعد ص۱۶۰ ج۱ انے نمازیوں کی تعداد سو لکھی ہے۔ لیکن تاریخ بخاری اور مسند احمد کی روایتوں کے بموجب اگر استقبال کے لئے جانے والوں کی تعداد پانچ سو تھی تو ظاہر ہے نماز جمعہ میں یہ سب ہی شریک ہوئے ہونگے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

[8] وفاء الوفا میں ان قبائل کی تفصیل ہے اور جو گفتگو ہوتی رہی وہ بھی نقل کی گئی ہے (ص۱۸۴ و ۱۸۵ ج۱)

تھا۔ ❶ اس کے ارحم الرحمین رب نے یہاں بھی ایسی صورت کر دی کہ رحمۃ اللعالمین ﷺ کی طرف سے کسی کی دل شکنی نہ ہو۔ آپ نے خود ہی ناقہ کی مہار چھوڑ دی اور اصرار کرنے والوں سے بھی یہی فرمایا کہ وہ مہار چھوڑ دیں۔ یہ ناقہ ❷ مامور ہے جہاں بیٹھ جائے گی وہیں قیام ہو گا۔

ناقہ چلتی رہی یہاں تک کہ قبیلہ بنی نجار آ گیا۔ اس قبیلہ میں جب ناقہ اس جگہ پہنچی جہاں مسلمان نماز پڑھا کرتے تھے تو ناقہ بیٹھ گئی۔ آپ نے فرمایا ھذا انشاء اللہ منزل ❸ ۔ "یہیں انشاء اللہ قیام ہو گا۔ (مکان بنے گا)

ابھی آپ اترے نہیں تھے کہ ناقہ کھڑی ہو گئی۔ کچھ چلی۔ پھر آ کر اسی جگہ بیٹھ گئی اور اپنی گردن زمین پر پھیلا دی۔ ❹

بنی نجار کو یہ سعادت میسر آئی تو بچہ بچہ کے دل کی کلی کھل گئی۔ لڑکیوں نے فوراً ایک شعر موزوں کر لیا۔

نحن جوار من بنی نجار   یاحبذا محمد من جار

"ہم بنی نجار کی لڑکیاں ہیں یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ محمد ﷺ ہمارے پڑوسی بنے۔ محمد کیسے اچھے پڑوسی ہیں۔ کس قدر عجیب بات ہے کہ محمد ﷺ ہمارے پڑوسی ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے ازراہ شفقت فرمایا: تمہیں مجھ سے محبت ہے؟"

---

❶ پہلے گزر چکا ہے کہ صحابہ کرام ہجرت کر رہے تھے مگر آنحضرت ﷺ کے حکم کے منتظر تھے اور جب من جانب اللہ اجازت ہو گئی تو آپ فوراً دوپہر ہی میں حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے یہاں پہنچے اور فرمایا کہ مجھے اجازت ہو گئی ہے۔ فوراً ہی روانگی کا پروگرام بنا لیا اور پھر یہ سفر ہی نہیں بلکہ دار ہجرت کا تعین بھی الہام ربانی سے ہوا تھا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

❷ ابن سعد ص ۱۶۰ ج ۱ و فتح الباری ص ۱۹۶ ج ۷ علامہ شبلی کو یہ بات عجیب معلوم ہوئی۔ آپ نے یہ واقعہ حذف کر دیا۔ میزبانی کے سلسلہ میں جو بحث ہوئی تھی صرف اس کا ذکر فرمایا کہ قرعہ ڈالا گیا اور آخر یہ دولت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آئی۔ اور حاشیہ میں ناقہ کے واقعہ کی تردید کرتے ہوئے مسلم شریف کی ایک حدیث سے استدلال کیا جس میں راوی نے بہت اختصار سے کام لیا ہے اور لطف یہ ہے کہ قرعہ اندازی کا تذکرہ فقد منا المدینہ لیلاً، علامہ نے اس کو نظر انداز فرما دیا۔ علامہ نے مسلم شریف کے باب الہجرۃ کا حوالہ دیا ہے حالانکہ مسلم شریف میں باب الہجرۃ کوئی نہیں۔ اس کا عنوان حدیث الہجرۃ ہے اور علماء محدثین کی اصطلاح میں اس کو حدیث الرجال بھی کہا جاتا ہے۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے جلد ثانی کے آخر میں اس کو نقل کیا ہے۔ ص ۴۱۹ ج ۲ اور واقعہ یہ ہے کہ بسلسلہ قیام چند مرحلے پیش آئے تھے۔ مثلاً سب سے پہلے قبیلہ کا انتخاب، پھر قبیلہ میں وہ جگہ جہاں آنحضرت ﷺ مستقل قیام فرمائیں۔ جہاں مکان بنایا جائے یا مسجد بنائی جائے۔ پھر مکان بننے تک عارضی قیام، عارضی قیام کے بعد کھانے وغیرہ کا انتظام۔ اصطبل کا انتخاب جہاں سواری رکھی جائے۔ ان تمام مرحلوں پر بحث ہوئی اور ہر ایک جاں نثار نے سعادت حاصل کرنی چاہی۔ بحث کے بعد معاملہ طے ہوا کبھی قرعہ سے بھی، الہام ربانی سے، کبھی کسی اور صورت سے آئندہ سطور میں یہ تمام مراحل ترتیب وار بیان کئے گئے ہیں۔ وللہ الحمد

❸ بخاری شریف ص ۵۵۵

❹ ابن ہشام ۲۹۸ ج ۱

سب نے یک زبان ہو کر کہا: ای واللہ یا رسول اللہ (ہاں خدا کی قسم یا رسول اللہ)

ارشاد ہوا: [1]

انا واللہ احبکم انا واللہ احبکم انا واللہ احبکم

"خدا کی قسم مجھے بھی تم سے محبت ہے خدا کی قسم مجھے بھی تم سے محبت ہے خدا کی قسم مجھے بھی تم سے محبت ہے۔"

اب قیام کا مسئلہ پیش ہوا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ہمارے رشتہ داروں [2] میں کسی کا مکان قریب ہے۔ یہ خوش نصیبی حضرت خالد بن زید [3] ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کو میسر تھی۔ آپ فوراً بول اٹھے:

انا یا نبی اللہ ھذہ داری وھذا بابی (میں حاضر ہوں یا رسول اللہ یہ میرا مکان ہے یہ میرا دروازہ ہے)

عجیب بات یہ ہے کہ حضرات انصار نے آپس میں قرعہ ڈالا کہ حضور ﷺ کا قیام کس کے یہاں ہوگا؟ اس میں بھی حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ ہی کا اسم گرامی بر آمد [4] ہوا تھا۔

قیام کا مسئلہ طے ہو گیا تو ارشاد ہوا:

فانطلق فھیٔ لنا مقیلا [1] "تشریف لے جایئے ہمارے قیلولہ کا انتظام کیجئے۔"

حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ نے اندر جا کر آرام فرمانے کا انتظام کیا پھر ان کو لے گئے اور آرام کرایا۔ [2]

---

[1] البدایہ والنہایہ ص ۲۰۰ ج ۳ بحوالہ بیہقی

[2] بخاری شریف ص ۵۵۶ چونکہ آنحضرت ﷺ کے دادا عبد المطلب کے ننہیالی رشتہ دار اسی قبیلہ کے تھے تو آپ نے یہ فرمایا: " ای بیوت اھلنا اقرب" ہمارے رشتہ داروں میں سے کس کا مکان قریب ہے۔ اس وقت آقا دو جہان کی زبان مبارک سے قرابت و رشتہ داری کا اظہار ان رشتہ داروں کے لئے بہت بڑا اعزاز تھا جیسا کہ مسلم کی روایت میں ہے۔ آپ نے اس کا اظہار بھی فرمایا مگر یہ بھی صحیح نہیں کہ ناقہ کا واقعہ پیش نہیں آیا۔ اور آپ نے رشتہ داری کی بنیاد پر بنو نجار کو منتخب فرمایا۔ ورنہ پھر قرعہ اندازی کی بھی ضرورت نہیں تھی جس کو علامہ شبلی نے بہت اہمیت دی ہے۔

[3] اصل نام خالد، پسر زید، کنیت ابو ایوب، یہ اپنی اس کنیت ہی سے مشہور ہیں۔

[4] اصابہ ص ۹۰ ج ۲ بحوالہ احمد علامہ شبلی نے اس روایت کو لے کر ناقہ وغیرہ کے تمام واقعات کو حذف کر دیا جو صحیح احادیث سے ثابت ہیں۔ حالانکہ اس روایت کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمل حضرات انصار نے از خود کیا تھا۔ اور بہت ممکن ہے آنحضرت ﷺ کے یہاں رونق افروز ہونے سے پہلے کیا ہو، کیونکہ روایت میں مدینہ میں تشریف آوری کا ذکر ہے قبیلہ بنو نجار میں رونق افروز ہونے کا ذکر نہیں۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں روی احمد من طریق جبیر بن نضیر۔ عن ابی ایوب قال لما قدم النبی ﷺ المدینۃ اقترعت الانصار ایھم یؤویہ فقرعھم ابو ایوب۔ یعنی حضرات انصار نے خود قرعہ اندازی کی کہ آنحضرت ﷺ کو کون مکان دے گا (کس کے یہاں قیام ہوگا)۔ تو سب کے مقابلہ میں ابو ایوب کا نام قرعہ میں بر آمد ہوا جو حقیقت یہ ہے کہ یہ واقعہ بھی موافقات صحابہ کی ایک مثال ہے۔ یعنی صحابہ کرام نے بھی وہی فیصلہ کیا جو پہلے مشیت خداوندی طے کر چکی تھی۔ بعد کے الہام یا وحی نے اس کی توثیق کر دی۔ واللہ اعلم

[1] بخاری شریف ص ۵۵۶

[2] فتح الباری ص ۲۰۱

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ [3] ہمیشہ خوش ہوا کرتے تھے کہ سید عالم ﷺ حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ کے یہاں جیسے ہی تشریف لے گئے سب سے پہلا ہدیہ میری والدہ کا تھا جو آپ نے خود بھی تناول فرمایا اور حاضرین کو بھی اس میں شریک کیا۔ میری والدہ نے روٹیوں پر گھی لگا کر دودھ میں چورا اور ایک بڑے بادیہ میں بھر کر میرے ہاتھ بھیجا۔ یہ میری سعادت تھی کہ سب سے پہلا یہ ہدیہ یہی پیش ہوا۔ میں نے عرض کیا کہ میری والدہ نے یہ ہدیہ بھیجا ہے تو آپ نے دعا فرمائی: بارك الله فيك (اللہ تعالیٰ تمہیں برکت عطا فرمائے)۔ پھر حاضرین کو بلا کر سب کے ساتھ یہ ہدیہ تناول فرمایا اور ابھی میں دروازہ سے نکلا نہیں تھا کہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے یہاں سے ثرید آ گیا۔ آپ نے اُسے بھی منظور فرمایا۔ پھر اگرچہ آپ مہمان ابو ایوب رضی اللہ عنہ کے تھے مگر روزانہ تین چار انصار کے یہاں سے نمبروار کھانے کا ہدیہ آتا رہتا تھا۔ [4] دستر خوان مبارک پر چار پانچ کھانے والے ضرور ہوتے تھے۔ کبھی پندرہ سولہ بھی ہو جاتے تھے [5]۔

حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ خود بھی کھانا پکواتے، دستر خوان پر اگرچہ شریک طعام نہیں ہوتے تھے مگر جو کھانا آنحضرت ﷺ کے سامنے سے آتا تھا اس کو کھاتے اور خاص اس جگہ سے کھاتے جہاں آقا دو جہاں کی انگلیوں کے نشان معلوم ہوتے تھے۔ [6]

بالائی منزل میں قیام:

حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ کے مکان کی دو منزلیں تھیں۔ آپ نے نیچے کی منزل آنحضرت ﷺ کے لئے خالی کر دی۔ خود اوپر چلے گئے۔ ایک روز اتفاق سے اوپر کی منزل میں پانی کا برتن (گھڑا یا مٹکا) ٹوٹ گیا۔ ابو ایوب رضی اللہ عنہ کو خدشہ ہوا کہ پانی نیچے ٹپکے گا اور تاجدار دو جہان ﷺ کو تکلیف ہو گی، گھر میں ایک لحاف

---

[3] یہ وہی زید بن ثابت ہیں جو آگے چل کر کاتب وحی اور جامع قرآن اور بہت بڑے فقیہ اور ماہر فرائض ہوئے۔ ایسے ذہین کہ سریانی زبان اور سریانی خط پندرہ روز میں لکھ لیا۔ اس وقت ان کی عمر صرف گیارہ سال تھی۔ والدہ محترمہ کا اسم گرامی نوار تھا دختر مالک یہ بھی نجاریہ تھیں (الاصابہ والاستعیاب)

[4] ابن سعد ۱۶۱ ج ۱ خصوصاً حضرت سعد بن عبادہ اور حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کے یہاں سے تو روزانہ طشت بھر کر کھانا آتا تھا۔ وفاء الوفاء ص ۱۹۰ ج ۱

[5] ۲۔ ایضاً

[6] علامہ نوویؒ نے اس حدیث سے چند مسئلے اخذ کئے ہیں: (۱) ہر موقع اور ہر جگہ پر برتن کا صاف کرنا مستحب نہیں بلکہ بچے ہوئے کھانے یا پینے والے برتن میں کچھ چھوڑ دینا مستحب ہے (۲) خصوصاً جب معلوم ہو کہ لوگ اس کو تبرک سمجھ کر کھائیں گے (۳) یا کھانا کم ہو اور دوسرے کھانے والے موجود ہوں (۴) یا جیسا کہ بعض جگہ ہوتا ہے کہ پورا کھانا مہمان کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے اور اہل خانہ بعد میں بچا ہوا کھانا کھاتے ہیں۔ بظاہر حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ کا یہی طریقہ تھا۔ (نووی علی مسلم ص ۱۸۳ ج ۱)

تھا فوراً اسی کو پانی پر ڈال دیا کہ پانی جذب ہو جائے نیچے نہ ٹپکے۔ [1]

ایک روز خیال آیا کہ سردار دو جہان ﷺ نیچے ہیں اور ہم اوپر، کیسی بے ادبی ہے ؟ فوراً ایک کنارے سمٹ گئے اور اسی طرح رات گزار دی۔ صبح کو آنحضرت ﷺ سے درخواست کی کہ اوپر قیام فرمائیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: آنے جانے والوں کو اسی میں آسانی ہے، حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ نے دست بستہ عرض کیا:

لااعلو سقیفةً انت تحتها [2]

"میں تو اس چھت پر چڑھ نہیں سکتا جس کے نیچے حضور والا ہوں۔"

رحمت عالم ﷺ نے درخواست منظور فرمائی اور اوپر منتقل ہو گئے۔ سات ماہ اسی مکان میں قیام رہا، جب مسجد اور حجرے تیار ہو گئے تب آپ وہاں تشریف لے گئے۔ (تفصیل آگے آتی ہے۔ انشاء اللہ)

قصواء کا قیام اور حضرت اسعد رضی اللہ عنہ کا والہانہ جذبہ :

حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ جو بیعت عقبہ اولیٰ میں شریک تھے اور تبلیغی کوششوں میں آنحضرت ﷺ کے فرستادہ معلم حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے شریک رہے تھے، ان کا مکان بہت وسیع تھا۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کا قیام انہیں کے یہاں رہا تھا۔ ان کے علاوہ اور حضرات بھی جو تشریف لاتے تھے ان کے یہاں قیام فرمایا کرتے تھے۔

جب انہوں نے دیکھا کہ آنحضرت ﷺ کا قیام حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ کے یہاں طے ہو گیا ہے تو ناقہ کی مہار پکڑی اور اپنے یہاں لے گئے [3]۔ کہ یہ بھی ایک شرف اور جذبہ شوق کو تسکین دینے والی ایک سعادت تھی۔

متعلقین کی آمد :

مدینہ میں آکر آپ نے حضرت زید بن حارثہ اور حضرت ابو رافع (رضی اللہ عنہم) [1] کو دو اونٹ اور پانچ سو درہم دیکر مکہ بھیجا کہ متعلقین کو لے آئیں۔ صاحبزادیوں میں حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ حبش میں تھیں۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو ان کے شوہر ابو العاص بن ربیع نے آنے نہیں دیا۔ بس

---

[1] وفاء الوفاء ص ۱۸۸ سیرۃ ابن ہشام

[2] مسلم شریف ص ۱۸۳ ج ۲

[3] طبقات ابن سعد ص ۱۶۰ ج ۱

[1] آنحضرت ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے، قبطی تھے۔

حضرت زید رضی اللہ عنہ کے ساتھ ام المومنین حضرت سودہ رضی اللہ عنہا اور دو صاحبزادیاں ام کلثوم رضی اللہ عنہا اور حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا آئیں۔ ان کے علاوہ حضرت زید اپنی اہلیہ ام ایمن اور اپنے فرزند اسامہ رضی اللہ عنہ کو بھی ساتھ لے آئے۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحبزادے حضرت عبد اللہ ❷ کو بھی حضرت زید رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھیجا تھا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے متعلقین کو وہ اپنے ساتھ لائے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی ان کے ساتھ آئیں۔ ان سب کو حارثہ ❸ بن نعمان کے مکان میں ٹھہرایا گیا۔ ❹

نیا دور۔ غیر محدود میدان عمل

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا ۨ الَّذِىْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔

(سورہ الاعراف آیت ۱۵۸)

"اے پیغمبر تم لوگوں سے کہو اے افراد نسل انسانی (اے بنی نوع انسان)! میں تم سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا آیا ہوں۔ وہ خدا کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اسی کے لئے ہے۔"

---

❷ حضرت عبد اللہ بن ابی بکر رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سوتیلے اور حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے حقیقی (ماں شریک) بھائی تھے۔ غزوہ فتح مکہ اور غزوہ حنین میں شریک رہے۔ جب غزوہ حنین کے بعد طائف پر حملہ کیا گیا تو انکے ایک تیر لگا اسکا زخم اوپر سے مندمل ہو گیا۔ مگر اندر اندر پھوڑا بن گیا۔ تقریباً دو سال تک یہ پھوڑا رہا۔ آنحضرت ﷺ کی وفات سے تقریباً سات ماہ بعد شوال سنہ ۱۱ھ میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں پھوڑے کے پھٹنے سے ان کی وفات ہو گئی۔ آنحضرت ﷺ کے کفن کے لئے ایک حلہ لایا گیا تھا یعنی یمن کی بنی ہوئی دھاریدار چادروں کا جوڑا۔ مگر آنحضرت ﷺ کا کفن سفید سوتی کپڑے کا بنایا گیا۔ یہ حلہ کام میں نہیں آیا تو حضرت عبد اللہ نے اپنے کفن کے لئے نو دینار میں خرید لیا تھا۔ لیکن وفات کے وقت وصیت کر دی کہ اس کا کفن نہ بنایا جائے کیونکہ اگر اس کپڑے کا کفن اچھا ہوتا تو آنحضرت ﷺ کا کفن اسی کا ہوتا۔ جب آنحضرت ﷺ کے لئے اس کو منتخب نہیں کیا گیا تو میں بھی اس کو اپنے لئے پسند نہیں کرتا۔ یہ تھا نازک احساس عاشقان اتباع سنت کا۔ رضی اللہ عنہ (الاستیعاب)

❸ حارثہ بن نعمان رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی تھے۔ کسی سائل کو دروازہ سے محروم نہیں جانے دیتے تھے اور جو کچھ دیتے وہ خود اپنے ہاتھ سے دیتے تھے۔ آخر عمر میں بصارت جاتی رہی تھی تو جہاں ان کی نشست رہتی تھی وہاں سے دروازہ تک ایک رسی باندھ لی تھی۔ دروازہ میں کھجوروں کا ٹوکرا رکھا رہتا تھا، جب سائل آتا تو یہ رسی پکڑ کر دروازہ تک جاتے اور خود اپنے ہاتھ سے فقیر کو دیتے تھے۔ بچوں نے عرض کیا کہ یہ خدمت ہم انجام دے سکتے ہیں۔ فرمایا: آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: مناولۃ السکین تقی میتت سؤ (یعنی مسکین کو خود اپنے ہاتھ سے دینا بری موت سے محفوظ رکھتا ہے)۔ ایک مرتبہ حضرت جبرئیل امین انسانی شکل میں نزول فرما ہوئے اور آنحضرت ﷺ کو کوئی پیغام پہنچایا: حاضرین کو نہ پیغام کی خبر ہوئی نہ حضرت جبرئیل کی تشریف آوری کی۔ مگر حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا: یہ صاحب کون تھے جو آپ سے گفتگو فرما رہے تھے۔ یہ حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ کی مخصوص فضیلت تھی کہ آپ نے حضرت جبرئیل کو دیکھ لیا۔ آنحضرت ﷺ کو تعجب ہوا اور ایک امتی کی اس فضیلت پر مسرت بھی ظاہر فرمائی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں وفات ہوئی۔ رضی اللہ عنہ ۔الاستیعاب

❹ طبقات ابن سعد ص ۱۶۱ ج ۱

(۱)

وہ آفتاب جو مشرق مکہ سے طلوع ہوا تھا۔ جس کی کرنیں اب تک فاران کی چوٹیوں سے ٹکرا رہی تھیں، مدینہ کے خط استواء پر پہنچا تو وہ آفتاب نیم روز تھا۔ ویسے بھی دعوت تبلیغ کے دس سال پورے ہو چکے تھے [1] اور آنے والے سال بھی دس ہی تھے۔

(۲)

اس کا دائرہ عمل نوع انسان کے کسی خاص گروہ [2] ی الطبقہ تک تو کبھی محدود نہیں ہوا۔ البتہ ظاہری وسائل و ذرائع کی بنیاد پر اس کا مخاطب اب تک اُمَّ الْقُرٰی وَ مَنْ حَوْلَهَا [3]۔ تھا اور اب اس کا موقف وہ ہے جو وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا [4] کا مطلع اور مظہر ہے۔

(۳)

سکندر اعظم جیسے فاتح عالم کی تاریخ کا پہلا باب یہ ہوگا کہ اس نے ایسی زبردست فوجی طاقت کس طرح فراہم کی جو فاتح عالم بن سکی۔ اس کی فوج کی خصوصیات کیا تھیں اور وہ خود کس درجہ کا صاحب شجاعت اور صاحب حوصلہ تھا۔ لیکن وہ فرد کامل جو پوری بنی نوع انسان کے لئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا گیا تھا اس کی تاریخ و سیرت کا پہلا باب یہ ہونا چاہئے کہ وہ کیا اصول تھے، کیا طریقہ کار تھا اور کون سے اخلاق تھے جو وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ [5] کی غرض وغایت کو پورا کر سکے۔ (آنے والے صفحات میں انہیں سوالات کے جوابات ہیں)۔

---

[1] نبوت کے ابتدائی تین سال میں دعوت اور تبلیغ کا حکم عام نہیں تھا (تفصیل پہلے گزر چکی ہے)

[2] جیسا کہ بنی اسرائیل کے انبیاء علیہم السلام کا دائرہ عمل گروہ بنی اسرائیل تھا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام، پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل ہی کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا: اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ (سورہ صف آیت ۵)

[3] سورہ الانعام۔ ۹۲ سورہ الشوریٰ ۷، اُمَّ الْقُرٰی مکہ۔ مَنْ حَوْلَهَا جو اس کے اطراف میں ہیں۔

[4] یعنی آپ کے مبعوث کرنے کا مقصد یہ ہے کہ پوری نوع انسان کو (وہ عرب ہوں یا عجم، کالے ہوں یا گورے) ان برکتوں کی بشارت سنا دو جو ایمان و عمل سے حاصل ہوتی ہیں اور انکار حق کے جو برے نتیجے ہوتے ہیں ان سے متنبہ اور آگاہ کر دو۔ (سورہ سبا آیت ۲۸)

[5] آپ کو یہ آخری پیغام دیکر نہیں بھیجا گیا مگر اس لئے کہ رحم کرنا تھا تمام جہانوں پر، پس آپ کی ذات سراسر رحمت کیونکہ جو پیغام آپ کے ذریعہ بھیجا گیا وہ سراسر رحمت ہے۔ (الانبیاء۔ ۱۱۷)

دعوت الی اللہ

داعی کے اوصاف و خصائل اور خصوصیات

(۱)

ارشاد ربانی ہے :

يَآأَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّآ أَرْسَلْنَٰكَ شَٰهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ﴿٤٥﴾ وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِۦ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا ﴿٤٦﴾ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ بِأَنَّ لَهُم مِّنَ اللَّهِ فَضْلًا كَبِيرًا ﴿٤٧﴾ وَلَا تُطِعِ الْكَٰفِرِينَ وَالْمُنَٰفِقِينَ وَدَعْ أَذَىٰهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا ﴿٤٨﴾ (سورہ احزاب۔۴۸،۴۵)

”اے نبی یہ حقیقت ہے کہ ہم نے آپ کو (ان خصوصیتوں کے ساتھ مبعوث کیا ہے کہ) آپ شاہد ہیں (ایمان و عمل کے بہتر نتائج اور ان کی برکتوں کی) بشارت دینے والے، (انکار حق کے برے نتیجوں سے) آگاہ اور متنبہ کرنے والے اور اللہ کے حکم سے اللہ کی طرف دعوت دینے والے اور (آپ ایک) چراغ ہیں نور پھیلانے والے (روشن کرنے والے) اور (اے نبی) اہل ایمان کو بشارت دیدے کہ ان کے لئے اللہ کی طرف سے بڑا فضل (اعزاز) ہے اور کہنا نہ مان منکروں اور منافقوں (دغابازوں) کا اور نظر انداز کردے ان کی ایذا رسانی کو اور بھروسہ کر اللہ پر اور اللہ کافی کارساز ہے۔“

(۲)

توریت [1] میں آنحضرت ﷺ کے متعلق بشارت دی گئی تھی۔

یایها النبی انا ارسلنٰك شاهداً و مبشراً ونذیراً، وحرزاً للامیین۔ انت عبدی و رسولی وسیتك المتوكل لیس بفظ ولا غلیظ ولا صخاب فی الاسواق ولا یدفع بالسیئة السیئة ولكن یعفو ویغفر ولن یقبضه الله حتیٰ یقیم به الملة العوجاء۔ بان یقولوا لا اله الاالله و تفتح بها اعین عمی و آذان صم وقلوبٌ غلف ۔ (بخاری شریف ص ۲۸۵)

”اے نبی ! یہ حقیقت ہے کہ ہم نے آپ کو ان خصوصیتوں کے ساتھ مبعوث کیا ہے کہ آپ شاہد ہیں (ایمان و عمل کے بہتر نتائج اور ان کی برکتوں کی) بشارت دینے والے، (انکار حق کے برے نتیجوں سے) آگاہ اور متنبہ کرنے والے۔ پناہ اور محافظ ان کے جن کے یہاں پہلے کوئی نبی نہیں آیا تھا، تم میرے بندے

---

[1] حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ توریت کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ حضرت عطار بن یسار رضی اللہ عنہ نے ان سے دریافت کیا ”توریت میں آنحضرت ﷺ کا ذکر ہے یا نہیں“ اگر ہے تو آپ کے کیا اوصاف بیان کئے گئے ہیں؟“ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے توریت کے حوالہ سے یہ اوصاف بیان فرمائے۔ (بخاری ص ۲۸۵ باب کراہتہ الصخب فی الاسواق کتاب البیوع)

ہو۔ اور میرے رسول ہو میں نے تمہارا نام رکھا ہے المتوکل (اس متوکل کی شان یہ ہے) نہ بد خلق ہے، نہ سخت دل، نہ بازاروں میں شور و شغب کرنے والا، (یعنی نہ بازاری قسم کا غیر سنجیدہ)، برائی کا جواب برائی سے نہیں دیتا بلکہ در گزر کرتا ہے اور بخش دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس وقت تک (اس کی جان) قبض نہیں کریگا جب تک کہ اس کے ذریعہ اس ملت کو ٹھیک نہ کردے، جس کو ٹیڑھا کر دیا گیا ہے۔ ٹھیک اس طرح کرے کہ وہ قائل ہو جائیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اس کلمہ سے ان کی اندھی آنکھیں، بہرے کان اور وہ دل جن پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں کھول دیئے جائیں۔"

مندرجہ بالا قرآن پاک کی آیت اور توریت کی بشارت میں آپ کی چند خصوصیتیں بیان کی گئی ہیں۔

(۱) شاھدا:

گواہی دینے والا۔ شہادت [1] اور گواہی کا مدار مشاہدہ پر ہوتا ہے۔ یعنی قیاس اور گمان و تخمینہ کی بنا پر گواہی نہیں دی جاتی، بلکہ گواہی اس چیز کی دی جاتی ہے جو خود اپنی آنکھوں دیکھی ہو یا اپنے کانوں سے سنی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ شاہد کو اس چیز کا یقین ہوتا ہے [2] جس کی وہ شہادت دے رہا ہے۔ اگر یقین نہ ہو محض گمان اور قیاس ہو تو شہادت دینا صحیح نہیں ہے۔ پس یہ لفظ شاہد ایک فلسفی اور نبی میں امتیاز پیدا کر دینے والا ہے۔

فلسفی کے پاس ایمان و یقین نہیں ہوتا۔ فلسفی کا سرمایہ محض فکر ہوتا ہے [3] (سوچ وچار، غور وخوص) یا تجربہ۔ [1] غور وخوص یا تجربہ سے جو نتیجہ بر آمد ہو، اس پر ایسا یقین نہیں ہوتا کہ وہ قسم [2] کھا سکے۔

نبی اس عالم کے فنا ہونے، قیامت اور محشر کے برپا ہونے پر قسم کھا سکتا ہے کیونکہ اس کو یقین ہوتا

---

[1] الشھادۃ قول صادر عن علم حصل بمشاھدۃ بصیرۃ او بصر (المفردات فی غرائب القرآن للراغب رحمۃ اللہ)

[2] انما حقیقۃ الشھادۃ ھو تیقن الشیء وتحققہ من شھادۃ الشیء۔ اے حضورہ عینی شرح بخاری فی شرح کلمہ الاذان اشھد ان لاالٰہ الا اللہ ص ۶۲۵ ج ۲)

[3] ۳۔ یونان اور ہندوستان کے فلاسفہ قدیم کے پاس محض فکر تھا۔ اسی فکر سے انہوں نے آسمانوں کی تحقیق کی ان میں تارے گڑے ہوئے سمجھے اور زمین کو ساکن اور آسمان کو متحرک مانا وغیرہ۔ آج ان سب باتوں کی تردید کی جارہی ہے حالانکہ یہی باتیں تھیں جن پر ایمان لانا فلاسفہ کے نزدیک ضروری تھا۔

[1] ماہرین سائنس کے پاس صرف تجربہ ہے جس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ بقول شاعر:

اے برادر بے نہایت در گہیست — ہر چہ بروئے میرسی بروے ماست

[2] پس سائنس کی تمام تحقیقات ظنیات ہیں۔ خود ماہرین سائنس کو اعتراف ہوتا ہے کہ ان کی آج کی تحقیقات حرف آخر نہیں ہے۔ ممکن ہے کوئی نیا انکشاف اس تمام تحقیق کو فریب نظر قرار دیدے۔ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ (سورہ الانعام۔ ۱۱۶ و سورہ یونس آیت ۶۶)

ہے ❸ کہ اس عالم کا آخری انجام قیامت ہے۔ فلسفی کے قیاس اور فکر میں اس عالم کا جو انجام بھی ہو اس پر قسم نہیں کھا سکتا کیونکہ اس کے پاس یقین کی مضبوطی اور ایمان کی روشنی نہیں ہے۔ اس کے پاس ظن، گمان ہے، تخمینہ اور اندازہ سے وہ یہی کہے گا۔ میری تحقیق یہ ہے ممکن ہے غلط ہو۔ چونکہ فلسفی نور یقین سے محروم ہوتا ہے تو وہ اپنے نظریہ کی دعوت بھی نہیں دیتا اور خود اس کا حوصلہ بھی پست رہتا ہے۔ نہ اس میں ذوق ایثار ہوتا ہے نہ شوق فدائیت، نہ جذبہ قربانی۔

اس کے برخلاف نبی جو کچھ کہتا ہے وہ شرح صدر ❹ سے کہتا ہے، کیونکہ اس کے پاس یقین کا نور اور ایمان کی روشنی ہوتی ہے۔ وہ علم اور انکشاف کے اس دیدبان اور مینارہ پر ہوتا ہے، جہاں سے وہ غنیم کی فوجوں کو کھلی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ جبکہ اہل شہر کو غنیم کا تصور بھی نہیں ہوتا اور فلسفی نے اگر کسی طرح اندازہ لگالیا ہو کہ دشمن کی فوجیں قریب آگئی ہیں اور اس اندازہ کے عقلی دلائل بھی اس کے پاس ہوں تب بھی وہ اپنے اندر وہ جذبہ نہیں پاتا جو اس کو قربانی پر آمادہ کرے۔ نہ اس کے دل میں وہ دہشت ہوتی ہے جو اس کو بے چین اور مضطرب کر دے۔ کیونکہ اس کا یہ انداز تذبذب کی دلدل سے پاک اور آزاد نہیں ہوتا۔

جو شخص اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہے کہ آگ کی خندق اس کے سامنے ہے اور وہ اس کے کنارے اس طرح کھڑا ہے کہ آگے قدم بڑھاتا ہے تو وہ ٹھیک خندق میں جاتا ہے۔ وہ صرف اپنے قدم کو آگے بڑھنے سے نہیں روکے گا۔ بلکہ وہ پوری قوت صرف کر دے گا کہ وہ اپنی جگہ جما رہے۔ اس کا قدم آگے نہ بڑھ سکے اور جس قوت سے وہ اپنے قدم کو آگے بڑھنے سے روکے گا اتنی ہی قوت سے وہ دوسروں سے بھی اصرار کرے گا کہ اس طرف نہ بڑھیں۔ اگر اس کو مزاحمت کرنی پڑے تو وہ مزاحمت میں بھی کمی نہیں کرے گا۔ یہاں تک کہ اگر اس مزاحمت میں اس کی جان بھی جاتی رہے تو وہ اس کو شہادت سمجھے گا کہ اس نے بے شمار مخلوق کے ساتھ خیر خواہی کی اور اپنی ایک جان دیکر بہت سی جانیں بچا دیں۔

یہ جذبہ، یہ جوش اور ولولہ فلسفی میں نہیں ہوتا۔ جبکہ نبی ہر آن اور ہر لحظہ اس جذبہ سے سرشار رہتا

---

❸ اس کا مدار وحی پر ہوتا ہے یعنی اعلام خداوندی پر جو سراسر یقین ہوتا ہے کیونکہ خالق سے بڑھ کر اپنی مخلوق کا حال کسی کو نہیں معلوم ہو سکتا۔ اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ؕ وَھُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ (سورہ الملک آیت ۱۴)

❹ اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ لَیُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِکَةَ تَسْمِیَةَ الْاُنْثٰی (النجم آیت ۲۷) وہ (فلسفی یا مشرکین) اپنے ظن کی اتباع کرتے ہیں اور ان خیالات کی جو ان کے نفس پیدا کرتے ہیں اور ان کو عقیدت کی حیثیت دیتے ہیں۔ نیز ارشاد ہے: اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ ۚ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا (ایضاً آیت ۲۸) "وہ (فلسفی اور ماہرین سائنس اپنے فکر یا اپنے تجزیہ کی بنا پر۔ اور مشرکین اپنے دعوؤں کی چاہ اور ان عقائد اور خیالات کے بموجب جو خاندانوں میں پشتہا پشت سے چلے آرہے ہیں اور دلوں میں رچ گئے ہیں) ظن کی اتباع اور پیروی کرتے ہیں اور جہاں حق کی غیر فانی سچائی اور اصل حقیقت کی ضرورت ہو وہاں یہ وہم و گمان کام نہیں آتا۔"

ہے۔ لفظ شاہد نے جس طرح محمد ﷺ کے یقین کامل [1] اور ایمان مکمل کی خبر دی اس نے یہ بھی بتادیا کہ داعی کے لئے لازم ہے کہ اس کے پاس وثوق کامل اور اعتماد ہو اور وہ متاع یقین کا سرمایہ دار ہو۔

(۲) مبشراً :

بشارت دینے والا۔ لفظ بشارت بشرہ سے ماخوذ ہے۔ کھال کے بیرونی اور ظاہری حصہ کو بشرہ کہتے ہیں۔ غیر معمولی خبر کا اثر بشرہ پر بھی پڑتا ہے۔ خوشی کی خبر سے بشرہ، کھل جاتا ہے اور رنج کی خبر سے ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں۔ بسااوقات بشرہ کا رنگ زرد ہو جاتا ہے۔

(۳) نذیراً [2]

مستقبل کے خطرات سے آگاہ کرنے والا۔ یہ دو لفظ دعوت کی اہمیت و عظمت کی طرف بھی اشارہ کررہے ہیں۔ یعنی اس کو مان لینا غیر معمولی خیر و برکت کا ذریعہ ہو گا (جو بشارت عظیم ہے اہل ایمان کے لئے) اور انکار کرنا ایسا عمل ہو گا جس کا نتیجہ تباہ کن اور ہلاکت انگیز ہو گا۔ (یہ تنبیہ اور انذار و اعلام ہے اہل کفر کے لئے)

(۴) داعیاً الی اللہ :

اللہ کی طرف بلانے والا۔ خدا کا نام لینے والے بہت ہیں۔ اسی طرح خدا کا نام لیکر تبلیغ کرنے والے بھی بہت ہیں۔

مگر کیا وہ واقعی خدا کی طرف بلاتے ہیں یا اپنے ذاتی نظریات وخیالات ک منشاء قدرت اور حکم خدا سمجھے ہوئے ہیں اور ان کی طرف لوگوں کو بلاتے ہیں۔ یا یہ صورت ہے کہ اپنی اغراض کی خاطر دعوت و تبلیغ کا بازار لگار کھا ہے اور دین کے نام پر دنیا کمارہے ہیں۔ داعیاً الی اللہ کے بعد باذنہ کے لفظ نے وضاحت کردی کہ آپ جو پیغام یا تعلیم پیش کرتے ہیں وہ منجانب اللہ ہے اور اسکے حکم سے ہے۔ آپ کے ذاتی نظریات نہیں ہے ں۔

---

[1] یہی یقین کامل اس شہادت کی بنیاد ہو گا جو انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی امتوں کے حق میں نافرمان قوموں کے برخلاف اور محمد رسول اللہ ﷺ جملہ انبیاء علیہم السلام کے حق میں جملہ اقوام عالم کے برخلاف قیامت کے روز دینگے۔ فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا۔ (سورہ ۴ نساء آیت ۴۰)

[2] النذر الانذار۔ اخبار فیه تخویف کما ان التبشیر اخبار فیه سرور (المفردات فی غریب القرآن)

(۵) باذنہ

کسی مملکت کا پیغام مملکت کی طرف سے نہیں مانا جاتا جب تک پیغام دینے والا مجاز نہ ہو۔ سفراء پہلے سند سفارت پیش کرتے ہیں اس کے بعد ان کو اجازت ہوتی ہے کہ اس مملکت میں سفارتی فرائض انجام دے سکیں۔ باذنہ کے لفظ نے ایک سند عطا فرمادی کہ آپ کو اللہ کی طرف سے مجاز کی حیثیت حاصل ہے گویا اس فرض اور اس خدمت کے لئے آپ لائسنس دار ہیں۔

(۶) سراجاً منیراً:

چراغ، روشنی بخشنے والا۔ کہتے ہیں کہ آفتاب سراسر آگ ہے اور چاند اگرچہ روشن ہے مگر اس کا نور اپنا نہیں۔ وہ آفتاب کی عکاسی کرتا ہے لیکن چراغ کی چند خصوصیتیں ایسی ہیں جو آفتاب میں ہیں نہ چاند میں
۔

سب سے پہلی خصوصیت وہ سوز و گداز ہے جو نہ آفتاب کو میسر ہے نہ چاند کو۔ دوسری خصوصیت یہ کہ چراغ شریک محفل ہوتا ہے جب کہ آفتاب اور چاند بزم انسان سے لاکھوں میل دور ہیں۔

تیسری خصوصیت فیض رسانی اور تکمیل تربیت ہے۔ آپ چراغ کی ٹمٹماتی بتی سے بے شمار چراغ جلاسکتے ہیں اور قندیل روشن کر سکتے ہیں، جبکہ آفتاب جہاں تاب نے آج تک کسی دوسرے کو آفتاب نہیں بنایا اور نہ چاند اپنے وجود سے کوئی دوسرا چاند بنا سکا۔

(۴) چراغ کی حقیقت مٹی یا روئی کا وہ گالا ہے۔ جس سے اس کی بتی بنائی جاتی ہے۔ مٹی میں آگ نہیں لگتی روئی آگ پکڑتی ہے، مگر شعلہ نہیں بنا سکتی۔ پس چراغ کی ہستی اور اس کی روشنی کا سرمایہ وہ تیل ہے جو چراغ روشن کرنے والا اس کے ظرف میں بھر دیتا ہے۔

یہ ہیں چراغ کی خصوصیتیں۔ ان خصوصیتوں کے ملاحظہ کے بعد آیت پر نظر ثانی فرمایئے۔ آیت میں داعیاً الی اللہ کے بعد سراجاً منیراً فرما کر اس حقیقت کو طشت از بام فرمادیا کہ

(الف) محمد رسول اللہ ﷺ کی دعوت کا سرمایہ وحی الٰہی کا وہ روغن ہے جو اس کے تن بدن سے پیوست ہے بلکہ وہ روغن کہ داعی کا تن بدن اس کی تراوٹ میں غرق ہے۔ اس کا نور تمام تر اسی کا فیض ہے۔[1]

(ب) داعی کی دعوت شاعرانہ تفریح نہیں بلکہ شعلہ ہے اس سوزش[2] کا جو اس کے بدن کو پگھلا رہی ہے۔ یہ سوزش، ہمدردی، نوع انسان کی سوزش ہے۔ انسان اپنے اعمال کے نتائج سے غافل ہے، یہ نبی

---

[1] وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ (النجم۔۴،۵) وقال رسول اللہ ﷺ انما انا قاسم واللہ یعطی

[2] لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝ ۔ (شعراء۔۳)

ان کو دیکھ رہا ہے اور پگھل رہا ہے۔ [3]

(ج) اہل محفل مشغول ہیں مگر چراغ اپنا کام برابر کر رہا ہے۔ [4]

(د) سورج اور چاند روشنی بخشتے ہیں مگر ایثار اور قربانی کا سبق نہیں دیتے۔ یہ خصوصیت چراغ کی ہے کہ اس کی بتی جل کر فنا ہو رہی ہے اور ہر ایک داعی کو داعیانہ جہاد میں فنا ہونے کا سبق دے رہی ہے۔ یعنی داعی کی دعوت اس وقت نور بخش ہو سکتی ہے جبکہ خود داعی سوز و گداز بن جائے۔ اپنے تن بدن کو مقاصد دعوت کے لئے قربان کر دے۔ اور اس ایثار اور قربانی کو اپنے وجود کا مقصد اعظم اور اپنے ظہور کی آخری غرض وغایت بنا لے (حقیقت یہ ہے کہ محمد ﷺ کی پوری سیرت اسی لفظ سراجاً منیراً میں سموئی ہوئی ہے۔ آپ سیرت مقدسہ کا جتنا گہرا مطالعہ کریں گے آپ کا ضمیر اس کی شہادت دیتا رہے گا۔

(ہ) ارشاد ربانی ہے:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنۡ رِّجَالِكُمۡ وَلٰكِنۡ رَّسُوۡلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ (سورہ احزاب، ۴۰)

ترجمہ: "نہیں ہیں محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ، لیکن وہ اللہ کے رسول ہیں اور خاتم النبین ہیں [5] (سب کے ختم پر ہیں)"

یعنی بقول حضرت شاہ عبد القادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ اللہ کے رسول ہیں۔ اس حساب سے سب آپ کے بیٹے ہیں۔ (موضح القرآن) اگر آپ کے بعد کوئی اور نبی آتا تو نوع انسان کا یہ تعلق اس سے ہو جاتا۔ مگر چونکہ آپ خاتم الانبیاء ہیں، آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آنے والا، تو آپ کا یہ تعلق ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہے۔ اسی سورہ احزاب میں پہلے یہ ارشاد ہوا ہے:

اَلنَّبِيُّ اَوۡلٰى بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ مِنۡ اَنۡفُسِهِمۡ وَاَزۡوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمۡ (ع۱، آیت ۶)

ترجمہ: نبی سے لگاؤ ہے، ایمان والوں کو زیادہ اپنی جان سے اور اس کی عورتیں ان کی (مومنین کی) مائیں ہیں۔

---

[3] حضرت ابو بکرؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ آپ وقت سے پہلے بوڑھے ہو گئے۔ فرمایا: مجھے سورہ ھود اور اس جیسی دوسری سورتوں نے بوڑھا کر دیا۔ (شمائل ترمذی ص ۴) ان سورتوں میں ان ناعاقبت اندیش انسانوں کے نتائج بد بیان کئے گئے ہیں جنہوں نے انبیاء کی دعوت سے گریز کر کے کفر کی راہ اختیار کی۔ ان نتائج کے صدمہ نے آپ کو بوڑھا بنا دیا۔

[4] يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوۡلُ بَلِّغۡ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ ؕ وَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلۡ فَمَا بَلَّغۡتَ رِسَالَتَهٗ (مائدہ۔۱۰)

[5] خاتم کے معنی ہیں مہر، اسی لئے حضرت شاہ عبد القادر صاحبؒ نے ترجمہ کیا ہے: مہر سب نبیوں پر یعنی جس طرح مہر آخر میں ہوتی ہے اور مہر لگا دینے کے معنیٰ ہوتے ہیں ختم کر دینا اور اس سلسلہ کو بند کر دینا، ایسے ہی آپ کے بعد نبی بنانے کا سلسلہ بند کر دیا گیا۔ کوئی نبی نہیں بنایا جائے گا۔ باقی عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری ہوگی تو آپ کی نبوت نئی نہیں ہوگی بلکہ آپ کی نبوت وہی ہوگی جو آپ کو آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری سے تقریباً چھ سو سال پہلے عطا ہوئی تھی۔ آپ کی نبوت وہی ہے۔ البتہ دور محمدی میں آپ تشریف لائیں گے تو شریعت محمدیہ پر عمل کریں گے کیونکہ اس دور کا تقاضا یہی ہے۔ صلوات اللہ علیہم اجمعین۔

تشریح: آیت کا اشارہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی شفقت باپ سے بھی زیادہ ہے۔ اسی لئے جب ازواج مطہرات کو امت کی مائیں قرار دیا گیا تو یہ نہیں فرمایا گیا کہ آپ امت کے باپ ہیں کیونکہ باپ کی شفقت رشتہ پدری میں محدود ہوتی ہے اور آنحضرت ﷺ کی شفقت ان حدود سے بہت بالا ہے۔ ہمارے الفاظ اس کی کوئی حد نہیں بیان کرسکتے۔ البتہ عمل سے اس کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ مثلاً اس آیت کے نزول کے بعد آنحضرت ﷺ نے اعلان فرمادیا کہ اگر کوئی مفلس مسلمان وفات پاجائے اور ترکہ کے بجائے اس کے ذمہ دار قرض ہو اور اس کے لاوارث بچے ہوں جن کا کوئی پرسان نہ ہو تو اس کا قرض آنحضرت ﷺ ادا فرمائیں گے اور اس کے بچوں کی ذمہ داری بھی آنحضرت ﷺ کے اوپر ہوگی۔ آپ ان کے مربی بھی ہونگے اور متکفل بھی ہوں گے۔ لیکن اگر کوئی مسلمان ترکہ چھوڑ کر وفات پاتا ہے تو اس کا ترکہ اس کے وارثوں پر تقسیم ہوگا۔ (رشتہ کا باپ ترکہ میں حصہ دار ہوتا ہے) مگر آنحضرت ﷺ نے ترکہ میں سے کوئی حصہ نہیں لیا۔ البتہ لاوارث بچوں کی اور مرنے والے کے قرض کی ذمہ داری لے لی۔ (بخاری شریف وغیرہ) اس لئے کہ آپ کی شفقت، شفقت پدری کی حدود سے آگے بڑھی ہوئی تھی۔

ہدایات

وہ نبی جس کو ان خصوصیات کے ساتھ مبعوث کیا گیا تھا، اس آیت کے دوسرے حصہ میں اس کو چند ہدایات فرمائی گئی ہیں جن کی تفصیل یہ ہے۔

(ا) پہلی ہدایت :

اہل ایمان کو بشارت دیدیجئے کہ ان کے لئے اللہ کی طرف سے بہت بڑا فضل (اعزاز) ہے۔

تشریح: اس ہدایت میں (الف) جس طرح طریقہ دعوت و تبلیغ کی تلقین ہے کہ داعی الی اللہ کو تخویف و ترہیب (ڈرانے، دھمکانے اور مرعوب کرنے) کے بجائے ترغیب اور تشویش کا طریقہ اختیار کرنا چاہئے یعنی خدا کے قہر وغضب کے تذکرہ سے پہلے ان نعمتوں اور ان فوائد کو ذہن نشین کرانا چاہئے جو دعوت کے قبول کرنے پر صاحب ایمان کو میسر آئیں گے۔

(ب) اور جس طرح حوصلہ افزائی ہے ان اہل ایمان کی جو دعوت قبول کررہے ہیں۔

(ج) اسی طرح پیشن گوئی ہے ان امتحانات کی جو دعوت قبول کرنے والوں کے ہوا کرتے ہیں جن کی بناپر اللہ کے یہاں ان کا اعزاز [1] ہوتا ہے۔ سورہ بقرہ آیت ۲۱۴ میں فرمایا گیا ہے۔ [2]

---

[1] یعنی جب فضل واعزاز کی بشارت ہے تو لامحالہ ان امتحانات کی بھی پیشن گوئی ہے جن میں کامیاب ہونے پر فضل واعزاز کا تمغہ ملتا ہے۔

"کیا تم نے سمجھ رکھا ہے کہ (محض ایمان کا زبانی دعویٰ کر کے) تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ ابھی تو تمہیں وہ آزمائشیں ہی نہیں آئی ہیں جو تم سے پہلے لوگوں کو پیش آچکی ہیں۔ ہر طرح کی سختیاں انہیں بھگتنی پڑیں۔ ہولناک مصائب سے ان کو جھنجھوڑا گیا، یہاں تک کہ اللہ کے رسول اور جو لوگ ایمان لائے تھے پکار اٹھے، اے نصرت خداوندی تیرا وقت کب آئے گا۔ (تب اچانک پردہ غیب چاک ہوا اور خداوند عالم کی نصرت یہ کہتی ہوئی نمودار ہوگئی) ہاں گھبراؤ نہیں خدا کی نصرت تم سے دور نہیں ہے۔

اس عام ضابطہ قدرت کے علاوہ خاص اس امت کو بھی آگاہ کر دیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

سورہ بقرہ کی آیات [3] ۱۵۴ تا ۱۵۷ جن کا ترجمہ یہ ہے :

"یاد رکھو یہ ضرور ہونا ہے کہ ہم تمہارا امتحان لیں۔ خطرات کا خوف، بھوک کی تکلیف، مال و جان کا نقصان، پیداوار کی تباہی، وہ آزمائشیں ہیں جو تمہیں ضرور پیش آئیں گی۔ پھر جو لوگ صبر کرنے والے ہیں انہیں (فتح و کامرانی) کی بشارت دے دو۔ یہ وہ لوگ ہیں جب کبھی کوئی مصیبت ان پر آتی ہے (تو بے قرار اور بدحواس ہونے کے بجائے ذکر الٰہی سے اپنی روح کو تقویت پہنچاتے ہیں اور ان کی زبان حال کی صدا یہ ہوتی ہے کہ) انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ہم اللہ کے ہیں (ہماری زندگی اور موت، رنج و غم، سود و زیان جو کچھ بھی ہے سب اللہ کے لئے ہے اور ہم سب کو بالآخر مرنا اور) اس کی طرف لوٹنا ہے۔ سو یقیناً ایسے ہی لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کے الطاف و کرم ہیں جن پر ان کے رب کی رحمت اترتی ہے اور یہی ہیں جو اپنے مقصد میں کامیاب ہیں۔ (سورہ بقرہ آیت ۱۵۴ تا ۱۵۷)

(۲) دوسری ہدایت :

اور کہنا نہ مان منکروں اور منافقوں کا۔

سورہ الدھر کی آیت ۲۴ میں یہ ارشاد ہے :

"آپ اپنے پروردگار کے حکم پر مضبوطی سے قائم رہیئے۔"

ان (دشمنان دین) میں سے کسی گنہگار اور ناشکرے کا کہنا نہ مانئے۔

بیشک داعی الی اللہ، اللہ کے حکم پر مضبوطی سے قائم رہے گا۔ وہ غیر اللہ کے حکم کی تعمیل نہیں

---

[2] اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَ زُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ (سورہ بقرہ۔ ۲۱۴)

[3] وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَىْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَاۤ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْۤا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۟ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ (سورہ بقرہ۔ ۱۵۵ تا ۵۷)

کرے گا۔ ان سے قطع تعلق کریگا۔ مگر یہ قطع تعلق خاص رکھ رکھاؤ کے ساتھ ہو گا۔ دل آزاری کے ساتھ نہیں ہو گا، کیونکہ جس رب کی طرف لوگوں کو دعوت دے رہا ہے اس کا حکم یہ بھی ہے کہ

"یہ لوگ جو باتیں کرتے ہیں ان پر صبر کرو، اور خوبصورتی کے ساتھ ان سے الگ ہو جاؤ" (سورہ ۷۳ مزمل، آیت ۱۰)

(۳) تیسری ہدایت :

وَدَعْ اَذٰىهُمْ۔ (احزاب۔۴۸) نظر انداز کر دے ان کی ایذارسانی کو یعنی معاف کرو، درگزر کرو، صبر و ضبط اور تحمل سے کام لو، داعی الی اللہ کی یہی شان ہے اور یہی اس کا فرض ہے۔ چنانچہ سورہ آل عمران کی آیت ۱۸۵ میں فرمایا گیا ہے [1]

"یاد رکھو ایسا ہونا ضروری ہے کہ تم جان و مال کی آزمائشوں میں ڈالے جاؤ، یہ بھی ضرور ہونا چاہے کہ اہل کتاب اور مشرکین عرب سے تمہیں دکھ پہنچانے والی باتیں بہت کچھ سننی پڑیں، اگر تم نے صبر کیا (یعنی مصیبتوں میں ثابت قدم رہے) اور تقویٰ کا طریقہ اختیار کیا۔ (اللہ تعالیٰ کے احکام کی پوری تعمیل کی اور نافرمانی سے پوری احتیاط برتی) تو بلاشبہ یہ ہونگے بہت (بڑے حوصلہ) کے کام۔"

(۴) چوتھی ہدایت :

---

[1] حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی ایک طویل روایت جس کو بخاری نے اس آیت کی تفسیر میں ص ۶۵۶ اور باب کنیۃ المشرک میں ص ۹۱۶ پر تفصیل سے نقل کیا ہے۔ اس کے آخری الفاظ سے یہ وہم ہوتا ہے کہ یہ حکم اس وقت تک تھا جب تک جہاد کی اجازت نہیں ہوئی تھی اس کے بعد یہ حکم نہیں رہا۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ دعوت اور تبلیغ کے سلسلہ میں یہ حکم ہمیشہ کے لئے ہے۔ چنانچہ سورہ توبہ میں جہاں یہ حکم ہے فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ (آیت ۵) "جب حرمت کے مہینے گذر جائیں تو جنگ کی حالت قائم ہو جائے گی اس وقت مشرکوں کو جہاں کہیں پاؤ قتل کرو" اس آیت کے بعد اگلی آیت یہ ہے۔ وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ آیت ۶ یعنی "اے نبی اگر مشرکوں میں سے کوئی آدمی آئے اور تم سے امان مانگے تو اسے ضرور امان دو یہاں تک کہ وہ (اچھی طرح) اللہ کا کلام سن لے، پھر اسے امن کے ساتھ اس کے ٹھکانے پر پہنچا دو (اسلام قبول کرے یا نہ کرے)"

دراصل حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے ارشاد کا تعلق پورے واقعہ سے ہے اور مطلب یہ ہے کہ جب تک جہاد کی اجازت نہیں ہوئی تھی اور صرف صبر ہی کی ہدایت تھی تو اس وقت تک عبد اللہ بن ابی بن سلول اور ان کی پارٹی کے آدمی کھلے بندوں آنحضرت ﷺ کی مخالفت کیا کرتے تھے، جو بسا اوقات توہین آمیز ہوتی تھی اور جب جہاد کی اجازت ہو گئی اور غزوہ بدر میں مسلمانوں کو فتح بھی حاصل ہو گئی تو ان لوگوں نے ظاہر داری کے لئے اسلام قبول کر لیا اور کھلم کھلا مخالفت کے بجائے در پردہ سازشیں شروع کر دیں۔

اللہ پر بھروسہ کر۔ یعنی جملہ ذرائع استعمال کرو۔ ذرائع کا مہیا کرنا بھی فرض ہے مگر بھروسہ ذرائع پر نہ ہو، بھروسہ خدا پر ہو کہ ہدایت بخشنا اس کا کام ہے، وہی جس کو چاہتا ہے ہدایت بخشتا ہے۔

اِنَّكَ لَا تَهْدِىْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ

(سورہ القصص آیت ۵۶)

"تم جس کو چاہو راہ راست پر نہیں لگا سکتے، اللہ جس کو چاہے راہ راست پر لگا دیتا ہے اور ہدایت پانے والوں کا پورا علم اسی کو ہے۔"

سیرۃ مبارکہ کا اہم اور اصل جز دعوت ہے۔ داعی کی حیثیت سے آپ کے اوصاف و خصائل سطور بالا میں بیان کئے گئے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر دعوت کے آداب اور طریقہ کار بھی بیان کر دیا جائے۔ یہ بھی سیرت مبارکہ کا سب سے مقدم باب ہے۔ آئندہ سطور میں آداب اور طریقہ کار بیان کیا جا رہا ہے جو وحی الٰہی نے مقرر فرمایا ہے۔

آداب دعوت و طریقہ کار

(۱)

(الف) اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۲۵﴾ وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ؕ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۲۶﴾ وَ اصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِىْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّ الَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ﴿۱۲۸﴾ (النحل۔ ۱۲۵ تا ۱۲۸)

"اے نبی اپنے پروردگار کی راہ کی طرف لوگوں کو بلاؤ اس طرح کہ حکمت اور دانشمندی کی باتیں بیان کرو اور اچھے طریقہ پر پند اور نصیحت کرو۔ اور مخالفوں سے بحث و نزاع کرو تو (وہ بھی) ایسے طریقہ پر کہ وہی طریقہ سب سے بہتر (اور زیادہ سے زیادہ حسن و خوبی) کا طریقہ ہو۔ تمہارا پروردگار ہی بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹک گیا ہے اور وہی جانتا ہے کہ کون راہ راست پر ہے اور مخالفوں کی سختی کے جواب میں اگر سختی کرو تو چاہئے کہ ویسی ہی اور اتنی ہی کرو جیسی تمہاری ساتھ کی گئی اور اگر تم نے صبر کیا یعنی جھیل گئے اور سختی کا جواب سختی سے نہیں دیا تو بلاشبہ صبر کرنے والوں کے لئے صبر ہی بہتر ہے۔ اے پیغمبر صبر کر اور تیرا صبر کرنا نہیں ہے مگر اللہ کی مدد سے۔ اور ان لوگوں کے حال پر غم نہ کھا، نہ ہی ان کی مخالفانہ تدبیروں سے دل تنگ ہو۔ یقیناً اللہ انہیں کا ساتھی ہے جو متقی ہیں اور نیک عملی میں سرگرم رہتے ہیں۔"

(ب) خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۱۹۹﴾ وَ اِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۰۰﴾ (سورہ اعراف،۱۹۹،۲۰۰)

"در گزر اور معافی کا طریقہ اختیار کر، نیک کام کو کہہ اور کنارہ کر جاہلوں (نادانوں) سے اور اگر ابھار دے تجھ کو شیطان کی چھیڑ (یعنی اگر ایسا ہو کہ کسی بات پر جھونجل آجائے جو یقیناً شیطان کی حرکت ہو گی، داعی الی اللہ کو جھونجل نہ آنی چاہئے) تو فوراً اللہ کی طرف متوجہ ہو جاؤ، اس کی پناہ پکڑو (جھونجل کو ختم کر دو) بلاشبہ اللہ تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے۔" (سورہ ۷االاعراف، آیت ۱۹۹)

تشریح: ذہنی صلاحیت ہر ایک کی یکساں نہیں ہوتی۔ کوئی صاحب علم و دانش ہوتا ہے کوئی سادہ طبیعت اور کوئی کھود کرید اور بحث و مباحثہ کا شوقین ہوتا ہے۔ ان آیات کا اشارہ یہ ہے کہ داعی الی اللہ کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ مخاطب کی ذہنیت کو پرکھے، اگر وہ صاحب علم و دانش ہے تو اس کو عالمانہ اور دانش مندانہ دلائل (حکمت) سے سمجھائے۔ عوام کے لئے ہمدردانہ نصیحت اور وعظ و پند سے کام لے۔ اور بحث کے شوقین سے بحث بھی کر سکتا ہے مگر اس طرح کہ پہلے مخاطب کو سمجھے پھر وہ انداز اختیار کرے جو حق بات کے سمجھنے اور سمجھانے کا ہوتا ہے، جس سے مخاطب میں یقین پیدا ہو۔ اس کے دل کی گرہ کھلے، ایسی کوئی بات نہ ہو جس سے اس کا دل دکھے۔ اپنی حق پرستی کا زعم اور گھمنڈ اور اس کی باطل پرستی کی تحقیر و تذلیل کا انداز ہرگز نہ ہو۔ دل پر خوف خدا غالب رہے کہ دلوں کا حال اللہ ہی کو معلوم ہے۔ گمراہ اور ہدایت یافتہ کو وہی خوب پہچانتا ہے۔ اپنے انجام کی خبر کسی کو نہیں۔ اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ کس کا انجام کیا ہو گا۔ داعی الی اللہ کے لئے یہ بھی درست نہیں کہ وہ مخالف کی مخالفانہ حرکتوں سے دل تنگ ہو۔ اس کے مزاج میں جھونجل بھی نہ آنی چاہئے۔ اگر مخالف کی طرف سے زیادتی ہوئی ہے تو اجازت ہے کہ اس کا جواب دے سکتے ہو مگر نپا تلا کہ اس میں داعی اور مبلغ کی طرف سے کوئی زیادتی نہ ہو مگر صرف یہ اجازت ہے۔ داعی کی شان یہ نہیں کہ وہ بدلہ لے۔ اس کا کام ہے عفو و درگزر اور ضبط و تحمل، صبر، اس کا یہ صبر اللہ کے لئے ہے اور اللہ کی مدد سے ہے۔ لہٰذا داعی کا فرض ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہے کہ اس کے ظرف میں وسعت، نگاہ میں بلندی عطا فرما کر اس کی مدد کرے۔ اس کو یقین رکھنا چاہئے کہ اگر وہ احتیاط اور تقویٰ سے کام لے رہا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ہے، اس کا حامی اور مددگار ہے۔

(۲)

لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۣ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ۭ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۱۸۶﴾ (آل عمران۔۱۸۶)

"ایسا ضرور ہونا ہے کہ تم جان و مال کی آزمائشوں میں ڈالے جاؤ۔ یہ بھی ضرور ہونا ہے کہ اہل کتاب اور مشرکین کی طرف سے تمہیں دکھ پہنچانے والی باتیں بہت کچھ سننی پڑیں۔ اگر تم صبر

(ضبط و تحمل) سے کام لو اور پرہیز گاری کرو (تقوے سے کام لو) احکام حق کی نافرمانی سے بچو تو یہ ہیں ہمت کے کام۔"

داعی کے اوصاف و خصائل کے سلسلہ میں تیسری ہدایت گزر چکی ہے۔ وَدَعْ اَذٰىهُمْ۔ "نظر انداز کر دے ان کی ایذا رسانی کو۔"

سوال یہ ہو سکتا ہے کہ نظر انداز کب تک کرتا رہے، اس کا جواب اس آیت سے اخذ کیا جا سکتا ہے کہ کب تک کی کوئی حد ہی نہیں۔

چاہتے ہو کہ حق کا بول بالا ہو تو یہ تمنا آسان نہیں ہے۔ باطل تمہارے مقابلہ میں ضرور آئے گا۔ پوری قوت سے آئے گا، اور آتا رہے گا جب تک دنیا میں نور و ظلمت، اندھیری اور اجالا ہے، حق و باطل کی جنگ بھی جاری ہے اور پیروان دعوت حق کے لئے یہ امتحانات بھی باقی ہیں۔ داعی الی اللہ کی کامیابی یہی ہے کہ ان امتحانات میں وہ کامیاب ہو۔ ہدایت دینا اور بھٹکے ہوؤں کو راہ راست پر لانا خدا کا کام ہے۔ السعی منی والاتمام من اللہ۔

دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو دعوت اور طریقہ دعوت

اہل کتاب:

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (آل عمران۔ ۶۴)

"(اے نبی) تم اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) سے کہدو: اے اہل کتاب (اختلاف و نزاع کی ساری باتیں چھوڑ دو) اس بات (اصول) کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے دونوں کے لئے یکساں طور پر تسلیم شدہ ہے یعنی یہ کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔ کسی کی ہستی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں۔ ہم میں سے ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ ایسا برتاؤ نہ کرے گویا خدا کو چھوڑ کر اسے اپنا پروردگار بنا لیا ہے۔"

وجہ اختلاف:

لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِى الْاَمْرِ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ ؕ اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۶۷﴾ وَاِنْ جٰدَلُوْكَ فَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۶۸﴾ (سورہ ۲۲ الحج رکوع ۹)

"اے نبی ہم نے ہر امت کے لئے عبادت کا ایک طور طریقہ ٹھہرا دیا ہے۔ جس پر وہ چل رہی ہے۔ بس لوگوں کو اس معاملہ میں (یعنی اسلام کے طور طریق میں) تجھ سے جھگڑنے کی کوئی

وجہ نہیں، تو اپنے پروردگار کی طرف لوگوں کو دعوت دے (کہ اصل دین یہی ہے) یقیناً تو ہدایت کے سیدھے راستہ پر چل رہا ہے۔ اگر (اس پر بھی) لوگ تجھ سے جھگڑا کریں تو کہہ دے کہ اللہ تمہارے کاموں سے بے خبر نہیں۔ تم جن باتوں میں آپس میں اختلاف کر رہے ہو، قیامت کے دن وہ تمہارے درمیان فیصلہ کر کے حقیقت حال آشکارا کر دیگا۔"

تشریح: ان آیتوں کا اشارہ یہ ہے کہ دعوت الی اللہ کا اسلوب اور طریقہ یہ ہونا چاہئے کہ

(الف) ان باتوں کو مقدم رکھا جائے جن کو مخاطب بھی مانتے ہیں۔ مثلاً یہ بات کہ اللہ کے سوا کسی کی پرستش نہ ہونی چاہئے غیر اللہ کے ساتھ ایسا معاملہ نہ کرنا چاہئے کہ معلوم ہو کہ خدا کو چھوڑ کر ان کو معبود مان لیا ہے۔ اس کو اہل کتاب بھی مانتے ہیں لہذا پہلے اسی پر زور دیا جائے۔

(ب) یہ سمجھایا جائے کہ اللہ ایک ہے تو اس کا دین بھی ایک ہی ہے، اس کی بنیادی باتیں بھی ایک ہی ہیں، عبادت کا حکم ہمیشہ رہا، اختلاف اس کے طور وطریق میں ہوا۔ کیونکہ ہر ایک عہد اور ہر ایک دور اور ہر ایک قوم کی حالت یکساں نہیں تھی۔ جس کی جیسی حالت اور جیسی صلاحیت اور قابلیت تھی اس کے مطابق اس کو طور طریق دیا گیا جو ہر دور میں ترقی کرتا اور آگے بڑھتا رہا۔ بس یہ اختلاف فطری اور قدرتی تھا جو واقع ہوا۔

(ج) دعوت دینے والے کے دل میں دوسرے مذہب کے طریقوں کا یہ احترام ہو کہ وہ سمجھے کہ بنیادی طور پر وہ من جانب اللہ تھے تو اس سے اس کے انداز دعوت میں لامحالہ لچک ہوگی، دوسری طرف جن کو دعوت دی جارہی ہے ان کو بھی اس دعوت سے وحشت نہ ہوگی کیونکہ وہ سمجھے گا کہ یہ دعوت پہلی بنیادوں کو اکھاڑ نہیں رہی بلکہ ان کو اپنی جگہ تسلیم کرتے ہوئے تعمیر میں اضافہ کر رہی ہے۔

(د) ان حقیقتوں کو ذہن نشین کرانے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ مخاطب یہ اثر لیں گے کہ جب سابق امتوں میں ان کی صلاحیتوں کے بموجب عبادت کے قواعد و قوانین میں فرق ہوتا رہا ہے تو ترقی یافتہ حالات کے مطابق اگر کوئی طریقہ معین کیا گیا، جو مکمل اور آخری طریقہ ہے، تو وہ بھی قابل تسلیم ہونا چاہئے اس سے وحشت نہ کرنی چاہیئے۔

(ہ) پس تقاضا انصاف یہ ہے کہ سابق امتوں کے لوگ (اہل کتاب) اس دعوت کو اختلاف اور نزاع کا نشانہ نہ بنائیں بلکہ اس کو پرکھیں، حقیقت پسندی سے کام لیں اور صداقت کو تسلیم کریں۔

(و) لیکن اگر مخاطب لوگ تمام حقیقتوں کو پس پشت ڈال کر نزاع کرنا اور جھگڑنا ہی پسند کریں تو داعی الی اللہ کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ بھی ان کی طرح ضد، عناد اور نزاع میں پڑے بلکہ وہ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا

تَعۡمَلُوۡنَ (الحج۔٦٨)[1] کہہ کر الگ ہو جائے اور ان کا معاملہ خدا کے حوالے کر دے کہ قیامت کے دن وہی ان نزاعات کا فیصلہ کرے گا۔ واللہ اعلم

اھل شرک:

اِتَّبِعۡ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ ۚ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۚ وَ اَعۡرِضۡ عَنِ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ﴿۱۰۶﴾ وَلَوۡ شَآءَ اللّٰہُ مَاۤ اَشۡرَکُوۡا ؕ وَمَا جَعَلۡنٰکَ عَلَیۡہِمۡ حَفِیۡظًا ۚ وَمَاۤ اَنۡتَ عَلَیۡہِمۡ بِوَکِیۡلٍ ﴿۱۰۷﴾ وَلَا تَسُبُّوا الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ فَیَسُبُّوا اللّٰہَ عَدۡوًۢا بِغَیۡرِ عِلۡمٍ ؕ کَذٰلِکَ زَیَّنَّا لِکُلِّ اُمَّۃٍ عَمَلَہُمۡ ۪ ثُمَّ اِلٰی رَبِّہِمۡ مَّرۡجِعُہُمۡ فَیُنَبِّئُہُمۡ بِمَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۰۸﴾

(الانعام۔١٠٦تا١٠٨)

(اے نبی) تمہارے پروردگار کی طرف سے جو کچھ تم پر وحی کی گئی ہے، تم اس کی پیروی کرو کہ کوئی معبود نہیں ہے مگر صرف اسی کی ذات۔ اور کنارہ کرو مشرکین سے۔ اور اگر اللہ چاہتا تو (وہ اس کی قدرت رکھتا ہے کہ انسان کو اس طرح بنا دیتا کہ سب ایک ہی راہ پر چلنے والے ہوتے اور) یہ لوگ شرک نہ کرتے (لیکن تم دیکھ رہے ہو کہ مشیت خداوندی کا یہی فیصلہ ہوا کہ ہر انسان) اپنی اپنی سمجھ اور اپنی اپنی راہ رکھے۔ پس تمہارا کام یہی ہے کہ سچائی کی راہ دکھا دو۔ (انہیں جبراً اپنی راہ پر چلانا تمہارا کام نہیں ہے) ہم نے تمہیں نہ تو ان پر پاسبان بنایا ہے (کہ ان کی رائے اور عمل کی نگرانی کرو) اور نہ تمہارے حوالہ ان کی ذمہ داری ہے (کہ ان کے نہ ماننے کا کوئی الزام تم پر آئے)۔

اور (مسلمانو!) جو لوگ خدا کے سوا دوسری ہستیوں کو پکارتے ہیں تم ان کے معبودوں کے متعلق بدکلامی نہ کرو کہ پھر وہ بھی حد سے بڑھ کر بے سوچے سمجھے خدا کو برا بھلا کہنے لگیں۔ ہم نے اسی طرح ہر قوم کیلئے اس کے کاموں کو خوش نما بنا دیا (کہ ہر قوم اپنی راہ رکھتی ہے اور اپنی ہی راہ اسے اچھی دکھائی دیتی ہے) پھر آخر سب کو اپنے پروردگار کی طرف لوٹنا ہے۔ اس وقت وہ ان سب پر ان کے کاموں کی حقیقت کھول دے گا جو وہ (دنیا میں) کرتے رہے ہیں۔ "

تشریح: یعنی یہ تو حقیقت ہے کہ شرک ظلم عظیم ہے[1]۔ شرک کرنے ولا خدا پر ظلم نہیں کرتا بلکہ خود اپنے اوپر بہت بڑا ظلم کرتا ہے کہ اپنی عظمت اور اپنی خودداری کو خود ہی پامال کرتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی بلندی پر ہو پھر خود اپنے کو پستی کے گڑھے میں گرا دے، جہاں اس کو مردار خور پرندے تکا

---

[1] تمہارے عمل کو جو تم کر رہے ہو خدا خوب جانتا ہے۔

[1] سورہ ۳۱ لقمان آیت ۱۳

بوٹی کردیں یا ہواؤں کے جھونکوں کی لپیٹ میں آکر برباد ❷ ہوجائے۔ اس ظلم عظیم کا نتیجہ لا محالہ ہے کہ شرک کے لئے بخشش کی گنجائش نہیں ❸۔ اور مشرک کا جنت میں داخل ہونا ایسا ہی ہے جیسے اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے نکل جانا۔ ❹ لیکن ان تمام قباحتوں اور نفرت انگیز خرابیوں کے باوجود داعی الی اللہ کے انداز میں نفرت اور تحقیر و تذلیل کی جھلک نہ ہونی چاہئے۔ وہ جب دعوت دے تو اس کی نظر اس پر ہونی چاہئے کہ اس کائنات میں رنگ برنگی اس کے خالق اور پروردگار کی حکمت و قدرت کاملہ کا تقاضا ہے۔ اس چمن کی رونق ہی گلہاء رنگا رنگ سے ہے۔ اور اس کی زیبائش نہیں نکھرتی جب تک اس میں خاردار درخت اور پودے نہ ہوں۔ پھر ظاہر ہے کہ پھول پھول ہے۔ کانٹا کانٹا ہے۔ پھول کا جو مقام ہے وہ کانٹے کو میسر نہیں ہو سکتا۔ مگر چمن کی کیاریوں میں جس طرح پھول کا پودا اپنی تازگی میں مست ہے۔ کانٹے کا جھاڑ بھی مگن ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ سارا چمن اسی کا ہے اور اسی کیلئے ہے۔ اس جھاڑ سے اگر پوچھا جائے تو اسے اس کا احساس نہیں کہ وہ کانٹا ہے اور دنیا کی نگاہوں میں ذلیل ہے۔ اسے اگر اس کا احساس ہوتا تو وہ چمن کی کیاری کے پاس بھی نہ جاتا، بلکہ اس کی نظر میں کچھ اپنی خوبیاں ہیں۔ اس کو احساس ان خوبیوں کا ہے۔ اسی لئے وہ چمن کی کیاری میں پھوک کے پودے سے زیادہ سینہ زور ہے اور اپنی آن میں مست ہے۔ پس داعی الی اللہ کا فرض ہے کہ دعوت اور تبلیغ کے وقت وہ اس فلسفہ قدرت کو سامنے رکھے۔ اگر وہ کانٹے کی اصلاح چاہتا ہے تو اس کو خار ہونے کا طعن دیکر اصلاح نہیں کر سکتا۔ بلکہ اس کی اصلاح جب ہوگی جب اس ذہنیت کی اصلاح ہو کہ وہ کانٹا ہے مگر اپنے آپ کو پھول کا ہمدوش سمجھتا ہے بلکہ خیابان پر پھول سے زیادہ اپنا حق جتاتا ہے۔

آیت میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اگر خدا چاہتا تو انسان کو بھی حیوانات کی طرح بنا دیتا کہ سب اپنی حالت میں ایک ہی طرح کے ہوتے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا نہیں چاہا۔ اس نے انسان کی طبیعت ہی ایسی بنائی ہے کہ ہر گروہ میں اپنی اپنی رائے اور اپنی اپنی پسند رکھتا ہے اور ہر گروہ کی نظر میں وہی کام اچھا ہے جو وہ کر رہا ہے۔ تمہاری نظر میں اس کی راہ کتنی ہی بری ہو، لیکن اسکی نظر میں وہ ایسی اچھی ہے جیسی تمہاری راہ تمہاری نظر میں۔ پس ضروری ہے کہ اس بارے میں برداشت اور رواداری سے کام لو۔ جو لوگ شرک و بت پرستی میں مبتلا ہیں تم انہیں دعوت حق دو مگر برا بھلا نہ کہو۔ اگر تم ان کے بتوں کو برا بھلا کہو گے تو وہ بھی خدا کو برا بھلا کہیں گے۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ تم انہیں گالیاں دوگے وہ تمہیں گالیاں دینگے۔ طلب حق کی بات نہیں رہے گی۔ گالی گلوچ کی بات ہو جائے گی۔

---

❷ سورہ ۲۲ الحج آیت ۳۱

❸ سورہ ۴ نساء آیت ۱۱۵

❹ سورہ ۷ الاعراف آیت ۳۹

لامذہب کے منکر پرست اور خدا کے منکر (معاذ اللہ):

هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ حَتّٰٓي اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ ۚ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَاۗءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّجَاۗءَھُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْٓا اَنَّھُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ڬ لَىِٕنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿٢٢﴾ فَلَمَّآ اَنْجٰىھُمْ اِذَا ھُمْ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ يٰٓاَيُّھَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِكُمْ ۙ مَّتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۡ ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٢٣﴾

(سورہ یونس آیت ۲۲و۲۳)

”وہی ہے جس نے تمہارے لئے سطح زمین پر اور سمندر میں سیر وسیاحت کا سامان کر دیا ہے۔ پھر جب ایسا ہوتا ہے کہ تم جہازوں میں سوار ہوتے ہو اور جہاز موافق ہوا پا کر تم کو لے اڑتے ہیں مسافر خوش ہوتے ہیں (کیسی اچھی ہوا چل رہی ہے) پھر اچانک ہوائے تند کے جھونکے آ پہنچتے ہیں اور ہر طرف سے موجیں اٹھ اٹھ کر گھیر لیتی ہیں اور مسافر خیال کرتے ہیں کہ بس اب ان میں گھر گئے (اور بچنے کی کوئی امید باقی نہیں رہی) تو اس وقت انہیں (خدا یاد آتا ہے) وہ دل کے اخلاص کے ساتھ اسے پکارنے لگتے ہیں: اے خدا اگر اس مصیبت سے نجات دیدے تو ہم ضرور تیرے شکر گزار ہونگے پھر (دیکھو) جب اللہ انہیں نجات دے دیتا ہے تو اچانک اپنا عہد وپیمان بھول جاتے ہیں اور ناحق ملک میں سرکشی اور فساد کرنے لگتے ہیں۔ اے لوگو! تمہاری سرکشی کا وبال خود تمہاری جانوں پر پڑنے والا ہے۔ یہ دنیا (چند روزہ) زندگی کے فائدے ہیں۔ اٹھالو پھر تمہیں ہماری طرف لوٹ کر آنا ہے۔ اُس وقت ہم تمہیں بتائیں گے کہ جو کچھ دنیا میں کرتے رہے، اس کی حقیقت کیا تھی۔“

تشریح: یہ ایک ایسی مثال ہے، اس طرح کی صورتیں انسان کی زندگی کے اتار چڑھاؤ میں اکثر پیش آتی رہتی ہیں کہ تمام ذرائع اور وسائل ختم ہو جاتے ہیں کوئی سہارا باقی نہیں رہتا۔ فطرت انسان اس وقت بیدار ہوتی ہے۔ وہ لامحالہ ایک بن دیکھی ہستی کی طرف متوجہ ہوتی ہے جس کو وہ قادر، کارساز اور بگڑی کا بنانے والا سمجھتی ہے، وہی خدا ہے۔

قرآن شریف کا تقریباً ایک تہائی حصہ اس طرح کی مثالوں سے بھرا ہوا ہے، جن میں خود انسان کے مشاہدات، تجربات اور خود اس کے وجدانی جذبات کو پیش کر کے خداوند عالم کے وجود اور اس کی صفات قدسیہ کو ثابت کیا گیا ہے اور داعی الی اللہ کے لئے ناقابل تردید دلائل کا ذخیرہ جمع کر دیا گیا ہے۔ مثلاً بحری سفر ہی کی ایک مثال دوسرے عنوان سے سورہ بنی اسرائیل میں دی گئی ہے ترجمہ یہ ہے:

”اے لوگو! تمہارا رب وہ ہے جو تمہاری کاربرآریوں کے لئے سمندر میں جہاز چلاتا ہے تاکہ تم اس کا فضل تلاش کرو، (بحری راستوں سے فائدے اٹھاؤ) بلاشبہ وہ تم پر بڑی ہی رحمت کرنے

والا ہے۔ اور جب کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تم سمندر میں ہوتے ہو اور مصیبت آ لگتی ہے تو اس وقت وہ تمام ہستیاں تم سے کھو جاتی ہیں جنہیں تم پکارا کرتے ہو، صرف ایک اللہ ہی کی یاد باقی رہ جاتی ہے۔ پھر جب وہ تمہیں مصیبت سے نجات دے دیتا اور خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو اس سے گردن موڑ لیتے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔ پھر کیا تمہیں اس سے امن مل گیا ہے کہ وہ تمہیں خشکی کے کسی گوشے میں دھنسا دے۔ یا تم پر پتھر برسانے والی آندھیاں بھیج دے، اور تم اس حالت میں کسی کو اپنا مددگار نہ پاؤ، یا تم اس بات سے بے خوف ہو گئے ہو کہ اللہ تمہیں دوبارہ ویسی ہی مصیبت میں ڈال دے اور ہوا کا ایک سخت طوفان بھیج دے اور تمہاری ناشکری کی پاداش میں تمہیں غرق کر دے، پھر کسی کو نہ پاؤ جو اس کے لئے ہم پر دعویٰ کرنے والا ہو۔ اور البتہ ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور خشکی اور تری دونوں کی قوتیں اس کے تابع کر دیں کہ اسے اٹھائے پھرتی ہیں۔ اور اچھی چیزیں اس کی روزی کے لئے مہیا کر دیں۔ نیز جو مخلوقات ہم نے پیدا کی ہے ان میں اکثر پر اُسے برتری دیدی، پوری برتری جیسی کہ ہونی چاہئے۔ (بنی اسرائیل آیت ۶۵ تا ۷۰)

طرز عمل

(الف) لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (سورہ ۲ بقرہ رکوع ۲۴ آیت ۲۵۶)

"نہیں کوئی زور (جبر و قہر یا زبردستی) دین کی بات میں [1] کیونکہ دین کا مدار [2] اس پر ہے کہ دل مان لے [1] اور تسلیم کر لے [2]۔ جبر و قہر سے زبانی اقرار کرایا جا سکتا ہے۔ دل سے منوایا نہیں

---

[1] ترجمہ حضرت شاہ عبد القادر رحمتہ اللہ۔

[2] اذالاکراہ الزام الغیر فعلاً لایرضی بہ الفاعل وذا لایتصور الافی افعال الجوارح اما الایمان فھو عقد القلب وانقیادہ لایوجد بالاکراہ (تفسیر مظہری) وغیرہ۔

[1] ایک مسلمان اگر اسلام سے برگشتہ ہو کر معاذ اللہ کفر اختیار کرتا ہے تو اس کی وہ سزا ہے جو باغی کی ہوتی ہے یعنی وہ واجب القتل ہے۔ لیکن ایسا شخص جس سے جبراً قہراً اقرار کرالیا گیا وہ اگر اسلام سے منحرف ہوتا ہے تو کتب فقہ میں صراحت کر دی گئی ہے کہ اس کو قتل نہیں کیا جائیگا۔ بدایہ اخیرین میں ہے ولو اکرہ علی الاسلام حتی حکم بالاسلام ثم رجع لم یقتل (کتاب الاکراہ) یعنی اگر مجبور کر کے مسلمان بنالیا گیا یہاں تک کہ اسلام کے احکام اس پر جاری ہو گئے (مثلاً مسلمان رشتہ دار کا ترکہ اس کو مل گیا یا کسی مسلمان عورت سے اس کا نکاح کرا دیا گیا وغیرہ) پھر اس نے اسلام سے رجوع کر لیا اور عدالت میں بھی یہی بیان دے دیا کہ اس کو جبراً مسلمان بنایا گیا تھا تو مرتد کی سزا (قتل) اس کو نہیں دی جائے گی۔ شرح میر کبیر میں یہ ضابطہ بیان کیا گیا ہے۔ اقرار المکرہ باطل سواء کان الاکراہ بالجبر او القتل (شرح میر کبیر ص ۲۷ ج ۴) یعنی جس سے زبردستی کچھ کہلوا لیا گیا اس کا یہ اقرار باطل (قطعاً نا قابل اعتبار ہے) خواہ اس کو قید کی دھمکی دی گئی ہو یا قتل کی۔

جاسکتا۔ کوشش یہ کرو کہ دل کی آنکھیں کھلیں، گمراہی کو گمراہی اور ہدایت کو ہدایت سمجھنے لگے۔

(ب) اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ﴿۳۴﴾

(حم السجدہ۔ ۳۴)

"برائی کا جواب دو ایسی صورت میں کہ وہی صورت سب سے اچھی (اخلاقاً سب سے زیادہ موثر) ہو تو تم دیکھو گے کہ جس سے تمہاری دشمنی ہے وہ ایسا ہو جائیگا جیسے مخلص دوست (سرگرم محبت)۔"

(ج) وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ۖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَیْرٌ لِّلصّٰبِرِیْنَ ﴿۱۲۶﴾

(نحل۔ آیت ۱۲۶)

"اور اگر مخالفوں کی سختی کے جواب میں سختی کرو تو چاہئے کہ ویسی ہی اور اتنی ہی کرو جیسی تمہارے ساتھ کی گئی۔ اور اگر تم نے صبر کیا (جھیل گئے اور سختی کا جواب سختی سے نہیں دیا) تو بلاشبہ صبر کرنے والوں کے لئے صبر ہی بہتر ہے۔

تشریح: (۱) قانون یہ ہے:

وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا (آیت ۴۰ سورہ ۴۲ شوریٰ)

"برائی کی سزا اسی جیسی برائی ہے۔"

(۲) داعی الی اللہ اگر اس ضابطہ پر عمل کرتے ہوئے سختی کے جواب میں بالکل اتنی ہی اور اس جیسی ہی سختی کرے تو اس کے جواز سے انکار نہیں ہے مگر اس سے برائی اور سختی کا سلسلہ ختم نہیں ہو گا۔ کیونکہ جواب میں جو چیز وجود میں آرہی ہے وہ بھی سختی اور برائی ہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ابتداءً نہیں ہے جواباً ہے۔

(۳) جب کوئی شخص مقام دعوت اپنائے ہوئے ہے تو یہ ناپ تول اس کی شان کے شایان نہیں ہے۔ اس کی شایان شان یہ ہے کہ وہ ضبط و تحمل اور صبر سے کام لے اور جواب وہ دے جو اس کی شان کے لحاظ سے بہت ہی بہتر ہو۔

(۴) داعی الی اللہ کا نصب العین یہ ہونا چاہئے کہ وہ ایسی صورت اختیار کرے اور اس کی کوشش کرے کہ برائی کا سلسلہ ختم ہو۔ جس کی شکل مثلاً یہ ہے کہ جو دشمن ہیں وہ سرگرم محبت دوست بن جائیں۔

(۵) یہ بات بہت اونچی ہے۔ ہر شخص اس درجہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ اس اونچے درجے کو وہی حاصل

---

② حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ قبیلہ بنی سالم میں عوف کے ایک انصاری صاحب جن کا اسم گرامی حصین رضی اللہ عنہ تھا ان کے دو لڑکے مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت چاہی کہ وہ لڑکوں کو مجبور کریں کہ وہ اسلام لے آئیں اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ لَآ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ (تفسیر مظہری وغیرہ) دین کی بات میں زور زبردستی نہیں ہے۔

کر سکتا ہے جو بڑا صاحب نصب ہو۔ (آیت ۳۵، سورہ حم سجدہ)

بدی را بدی سہل باشد جزا اگر مردی احسن الیٰ من اسا

خلاصہ

(۱) داعی جس بات کی دعوت دے ضروری ہے کہ اس کے متعلق اس کو پورا یقین ہو، جیسے مشاہدہ کرنے والے کو اپنے مشاہدہ کا یقین ہوتا ہے اور وہ اس پر شاہد ہوتا ہے۔

(۲) ضروری ہے کہ داعی کی فطرت بااحساس ہو، ہمدرد اور غم خوار ہو۔ اس کے اندر شفقت ہو، درد ہو، سوز ہو، گداز ہو، وہ شمع یا چراغ کی طرح ہو۔

(۳) دعوت اس کے درد کا فغان ہو۔ اس کے سوز دروں کا شعلہ ہو۔

(۴) داعی مشفق طبیب کی طرح ہو اور اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ داعی اس شفقت اور اس ہمدردی اور خیر خواہی کا پیکر اور مجسمہ ہو جو شفقت و ہمدردی باپ کو اپنی اولاد سے ہوتی ہے۔

(۵) باپ کی تمنائیں اچھی ہی ہوتی ہیں۔ وہ اپنی اچھی تمناؤں کا خواب دیکھتا ہے تو اولاد کو بشارت بھی دیتا ہے کہ یہ کرلو گے تو اعلیٰ درجہ پالو گے۔ اور یہ بات بہت ہی درد اور دکھ کی ہوتی ہے کہ اولاد ناہنجار اور بدکار ہو، یہ اس کی بدکاری کو دیکھ کر گھٹے، رنجیدہ ہو اور اولاد کو اس کی بدکاری کے خطرناک نتائج پر بار بار آگاہ اور متنبہ کرے۔

پس باپ اپنی فطری تمناؤں کے لحاظ سے پہلے مبشر ہوتا ہے اور نذیر مجبوراً ہوتا ہے۔ یہی شان داعی کی بھی ہوگی۔ وہ پہلے مبشر ہوگا اور نذیر بدرجہ مجبوری ہوگا۔

(۶) دعوت کا انداز سنجیدہ اور دانش مندانہ ہو۔ وہ مخاطب کو جانچے، تولے، پرکھے پھر اس کی صلاحیت کے بموجب دعوت کا طرز اختیار کرے۔ اہل دانش سے دانش مندانہ، عوام سے ان کے حال کے بموجب وعظ و پند اور خیر خواہانہ نصیحت کا اسلوب اختیار کرے۔ اور جو بحث کے شوقین ہوں ان سے گفتگو مدلل ہو۔

(۷) مخاطب کے مذہب کے لحاظ سے بھی دعوت کا انداز جدا جدا ہوگا۔ اہل کتاب کو دعوت اور طرح دی جائے گی، مشرک کو اس کے بموجب اور منکرین خدا، عقل پرستوں سے افہام و تفہیم کا طرز و انداز جدا ہوگا۔ [1]

---

[1] نمبر ۶ و ۷ پر عمل جب ہی ہو سکے گا جب مخاطب کے مذہب سے واقفیت ہو۔ دعوت و تبلیغ کا نظام قائم کرنا اجتماعی فریضہ ہے ۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر ایک داعی جملہ مذاہب سے واقف ہو۔ لیکن جس حلقہ کو دعوت کے لئے منتخب کیا جائے اس کے لئے داعی معین ہوں۔ اور وہ اس حلقہ کے مذہبی رجحانات ' معاشرتی رسومات و میلانات اور جذبات سے واقف ہوں۔

(۸) داعی کے مزاج میں ضبط و تحمل ہو۔ وہ گستاخیوں اور سختیوں کو برداشت کرے، کڑوی بات کا جواب میٹھے بول سے دے۔ مخالف کو موافق اور دشمن کو دوست بنائے۔

(۹) داعی الی اللہ کا تعلق اپنے رب سے (جس کی طرف وہ دعوت دے رہا ہے) مضبوط ہو۔ اس کا اعتماد اور بھروسہ خدا پر ہو۔ وہ دعوت کو اپنا ایک فریضہ سمجھے جس کی ادائیگی اس کے ذمہ ہے۔ نتیجہ خدا کے حوالے کر دے۔

"محمد رسول اللہ ﷺ داعی اعظم بلکہ تمام داعیان حق کے امام و مقتدا تھے قرآن پاک کی مندرجہ بالا آیتیں اور اس طرح کی بہت سی آیتیں شہادت دے رہی ہیں کہ داعی الی اللہ کے جملہ اوصاف و خصوصیات بدرجہ اتم و اکمل آنحضرت ﷺ کے اندر موجود تھے۔"

("کان خلقه القرٰان" عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا)

بلکہ حق یہ ہے کہ آپ کی ذات باجود منبع اور مرکز تھی۔ اوصاف داعی اور خصوصیات دعوت اس سے اخذ کئے جاتے ہیں۔

حضرت حق جل مجدہ نے جب آپ کو تمام امتوں اور پوری کائنات انسانی کے لئے داعی بنایا تو ہر ایک فرقہ اور ہر ایک گروہ سے خطاب کرنے کا طریقہ بھی بتا دیا۔ قرآن حکیم ان سب کا مجموعہ ہے۔ چند مثالیں اوپر گزر چکی ہیں۔

دعوت الی اللہ کی دشوار گذار گھاٹی "جہاد فی سبیل اللہ"

یقیناً دعوت الی اللہ کے سلسلہ میں کوئی جبر و قہر اور کوئی زبردستی نہ ہونی چاہئے۔ بے شک داعی حق کا کام صرف یہ ہے کہ دلوں کے دروازوں پر دستک دیدے۔ اگر کوئی نہیں کھولتا تو بلاشبہ اس کو حق نہیں کہ کسی دروازے کو زبردستی کھولے یا کسی دریچے کو توڑے۔

یہ بھی درست ہے کہ داعی الی اللہ کو صبر و تحمل اور مسلسل برداشت سے کام لینا چاہئے۔ لوہے کے کنگھے سے اس کا گوشت کھرچا جائے، اس کی بوٹیاں نوچی جائیں، اس کو کھولتے ہوئے کڑہائی میں ڈال دیا جائے۔ اس کے سر پر آرہ رکھ کر پورا بدن چیر کر دو ٹکڑے کر دیئے جائیں، تو اس کا کمال یہی ہے کہ وہ ضبط و تحمل، صبر اور برداشت سے کام لے، ظالم کے حق میں یہی دعا کرے، اللّٰھم اھد قومی فانھم لایعلمون (اے اللہ میری قوم کو سیدھا راستہ دکھا دے، وہ مجھے جانتے نہیں ہیں)۔ لیکن اگر شکل یہ ہو کہ مخلوق خدا ظلم کی چکی میں پیسی جا رہی ہو، رائے کی آزادی سلب کر لی گئی ہو، پیٹ کو اگرچہ آسودگی میسر ہو مگر ضمیر کی آزادی پر تالے پڑے ہوئے ہوں، طائر فکر کو آہنی قفس میں گھونٹ دیا گیا ہو، ایک شخص کا ضمیر ایک بات کو حق سمجھتا ہو، وہ مضطر اور بے

چین ہو کہ اس حق کو قبول کرلے، مگر اس کو مجبور کیا جا رہا ہو کہ وہ اپنے ضمیر کے فیصلہ پر عمل نہ کرے، وہ حق کو حق نہ سمجھے بلکہ غلط اور باطل کو حق سمجھے۔ اگر وہ اپنے ضمیر کے فیصلہ پر عمل کرے اور باطل کے دائرے سے نکلنا چاہے تو پہلے اپنی جان سے ہاتھ دھولے، پہلے پھانسی کا پھندا گلے میں ڈالے۔ پھر قدم بڑھانے کا ارادہ کرے۔

اگر صورت حال یہ ہو تو کیا داعی حق کا فرض اب بھی یہی ہو گا کہ وہ ظلم کے شعلوں کو بھڑکتا ہوا دیکھتا رہے۔ اور ان کو بجھانے کی کوشش نہ کرے۔ وہ مظلوموں کو جھلستا ہوا دیکھے اور ان کی آہیں سنے اور اپنی جگہ سمٹا ہوا بیٹھا رہے، ظالم کا ہاتھ روکنے کی کوشش نہ کرے۔ اگر اس وحشت انگیز صورت حال کو ختم کرنے کے لئے داعی کے پاس کوئی چارہ کار نہیں ہے تو اس کی دعوت کا پروگرام ناقص ہے، ادھورا ہے، ناقابل قبول ہے۔

اگر داعی کی دعوت کا تعلق کسی خاص گروہ سے ہے اور اسی گروہ کے نجات دہندہ کی حیثیت سے ظہور پذیر ہوا ہے تب بھی ممکن ہے کہ اس گروہ کے علاوہ باقی مخلوق سے اس کا کوئی واسطہ نہ ہو، کوئی ظالم ہو یا مظلوم، لیکن اگر داعی سارے جہان کا درد اپنے دل میں لے کر آیا ہے۔ اس کی خیر خواہی اور خیر اندیشی کا رشتہ پوری نوع انسان اور نوع انسان کے ہر طبقہ سے جڑا ہوا ہے، اس کا نصب العین یہ ہے کہ تمام دنیا جہان کیلئے رحمت ہو، ہر ایک کے درد کا درمان اور ہر ایک کے دکھ کا علاج ہو، تو لامحالہ اس کا فرض ہو گا کہ وہ ظالم کی اس چیرہ دستی کو ختم کرے اور مظلوموں کی آہ و بکا اور گریہ وزاری کو قلب مضطر کے کانوں سے سنے وہ ان کی فریاد رسی کے لئے اٹھے اور اس عزم کے ساتھ اٹھے کہ

یا جاں رسد بجاناں یا جاں ز تن بر آید

یہی وہ جد وجہد ہے جو داعی پر بحیثیت داعی فرض ہے اور جس کو اسلام جہاد فی سبیل اللہ کہتا ہے

-

تمام جہانوں کا رب اور ساری مخلوق کا پروردگار اہل ایمان کو خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ﴿۷۵﴾

(سورہ نساء آیت ۷۵)

"اور مسلمانو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں جنگ نہیں کرتے حالانکہ کتنے ہی بے بس مرد ہیں، کتنی ہی عورتیں ہیں، کتنے ہی بچے ہیں (جو ظالموں کے ظلم سے عاجز آکر) فریاد کر رہے ہیں، خدایا ہمیں اس

بستی [1] سے جہاں کے باشندوں نے ظلم پر کمر باندھ لی ہے، نجات دلا۔ اور اپنی طرف سے کسی کو ہمارا کارساز بنادے اور کسی کو مددگاری کے لئے کھڑا کردے۔"

یہ ہے جہاد فی سبیل اللہ۔ کیا اس کو دعوت الی اللہ کا ایک نہایت ضروری شعبہ نہیں کہا جائیگا۔ اور کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ دعوت الی اللہ بے دست و پا رہے گی، جب تک اس میں قوت مقابلہ نہ ہو جو ظالم کے ہاتھ روک سکے اور مظلوموں کو نجات دلانے کے لئے اقدام بھی کر سکے۔

یہ جہاد کب تک رہے گا؟ رب العالمین نے اس کی یہ حد بیان فرمائی ہے۔

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ ۚ (سورہ الانفال آیت ۳۹)

"ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ ظلم و فساد [1] باقی نہ رہے اور دین کا سارا معاملہ [2] اللہ ہی کے لئے ہو جائے (انسان کا ظلم [3] اس میں مداخلت نہ کر سکے)۔"

---

[1] نزول آیت کے وقت یہ حالت مکہ کی تھی کہ وہاں بہت سے مسلمان مشرکین مکہ کے ظلم و ستم کا تختہ مشق بنے ہوئے تھے۔ ابو جہل کے حقیقی بھائی حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ ان کے ماں شریک بھائی عیاش بن ابی ربیعہ رضی اللہ عنہ اور مکہ کے رئیس اعظم ولید بن مغیرہ کے لڑکے کہ ان کا نام بھی ولید ہی تھا (ولید بن الولید) مسلمان ہو گئے تھے۔ ان کو باندھ کر ڈال دیا گیا تھا کہ ہجرت نہ کر سکیں ۔اس طرح اور بھی عورتیں اور مرد تھے جو مجبور و مقہور تھے اور مکہ سے نکل نہیں سکتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نمازوں میں ان کے لئے دعا کیا کرتے تھے (بخاری شریف ص ۱۱۰ و ص ۱۳۶ ص ۹۴۶ وغیرہ)۔ لیکن ظاہر ہے آیت میں مکہ کی قید نہیں۔ جب بھی اور جہاں بھی یہ صورتحال ہو تو مسلمانوں کو جہاد کی ہدایت کی گئی ہے۔ بیشک دور حاضر کا بین الاقوامی قانون یہ ہے کہ کسی مملکت کے اندرونی معاملات میں دخل دینے کا کسی دوسرے ملک کو حق نہیں ہے۔ مگر ظاہر ہے یہ بین الاقوامی قانون انسانی ہمدردی اور خلق خدا کے فلاح و بہبود کے جذبہ سے ناآشنا ہے، کیونکہ دور حاضر کی حکمراں قوموں کا نصب العین صرف یہ ہے کہ ان کا اقتدار باقی رہے اور عظمت کے جس مینارہ پر وہ رونق افروز ہیں اس میں جنبش نہ آئے۔ بیشک ان قوموں کے افراد میں خلق خدا کی ہمدردی کا جذبہ موجود ہے اور اسی جذبہ کی بنا پر ان کے یہاں بہت سے خیراتی ادارے اور بڑے بڑے خیراتی فنڈ قائم ہیں۔ مگر ان کی حکومتوں کا نصب العین نہ خلق خدا کی خدمت ہے نہ انسانی ہمدردی، نہ کوئی اخلاقی اور روحانی دعوت ان کے مقاصد میں داخل ہے۔ یہی سبب ہے کہ ممالک کی اندرونی تحریکات خواہ کتنی ہی انسانیت کش اور ہلاکت انگیز ہوں مگر بین الاقوامی پنچایت کوئی مداخلت نہیں کرتی۔ اسلام اس سنگدلی کو برداشت نہیں کرتا۔

[1] آیت میں لفظ فتنہ ہے یعنی لڑتے رہو جب تک فتنہ نہ رہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے اس کی تفسیر یہ فرمائی: کان الاسلام قلیلا کان الرجل یفتن فی دینہ اما قتلوہ و اما یعذبوہ حتی کثر الاسلام فلم تکن فتنہ۔ بخاری شریف ص ۶۴۸ یعنی مسلمان تھوڑے تھے، جو شخص مسلمان ہوتا وہ اپنے دین کے بارے میں مصیبت میں مبتلا ہو جاتا تھا یا اس کو قتل کر دیتے تھے یا عذاب میں مبتلا کر دیتے تھے یہاں تک کہ اسلام کی کثرت ہو گئی تو یہ فتنہ نہ رہا۔ یعنی مخالفین دین کا ظلم و فساد نہیں رہا۔

[2] یعنی اعتقاد کی آزادی حاصل ہو جائے اور دین کا معاملہ جس کا تعلق صرف اللہ سے ہے خدا اور انسان کا باہمی معاملہ ہو جائے انسان کے ظلم و تشدد کی مداخلت باقی نہ رہے۔

[3] اس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ وہ ملک جہاں اس طرح کا بیجا دباؤ اور ظلم و زیادتی ہو وہ اسلامی حکومت کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہوئے باجگذار ہو جائے یا وہ افراد جو اس طرح کے ظلم میں شریک اور اس کے معاون و مددگار ہیں اسلامی حکومت

خطابات و عمومی ارشادات

مکہ معظمہ سے تشریف لا کر چند روز قبا میں قیام رہا۔ پھر جمعہ کے روز قبا سے روانہ ہوئے تو قبیلہ بنی سالم بن عوف کے میدان [4] میں جمعہ کی نماز [5] پڑھی۔ پھر آپ مدینہ منورہ میں رونق افروز ہوئے۔ ان مقامات پر آپ نے جو تقریریں فرمائیں مورخین نے ان کو جمع کیا ہے۔ وہ تقریریں ابن اسحاق نے نقل [6] کی ہیں۔ ان کا ترجمہ یہاں پیش کیا جارہا ہے۔

(۱)

"ایہاالناس! (اے لوگو) خوب سمجھ لو، کچھ پہلے سے بھیج دو، جو خود تمہارے کام آئے گا۔ خدا کی قسم یقیناً ایسا ہو گا کہ ہر شخص پر (قیامت کی) بے ہوشی طاری ہو گی (جس کے پاس جو کچھ ہے یہیں رہ جائے گا) بکریوں والا بکریاں چھوڑ جائے گا ان کا کوئی گلہ بان نہ ہو گا۔ وہ اپنے رب کے سامنے کھڑا ہو گا یقیناً ایسا ہو گا کہ اس کا پروردگار براہ راست اس سے خطاب فرمائے گا، نہ کوئی بیچ میں ترجمان ہو گا نہ کوئی رکاوٹ کی چیز درمیان میں حائل ہو گی (جو اس کے لئے آڑ بن سکے) اس کا پروردگار کہے گا: کیا میرے رسول نے تمہارے پاس پہنچ کر تبلیغ نہیں کی تھی، کیا یہ تمام باتیں تمہیں نہیں بتادی تھیں، کیا میں نے تجھ کو مال نہیں دیا تھا؟ کیا تیرے اوپر میں نے اپنا فضل نہیں کیا تھا، پس بتا تو خود اپنے لئے کیا لے کر آیا ہے۔ یہ شخص اپنے دائیں دیکھے گا، اپنے بائیں دیکھے گا، اسکی دولت کا کہیں نام و نشان نہ ہو گا، وہ آگے کی طرف نظر ڈالے گا وہاں دہکتے ہوئے جہنم کے سوا کچھ نظر نہ آئے گا۔ بس دیکھو دوزخ کی آگ سے اپنے آپ کو بچاؤ، جو کچھ امکان میں ہو خرچ کرو اور اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ۔ کچھ نہ ہو چھوارے کا ایک ریزہ ہو، وہی خرچ کرو، جس کے پاس یہ بھی نہ ہو وہ میٹھے بول، اچھی بات سے غریبوں کی دلداری کرے، اس کا بھی اس کو ثواب ملے گا۔ نیکی کا ثواب دس گنے سے شروع ہوتا ہے اور سات سو گنے تک پہنچتا ہے۔ والسلام علیکم ورحمتہ اللہ

کے تحت میں آکر حفاظتی ٹیکس (جزیہ) ادا کرنے لگیں۔ حکومت ان کی جان و مال کی عزت و آبرو کی حفاظت کی ذمہ دار ہو جائے، سورہ ۹ توبہ آیت ۲۸ میں اس کا تذکرہ فرمایا گیا ہے۔

[4] اس میدان کا نام وادی رانوناء ہے۔ البدایہ والنہایہ ص ۲۱۲ ج ۳

[5] اس موقع پر جو آپ نے خطبہ ارشاد فرمایا حافظ ابن کثیر نے ابن جریر کے حوالہ سے اس کو نقل کیا ہے ملاحظہ ہو ص ۳۱۲ البدایہ والنہایہ جلد ۳ یہ طویل خطبہ ہے اس کے کچھ حصے خطبات ماثورہ میں بھی دیئے گئے ہیں

[6] سیرۃ ابن ھشام ص ۳۰۰ و ص ۳۰۱ ج ۱

وبرکاتہ "

(۲)

"بیشک تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں۔ میں اس کی حمد کرتا ہوں اس سے مدد مانگتا ہوں، ہم اپنے نفسوں کی شرارت سے اور اپنے اعمال بد کے شر سے خدا کی پناہ لیتے ہیں۔ جس پر اللہ تعالیٰ ہدایت کے راستے کھول دے، پھر کوئی اس کو گمراہ نہیں کر سکتا، اور جس کو بھٹکا دے تو کوئی نہیں ہے جو اس کو سیدھی راہ پر لگا سکے۔

میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ وہ تنہا ہے اور اسکا کوئی شریک نہیں، وہ اکیلا ہے اس کا کوئی ساجھی نہیں ہے۔ بیشک سب سے اچھا کلام کتاب اللہ ہے۔ یقیناً وہ شخص کامیاب ہے جس کے دل میں اللہ تعالیٰ اپنے کلام کو سجادے اور جس کو اللہ تعالیٰ کفر سے ہٹا کر اسلام میں داخل کر دے۔ یقیناً وہ شخص کامیاب ہے جس نے انسانوں کے کلام اور ان کے قصوں کے مقابلے میں اللہ کے کلام کو منتخب کیا ہو، کیونکہ کلام اللہ ہی سب سے بہتر بات، سب سے بہتر کلام، اور سب سے بلیغ قصہ ہے۔

(دیکھو) اس سے محبت کرو، جو اللہ سے محبت کرتا ہے (دیکھو) خدا سے محبت کرو، دل کی گہرائی سے اپنے دلوں کو اسی میں لگادو۔ اللہ کے کلام اور اس کے ذکر سے نہ اکتاؤ۔ تمہارے دلوں میں یہ سختی ہر گز نہ ہو کہ تم اس کی یاد سے غافل ہو جاؤ۔

(یاد رکھو اور سمجھ لو) اللہ تعالیٰ جو مخلوق پیدا کرتا ہے اس میں سے کچھ کو منتخب کر کے اپنے لئے مخصوص کر لیتا ہے۔ جو اعمال اس کو پسند ہیں۔ جن بندوں کو وہ پسند کرتا ہے جو بات اس کو پسند ہے، اس نے نام لیکر ان کو بتادیا ہے اور معین کر دیا ہے (تم بھی اسی کو پسند کرو) اس نے حلال اور حرام کو کھول کر بتادیا ہے۔ بس اللہ کی عبادت کرو، کسی کو اس کا شریک نہ گردانو، پورا پورا تقویٰ کرو، تمہاری زبان سے جو باتیں نکلتی ہیں ان میں یہ خوبی پیدا کرو کہ ان سے اللہ تعالیٰ کی تصدیق ہو، وہ اس کی مرضی کے مطابق ہوں۔ اللہ کی بھیجی ہوئی روح (ذات اقدس محمد رسول اللہ ﷺ) تمہارے درمیان ہے اس سے پوری پوری محبت کرو، تمہاری فطرت اپنے رب سے ایک عہد کئے ہوئے ہے (کہ رب وہی ہے اس کے سوا کوئی رب نہیں ہے) اس عہد کو پورا کرو۔ اللہ تعالیٰ کا غضب اس پر نازل ہوتا ہے کہ اس عہد و پیمان کو توڑا جائے، جو فطرت انسان اپنے رب سے کئے ہوئے ہے۔"

مدینہ طیبہ میں سب سے پہلا خطبہ جمعہ

حافظ عماد الدین ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ابن جریر کے حوالے سے وہ پورا خطبہ نقل کیا ہے جو آنحضرت ﷺ نے بنی سالم بن عمرو بن عوف میں نماز جمعہ کے وقت ارشاد فرمایا تھا۔ ہم اس خطبہ کو تبرکا پورا نقل کرتے ہیں۔ اس کے بعد ترجمہ بھی کر دیا گیا ہے۔ ائمہ صاحبان جمعہ کے روز یہ خطبہ پڑھیں تو نور علیٰ نور و سعادت بالا سعادت کا مصداق ہو:

خطبہ التقویٰ:

ترجمہ: "میں اللہ تعالیٰ کی حمد کرتا ہوں، اس سے مدد کی درخواست کرتا ہوں، گناہوں کی مغفرت چاہتا ہوں اور نیک ہدایت کی التجا کرتا ہوں۔ میں اس پر ایمان لاتا ہوں، میں اس ذات برحق کا منکر نہیں ہوں، میں اس کا دشمن ہوں جو اس ذات برحق کا انکار کرے۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ جو یکتا اور تنہا ہے اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے اس خدا کا کوئی شریک اور ساجھی نہیں ہے اور میں شہادت دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ [1] اللہ تعالیٰ نے اپنے اس رسول محمد کو ہدایت، دین حق، نور کامل اور پند و نصیحت اور حکمت و دانش کی نعمتیں سپرد کر کے ایسے وقت مبعوث فرمایا کہ صدیاں گزر گئی تھیں، سلسلہ رسالت منقطع ہو چکا تھا، علم مولیٰ ناپید اور مفقود تھا۔ گمراہی کی گرم بازاری تھی، نور ہدایت پر اندھیری چھائی ہوئی تھی۔ (دوسری طرف حالت یہ ہے کہ) یہ دنیا جس کو زمانہ کہتے ہیں اس کا سلسلہ ازل سے چل رہا ہے اب ٹوٹنے کے قریب ہے۔ قیامت سر پر ہے اور اس عالم کی آخری میعاد ختم ہو رہی ہے (اب اللہ تعالیٰ کا کوئی اور پیغام آنے والا نہیں ہے) اب جس نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کی اس نے ہدایت اور کامیابی حاصل کر لی اور جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت سے روگردانی کر رہا ہے وہ گمراہ ہے اپنا فرض ادا کرنے میں حد سے زیادہ کوتاہی کر رہا ہے اور صحیح راستہ سے بہت دور بھٹک رہا ہے۔

اے لوگو! میں تمہیں اللہ تعالیٰ سے تقویٰ کرنے کی وصیت کرتا ہوں [1] اور دیکھو سب سے بہتر نصیحت جو ایک مسلمان دوسرے کو کرے یہی ہے کہ اس کو آخرت پر آمادہ کرے (یعنی ایسے کاموں کا شوق دلائے جو مرنے کے بعد کار آمد ہوں) اور یہ کہ خدا ترسی کی ہدایت کرتا رہے اور تاکید کرتا رہے کہ

---

[1] اپنے رسول اور نبی ہونے پر یقین رکھنا نبی اور رسول کو بھی ضروری ہے۔ گورنر فرائض منصبی جب ہی ادا کر سکتا ہے جب اس کو اپنے گورنر ہونے کا یقین ہو اور خود بھی اپنے آپ کو گورنر مانتا ہو، اس کے بغیر اپنے فرائض کا احساس نہیں کر سکتا۔ یہ تکبر نہیں ہے بلکہ اعتراف ہے۔

[1] یعنی دردمندانہ نصیحت جس میں وہ اخلاص ہو جو ایک مرنے والے کے قول میں ہو سکتا ہے جب آخری منزل میں ہوتا ہے اور عقوبت کا نظارہ اس کے سامنے ہوتا ہے۔

پرہیز گاری اور پارسائی کی زندگی اختیار کریں۔

اے لوگو! ان باتوں سے پرہیز کرو جن سے بچنا اور پرہیز کرنا اتنا ضروری ہے کہ خدا اللہ تعالیٰ جل مجدہ نے ان سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نہ اس سے افضل کوئی نصیحت ہو سکتی ہے اور نہ کوئی تذکیر اور یاددہانی اس سے زیادہ ضروری اور مفید ہو سکتی ہے۔

دیکھو اللہ تعالیٰ سے تقویٰ کرنا اور اس طرح تقویٰ کرنا کہ دل لرز رہا ہو اور خوف خدا ذہن و دماغ پر چھایا ہوا ہو۔ یہ تقویٰ ایک عمل کرنے والے کے لئے بہت بڑا معاون اور بہت بڑا مددگار اور نہایت مخلص رفیق ہے۔

اور جو شخص ظاہر و باطن میں اپنا معاملہ اللہ سے درست کر لے جس سے مقصود محض رضا خداوندی ہو، کوئی دنیاوی غرض اور مصلحت پیش نظر نہ ہو، تو یہ ظاہر و باطن کی مخلصانہ اصلاح دنیا میں اس کے لئے باعزت یادگار، اور مابعد الموت کے لئے بہترین ذخیرہ ہے۔ جس وقت انسان ان اعمال کا سب سے زیادہ ضرورت مند ہوگا جو اس نے پہلے سے بھیجے ہوں۔

(دیکھو) (خداترسی اور ظاہر و باطن کی اصلاح کی کوشش کارآمد چیزیں یہی ہیں جو مرنے کے بعد انسان کی بہترین رفیق ہوں گی) ان کے علاوہ جو بھی ہے وہ انسان کے لئے یہاں تک بے کار ہے کہ قیامت کے روز انسان تمنا کرے گا کہ کاش اس عمل کے اور میرے درمیان مدت دراز کی مسافت ہوتی۔

یاد رکھو! اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے اس کی بے انتہا مہربانی اور اس کے بے پایاں رحم و کرم ہی کا تقاضا ہے کہ وہ خود اپنی ذات کا تم کو خوف دلا رہا ہے (کہ تم غافل، لاابالی، نفس پرست نہ بنو کہ اللہ کے عذاب کے مستحق ہو جاؤ کہ اللہ کا عذاب بہت سخت ہوتا ہے اس کی طاقت بھی بے پایاں ہے جس کو عذاب دینا چاہے تو کوئی نہیں جو اس کے عذاب کو روک سکے)

اللہ تعالیٰ کی ذات وہ ہے کہ اس کا قول حق ہے، جو کچھ کہتا ہے سچ کہتا ہے جو وعدہ کرتا ہے پورا کرتا ہے اس میں خلاف نہیں ہوتا۔ اس کا ارشاد ہے کہ اس کی بات پلٹی نہیں جاتی اور وہ بندوں پر ظلم بھی نہیں کرتا۔ پھر وہی بات ہے۔ اللہ سے تقویٰ کرو، موجودہ وقت اور حالت میں بھی اور مستقبل میں بھی۔ پوشیدہ بھی اور اعلانیہ بھی۔ جو اللہ تعالیٰ سے تقویٰ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کا کفارہ فرماتا اور اس کے اجر کو بڑھاتا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ سے تقویٰ کرے وہ کامیاب پورا پورا کامیاب۔ بہت بڑی کامیابی کے ساتھ کامیاب۔

غرض یہ ہے کہ بہر صورت خوف خدا کو سامنے رکھو۔ خوف خداوند اکسیر ہے جو عذاب خدا سے بچاتا ہے اس کی سزا اور اس کی ناراضی سے محفوظ رکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے تقویٰ کرنا اور خوف خدا وہ تریاق ہے جو چہرہ کو روشن کر دیتا ہے، رب کو راضی کرتا ہے اور درجہ کو بلند کرتا ہے۔ پس جہاں تک ممکن ہو تقویٰ کا حصہ پورا پورا حاصل کرو اور دیکھو بارگاہ رب العزت کے حق میں کوتاہی مت کرو، اللہ تعالیٰ کے اس احسان عظیم کی قدر کرو کہ اس نے اپنی کتاب میں تمہیں کامل و مکمل تعلیم دی ہے۔ تمہارے لئے واضح طور پر راستہ مقرر کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ اس لئے کر دیا کہ جھوٹے اور سچے کھل کر سامنے آجائیں۔ پس جس طرح اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان فرمایا ہے تم بھی احسان کرو۔ تمہارا احسان یہ ہے کہ خود اپنے افعال اور اعمال کو درست کرو، اللہ تعالیٰ کے دوستوں سے دوستی رکھو، اس کے دشمنوں کو اپنا دشمن جانو، وہی رب العزت ہے وہی مولا برحق ہے جس نے تمہیں اپنے دین کامل کے لئے منتخب فرمایا: تمہارا نام مسلم رکھا تاکہ جو برباد ہو تو اس حالت میں برباد ہو کہ کھلی حجت اس کے سامنے ہو، اس کو یہ عذر نہ رہے کہ اس کے سامنے بات واضح نہ ہو سکی اور جو زندہ رہے تو اس طرح زندہ کہ اپنے زندہ رہنے کی دلیل اور حجت اس کے پاس ہو ولا حول ولا قوۃ الا باللہ (اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر ہماری نہ کوئی فکری طاقت ہے نہ عملی قوت)"

دیکھو مختصر بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت سے کرتے رہو اور مابعد الموت کے لئے عمل کرتے رہو۔ (اور پوری طرح سمجھ لو) کہ جو بندہ اس رشتہ کو درست کر لیتا ہے جو اس کے اور اس کے پروردگار کے مابین ہے تو خود اللہ تعالیٰ ذمہ دار بن جاتا ہے کہ ان معاملات کو درست کر دے جو اس بندے اور دوسرے انسانوں کے درمیان ہیں۔

(بات صاف ہے) اللہ تعالیٰ کی حکومت ہے وہ انسانوں پر حکومت کرتا ہے اور انسانوں کے حق میں اپنے فیصلے نافذ کرتا ہے۔ انسان اپنے پروردگار کے مالک نہیں ہیں، نہ انہیں خالق ارض و سما کی کسی بات پر کوئی قابو ہے۔ کبریائی اور عظمت صرف اللہ کے لئے ہے۔ ہم میں نہ کوئی طاقت ہے نہ قوت ہے جو کچھ قدرت و طاقت ہے وہ خدا کی مہربانی اور اس کی مدد سے ہے جو بلند و بالا اور بہت بڑی شان والا ہے۔

مقام فکر اور دلیل صداقت

ان تمام خطبوں پر ایک دفعہ اور نظر ڈالئے۔ موضوع خطاب کیا ہے، بار بار زور کس بات پر دیا جارہا ہے۔

خدا کا خوف۔ اللہ سے ظاہر و باطن ہر طرح سے ڈرتے رہنا، ظاہر و باطن کی اصلاح، اللہ کو یاد رکھنا اور کثرت سے یاد کرنا۔

غور فرمایئے یہ خطبے کب دیئے جارہے ہیں؟ یہ خطبے خاص اس وقت جب مخالفین تحریک اور دشمنان اسلام کی منصوبہ بند کوششوں سے جان بچا کر سانس لینے کا پہلا موقع ملا ہے جبکہ آپ کا سر قلم

کرنے والوں یا گرفتار کرنے والوں کے لئے بڑے سے بڑے انعام کا اعلان فضا میں گونج رہا ہے۔

اول سے آخر تک خطبوں کے ایک ایک حرف پر نظر ڈال لیجئے۔ کیا کہیں کوئی ایک لفظ، کوئی اشارہ، کوئی کنایہ بھی ان دشمنوں کی طرف ہے؟

ان تیرہ سالہ زندگی کی بے پناہ اور مسلسل مصیبتوں کا جو خود اپنے عزیزوں اور اہل قبیلہ کی طرف سے ڈالی گئی تھیں کیا کوئی ذکر ہے؟

غور فرمایئے! وسعت ظرف، علو حوصلہ، بلندی ہمت،

سوچیے! کیا ایسی ذات بابرکات کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ اس نے خدا کے نام پر جھوٹ بولا۔ (معاذ اللہ)

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے

نئے میدان عمل میں پہلے کام

(۱)
تعمیر مساجد و اقامت صلوٰۃ

(۱) لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ؕ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ (سورہ توبہ۔ ۱۰۸)

"البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد اول دن [1] سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے، اس کی پوری پوری حقدار ہے کہ تم اس میں کھڑے ہو (اور بندگان الٰہی تمہارے پیچھے نماز پڑھیں) اس میں ایسے لوگ (آتے) ہیں جو پسند کرتے ہیں کہ پاک صاف رہیں اور اللہ تعالیٰ (بھی) پاک صاف رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔"

(۲) اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۸﴾ (سورہ توبہ۔ ۱۸)

"فی الحقیقت مسجدوں کو آباد کرنے والا تو صرف وہ ہے جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائے، نماز قائم کرے، زکوٰۃ ادا کرے اور اللہ کے سوا اور کسی کا ڈر نہ مانے جو لوگ ایسے ہیں انہیں سے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ ہدایت یاب (سعادت اور کامیابی کی راہ پانے والے) ہونگے۔"

(۳) وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ (سورہ بقرہ۔ ۴۳)

"نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور سر نیاز خم کرو ان کے ساتھ جو اللہ کی بارگاہ میں سر جھکا رہے ہیں۔"

---

[1] اول یوم کے معنی یہی کئے گئے ہیں کہ اول یوم وجودہ یا اول یوم بناء یعنی وجود میں آنے کے پہلے دن سے یا تعمیر کے پہلے دن سے لیکن یہاں یہ نکتہ بھی نظر انداز نہ ہونا چاہئے کہ یوم کے معنی دور کے بھی آتے ہیں۔ کمافی قولہ تعالیٰ خلق الارض فی یومین (المفردات فی غریب القرآن) یعنی ہجرت کے بعد جو دور شروع ہوا اس کے آغاز میں۔ اور یہی سبب ہے کہ اس اول یوم کو تاریخ یعنی سنہ ہجری کا پہلا دن مانا گیا۔ افاد السہیلی ان الصحابۃ رضی اللہ عنہم اخذوا التاریخ من قولہ تعالیٰ لمسجد اسس علی التقوے من اول یوم (وفاء الوفاء ص ۱۷۷ ج ۱) یعنی صحابہ کرام نے لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ سے ہی استدلال کرتے ہوئے سنہ ہجری کا آغاز اس دن سے کیا ہے۔

مسجد قبا:

قبا کا قیام عارضی تھا مگر یہ کیسے ممکن تھا کہ رسول اللہ ﷺ کا کوئی لمحہ اس فرض کی انجام دہی میں صرف نہ ہوتا جس کے لئے وہ خدا کے رسول اور پیغامبر بنائے گئے تھے۔

اقامۃ دین [1] جو انبیاء علیہم السلام کا نصب العین ہوتا ہے اس کا پہلا کام ہے اقامت الصلوٰۃ یعنی ایسا ماحول بنانا اور ایسی جماعت تیار کرنا جس کی آنکھوں کی ٹھنڈک نماز اور جس کے دل کا چین ذکر اللہ ہو۔

قبا پہنچ کر سب سے پہلے آپ نے اس فرض کو انجام دیا۔ اس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے جو نمبر اول میں تحریر کی گئی ہے۔

جماعت:

خدا پرستی یعنی خدا واحد کی عبادت آپ ﷺ کی فطرت تھی۔ شب معراج میں خاص نوعیت کی تعلیم دی گئی اور اگلے روز حضرت جبرئیل علیہ السلام نے نازل ہو کر پانچوں وقت کی نمازوں کی عملی تعلیم بھی دیدی۔ دو روز تک پانچوں وقت کی نمازیں پڑھا کر جس طرح حضرت جبرئیل علیہ السلام نے ارکان اور اوقات نماز کی تعلیم دی: جماعت اور نماز باجماعت کا طریقہ بھی بتادیا، لیکن جب تک آنحضرت ﷺ مکہ معظمہ میں رہے تسلسل کے ساتھ نماز باجماعت کا موقع نہیں مل سکا۔ جہاں اسلام کا نام لینا ہی مشکل تھا وہاں جماعت کا سلسلہ کس طرح قائم ہو سکتا تھا۔ مدینہ کے حضرات اسلام سے مشرف ہوئے۔ ان کی تعلیم کے لئے خاص خاص حضرات کو بھیجا گیا۔ یہاں کچھ حلقے مسلمانوں کے قائم ہوئے تو نمازوں کی جماعتوں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔

پھر ان حضرات نے اپنے ہی اجتہاد سے ہفتہ میں ایک روز عمومی جماعت کے لئے بھی مقرر کر لیا اور سرور کائنات رسول اللہ ﷺ ابھی مکہ معظمہ میں تھے کہ نماز جمع کی فرضیت بھی نازل ہو گئی۔ جس نے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے اجتہاد کی تصدیق کر دی۔ صحابہ کرام کا یہ اجتہاد وہ تھا جس پر آنحضرت ﷺ فخر کیا کرتے تھے کہ یہود اور نصاریٰ نے ہفتہ میں ایک دن عمومی اجتماع کے لئے مقرر کیا مگر وہ منشاء خداوندی کے مطابق نہیں تھا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس نے ہمیں اس دن کی توفیق بخشی جو منشاء خداوندی کے عین مطابق تھا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود کوئی مسجد تعمیر نہیں ہوئی تھی۔ اور تاریخ اسلام اب تک بجز ایک مسجد کے جو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے مکہ معظمہ میں اپنے مکان کے سامنے میدان میں بنالی تھی [2]،

---

[1] یعنی دین کے منشاء اور مقصد کو صحیح طور سے سمجھنا اس کے تمام پہلوؤں کا خیال رکھنا اور پوری مستعدی سے اس کو جامہ عمل پہنانا۔

[2] بخاری شریف ص ۵۵۳

کسی اور مسجد کی تعمیر سے نا آشنا تھی، کوئی مکان کوئی میدان یا کسی میدان کا کوئی حصہ نماز کے لئے مقرر کر لیا جاتا تھا۔ وہاں لوگ نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔ عموماً بکریوں کے باڑے ❶ میں کسی حصہ کو نماز کے لئے مخصوص کر لیا کرتے تھے۔ ورنہ جہاں وقت آتا نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔

قبا کا قیام عارضی تھا۔ اس میں اختلاف ہے کہ کتنے روز قیام رہا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ صرف تین روز قیام رہا، مگر اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اس عارضی قیام میں آنحضرت ﷺ نے مسجد کی بنیاد ڈال دی ❷۔ کلثوم بن ہدم جو آنحضرت ﷺ کے میزبان تھے انہیں کا ایک میدان تھا جس میں کھجور سکھائے جاتے تھے۔ اسی میدان میں یہ مسجد تعمیر کی گئی۔ سب سے پہلے آپ نے پتھر رکھا۔ دوسرا پتھر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور تیسرا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے رکھوایا۔ پھر جملہ صحابہ نے حصہ لیا۔ خود ہی مزدور تھے اور خود ہی معمار، مزدوروں میں خود آقا دو جہان بھی شامل رہے۔ بھاری بھاری پتھر اٹھاتے وقت جسم مبارک خم ہو جاتا۔ مٹی بدن اطہر پر پڑتی، کوئی صحابی آگے بڑھ کر پتھر لے لیتا تو آپ دوسرا اٹھا لیتے تھے۔ ❸

مسجد کی تعمیر کے ساتھ آداب معاشرت اور اخلاق کی تعمیر بھی ہوئی حتیٰ کہ کلام اللہ شریف میں جب مسجد کا تذکرہ فرمایا تو ساتھ ساتھ اہل مسجد کی بھی تحسین فرمائی: فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا (توبہ۔ ۱۰۸) (اس میں وہ لوگ ہیں جو محبت کرتے ہیں۔ اس بات سے کہ پاک صاف رہیں) پھر ان کو شرف لازوال اور فخر دائم یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت کا پروانہ بھی عطا ہو گیا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ (توبہ۔۱۰۸) (اللہ تعالیٰ محبت فرماتے ہیں پاک صاف رہنے والوں سے)

مسجد مدینہ، مسجد النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام:

قبا سے مدینہ تشریف آوری ہوئی تو جس جگہ ناقہ بیٹھا تھا، وہی جگہ مسجد کے لئے منتخب کی گئی۔ یہ جگہ ایک میدان کے کنارہ پر تھی۔ قبیلہ بنی نجار کے حضرات یہاں نماز پڑھا کرتے تھے۔ ❹ زمین کے مالک یہاں کھجوریں بھی سکھایا کرتے تھے۔ میدان کے باقی حصہ میں کھجور کے درخت کھڑے

---

❶ یہ باڑے رہائشی مکانوں کے قریب ہوتے تھے اور عام لوگ انہیں باڑوں میں رہا بھی کرتے تھے۔

❷ واسس المسجد الذی اسس علی التقویٰ بخاری شریف ص۵۵۵ وفا الوفاء کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تکمیل بعد میں ہوئی۔ مدینہ میں قیام فرمانے کے بعد آپ صحابہ کرام کے ساتھ قباء تشریف لائے اور مسجد کی تعمیر کرائی۔ وفاء الوفاء ص۱۷۹ ج۱۔

❸ وفاء الوفاء ص۱۸۰ ج۱

❹ حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ نے یہاں ایک دیوار بیت المقدس کے رخ پر بنا دی تھی۔ یہیں جمعہ کی نماز بھی پڑھایا کرتے تھے۔ سایہ کی کوئی چیز دیوار پر نہیں تھی۔ ابن سعد ص ۲ ج ۲ ہماری اصطلاح میں ایسی مسجد کو قناتی مسجد کہتے ہیں۔ عید گاہیں عموماً ایسی ہی ہوتی ہیں۔

تھے۔ کچھ پرانی قبریں اور کچھ مکانوں کے کھنڈر تھے۔ ایک طرف کچھ نشیب تھا وہاں پانی بھر جاتا تھا۔ اس خرابہ کی قسمت جاگی، سید الانبیاء ﷺ نے اسی کو مسجد کے لئے منتخب فرمایا۔ یہ طول و عرض میں سو سو گز سے کچھ زائد تھا۔ [1]

سہل اور سہیل کے والد رافع بن ابی عمرو کا انتقال ہو چکا تھا۔ حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ ان کے مربی تھے۔ تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ یہ میدان ان ہی یتیموں کا تھا۔ انہوں نے چاہا کہ بلا کسی معاوضہ کے مسجد کے لئے پیش کر دیں، مگر آنحضرت ﷺ اس طرح کی پیشکش [2] بڑے آدمیوں سے بھی منظور نہیں فرمایا کرتے تھے۔ یتیم بچوں سے کیسے منظور فرمالیتے۔ دس دینار قیمت تجویز کی گئی۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے یہ قیمت ادا کر کے زمین مسجد کے لئے وقف کر دی۔ [3] رضی اللہ عنہم

زمین ہموار کی گئی، پانی سینچ دیا گیا، قبروں سے ہڈیاں نکلیں ان کو الگ دبا دیا گیا۔ درخت کٹوائے گئے، بنیاد کھودی گئی، تعمیر شروع ہوئی، یہاں بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہ ہی مزدور تھے، وہ ہی معمار، سید الانبیاء ﷺ بھی برابر کے شریک تھے۔

عجیب و غریب پُر تقدس جذبہ سے کام ہو رہا تھا۔ پتھر اٹھائے جاتے تو یہ رجز پڑھا جاتا تھا:

هذا الحمال لاحمال خيبر هذا ابر ربنا واطهر

"خیبر (جو کھجوروں کی منڈی ہے) وہاں سے بھی بوجھ اٹھایا جاتا ہے اور لادا جاتا ہے۔ یہ بوجھ اس جیسا نہیں ہے (بلکہ) اے ہمارے رب تو جانتا ہے یہ اس سے بہت اچھا نیکی والا اور بہت پاکیزہ ہے۔

کبھی یہ رجز پڑھا جاتا اور سید الانبیاء ﷺ کی زبان مبارک بھی ساتھ ساتھ ترنم فرما ہوتی تھی: [4]

اللهم لا خير الا خير الأخرة فانصر الانصار والمهاجرة [5]

کبھی اس میں یہ ترمیم فرمالیتے:

اللهم ان الاجر اجر الأخرة فارحم الانصار والمهاجرة [1]

---

[1] ابن سعد ص ۲ج ۲۔

[2] یعنی آنحضرت ﷺ کوئی ضرورت ظاہر فرماتے اس پر بطور ہدیہ وہ چیز آپ کو پیش کی جاتی تو بطور ہدیہ اس کو منظور نہیں فرماتے تھے بلکہ قیمت ادا فرماتے تھے۔ جیسے مکہ معظمہ سے روانگی کے وقت حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک ناقہ پیش کیا تو آپ نے قیمتاً منظور فرمایا۔ البتہ بغیر آنحضرت ﷺ کی طلب کے کوئی ہدیہ پیش کیا جاتا تو اس کو منظور فرمالیتے تھے۔

[3] ابن سعد ص ۲ج ۲ غزوہ خیبر کے بعد جب مسجد بڑھائی گئی تو اس کے لئے جو زمین خریدی گئی تھی اس کی قیمت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ادا فرمائی۔ ترمذی شریف مناقب عثمان، ص ۲۰۹ج ۲۔ مگر اب زمین کی قیمت بہت بڑھ گئی تھی اس ٹکڑے کی قیمت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دس ہزار اور ایک روایت ہے کہ پچیس ہزار ادا کی ہے۔ وفاء الوفاء ص ۲۴۱ج ۱۔

[4] بخاری شریف ص ۵۵۵ وابن سعد ص ۲ج ۲

[5] "اے اللہ صرف آخرت کی بھلائی ہی بھلائی ہے، پس مدد فرما انصار کی اور مہاجرین کی"

یہ مسجد اگرچہ دوسری ہے۔ مگر اس لحاظ سے اولیت اس کو ہی حاصل ہے کہ جو آبادی مستقل قیام کے لئے طے فرمائی گئی اس میں پہلی مسجد یہی ہے۔ اس بنا پر حسب ارشاد رحمۃ للعالمین ﷺ لمسجد اسس علی التقویٰ من اول یوم کا اصل مصداق یہی ہے کیونکہ قبا صرف نزول گاہ تھا اور جو مستقل قیام گاہ اور رقبۃ الاسلام تھا وہ یہی مقام ہے جہاں ناقہ نبی ﷺ نے گردن پھیلادی تھی اور جہاں تبع یمن ❷ نے سیکڑوں سال پہلے خاتم الانبیاء ﷺ کے لئے نزول گاہ تعمیر کردیا تھا۔ بس مسجد النبی ﷺ کی اولیت قیام گاہ مستقل کی اولیت ہے ❸۔ اور مسجد قبا کی اولیت عارضی قیام گاہ کی اولیت۔ عارضی اور مستقل جو فرق ہونا چاہیئے وہ یہاں بھی کارفرما ہے۔

تعمیر :

اس وقت بیت المقدس کی جانب نماز پڑھی جاتی تھی۔ لہذا قبلہ اسی طرف یعنی شمال کی جانب رکھا گیا ۔اس طرف کی دیوار ستر ہاتھ لمبی بنائی گئی، دوسری جانب ساٹھ ہاتھ۔

بنیادیں پتھروں سے بھری گئیں۔ تین ہاتھ کی اونچائی تک دیواریں بھی اسی پتھر سے چنی گئیں۔ ان کے اوپر کچی اینٹوں کی تعمیر کی گئی۔ البتہ دروازوں کے بازو پتھروں کے رہے، ساٹھ ہاتھ (تیس گز) چوڑی چھت کے سہارے کے لئے بیچ میں کھمبے (ستون) کھڑے کئے۔ تین تین کھمبوں کی دو لائنیں ایک طرف (شرقی جانب میں) اور دو لائنیں غربی جانب میں۔ دونوں لائنوں کے بیچ کا حصہ وسیع رکھا گیا، میدان میں

---

❶ "اے اللہ حقیقت یہ ہے کہ آخرت کا اجر ہی اجر ہے جو مقصود و مطلوب ہونا چاہئے، پس رحم فرما انصار اور مہاجرین پر"

❷ تبع بن الاقرن یمن کا بادشاہ تھا۔ اس کی اولاد میں جو بادشاہ ہوئے ان کو تبع ہی کہا گیا۔ انہیں میں سے ایک تبع ایک فوجی مہم کے سلسلہ میں یثرب بھی پہنچا۔ وہ یہاں قتل عام کرکے اس آبادی کو ختم کرنا چاہتا تھا کہ اہل علم نے اس کو خبر دی کہ نبی آخر الزماں کا یہ دار الہجرۃ ہوگا۔ وہ متاثر ہوا، برباد کرنے کے ارادہ کو ملتوی کیا اور یہاں ایک مکان تعمیر کرادیا کہ آنحضرت ﷺ جب تشریف لائیں تو یہاں قیام فرمائیں اور ایک تحریر بھی لکھ کردے دی۔ جو نسلاً بعد نسل محفوظ رہی اور حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ تک پہنچی۔ ایک روایت یہ ہے کہ اس تبع کا نام اسعد تھا۔ کنیت ابو کرب، اس نے آنحضرت ﷺ کی شان میں دو شعر بھی کہے تھے۔

شهدت علی احمد انه رسول من الله باری النسم

فلو مد عمری الی عمره لکنت وزیرا له وابن عم

ترجمہ: "میں شہادت دیتا ہوں کہ احمد اس خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبر ہونگے جو جانوں کا پیدا کرنے والا ہے اگر میری عمر ان کے زمانہ تک دراز ہوگئی تو میں ان کا وزیر بھی ہونگا۔ (سلسلہ نسب کے لحاظ سے) ابن عم بھی" (معارف ابن قتیبہ ص ۲۱۱ وفاء الوفاء ص ۱۳۴ ج ۱)

❸ ایک توجیہہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ آغاز کے لحاظ سے اگرچہ مسجد قبا اولیٰ ہے کہ اس کی تعمیر پہلے شروع ہوئی لیکن تکمیل کے لحاظ سے مسجد مدینہ مقدم ہے۔ ملاحظہ ہو وفاء الوفاء ص ۱۷۹ ج ۱

سے جو کھجور کاٹے گئے تھے ان کے کھمبے اگلی لائن میں لگائے گئے جو قبلہ کی جانب تھی۔ چھت میں نیچے بلیلاں رکھ کر ان کے اوپر کھجور کے پٹھے (شاخیں جن پر پتے ہوتے ہیں) پتوں سمیت بچھا دیئے گئے۔ ان کے اوپر ہلکی ہلکی مٹی پھیلا دی گئی اور چھپرا کی طرح ڈھلوان رکھی گئی، مگر پھر بھی بارش ہوتی تو ٹپکتی تھی۔ نیچے پختہ فرش نہیں تھا صرف ہموار زمین تھی۔ پانی ٹپکتا تو کیچ ہو جاتی تھی۔ اسی لئے کچھ دنوں بعد چھت پر مٹی زیادہ کر دی گئی اور فرش پر کنکریاں بچھا دی گئیں۔ چھت کی اونچائی سات ہاتھ (ساڑھے تین گز یعنی ساڑھے دس فٹ)

تین طرف دروازے رکھے گئے۔ قبلہ کی طرف کوئی دروازہ نہیں تھا۔ جنوب اور مشرق و مغرب کی جانب دروازے تھے۔ [1] کچھ دنوں بعد جب بیت المقدس کے بجائے خانہ کعبہ کو قبلہ قرار دیا گیا (جو مدینہ سے جنوب کی جانب ہے) تو اس طرف کی دیوار کا دروازہ بند کر دیا گیا اور جانب شمال کی دیوار جو پہلے دیوار قبلہ تھی اس طرف دروازہ کھول دیا گیا [2] اور اسی دیوار [3] سے متصل وہ سائبان بنا دیا گیا جو صفہ کہلاتا تھا، جو ان اصحابہ کا مسکن تھا جن کے اہل وعیال نہیں ہوتے تھے اور تعلیم، روحانی تربیت، نیز رضاکارانہ خدمات کی غرض سے یہاں رہا کرتے تھے۔ معاش کے لئے دن کو لکڑیاں چن لیتے تھے۔ مگر رات کی تاریکی میں تلاوت قرآن اور نوافل کے قندیل روشن رکھتے تھے۔

ابتداء میں منبر نہیں تھا تو ایک ستون کی برابر میں مٹی کی چوکی (چبوتری) بنادی گئی تھی۔ آقائے دوجہان ﷺ اسی پر رونق افروز ہو کر خطاب فرمایا کرتے تھے اور ستون پر سہارا لگالیا کرتے تھے۔

حجرات امہات المومنین:

مسجد کی تعمیر سے فراغت ہوئی تو مسجد سے متصل ہی ازواج مطہرات کے لئے مکان بنوائے۔ اس وقت تک حضرت سودہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نکاح میں آچکی تھیں، اس لئے دو ہی حجرے بنوائے۔ جب ازواج مطہرات آتی گئیں تو اور مکانات بنتے گئے۔

---

[1] وفاء الوفاء ص ۲۴۲ ج ۱، اس عمارت کے لئے کوئی چندہ نہیں کیا گیا۔ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے پیش کرنا چاہا اور درخواست کی کہ باقاعدہ چھت ڈلوا دی جائے۔ فرمایا نہیں۔ عریش کعریش موسیٰ خشیبات و ثمام والشان اعجل۔ یعنی موسیٰ علیہ اسلام کے چھپر کی طرح (یہ چھت ہوگی) کہ نیچے لکڑیاں (بلیلاں) ان کے اوپر پھونس، (پھر فرمایا) انسان کا معاملہ تو اس سے بھی زیادہ عجلت لئے ہوئے (نازک ہے) (ابن سعد ص ۲ ج ۲ وفاء الوفاء ص ۲۴۲ ج ۱)

[2] آنحضرت ﷺ نے ایک سال شب قدر کے متعلق فرمایا کہ میں نے دیکھا کہ میں پانی اور کیچڑ میں سجدہ کر رہا ہوں۔ اس وقت بادل کا نام ونشان نہ تھا۔ مگر دفعۃً رات کو بارش ہوئی تو واقعی صبح کو پانی اور کیچڑ میں سجدہ کرنا پڑا۔ آنحضرت ﷺ کی پیشانی مبارک پر بھی مٹی لگی ہوئی تھی۔ (بخاری شریف ص ۲۷۰ وفاء الوفاص ۲۴۲۔)

[3] وفاء الوفاء ص ۲۶۲ ج ۱۔ ان حضرات کو مسجد ہی میں سونے کی اجازت تھی۔ ابن سعد ص ۱۳ ج ۲ و بخاری ص ۶۳۔

مسجد سے متصل حضرت حارثہ بن نعمان رضی اللہ عنہ کی جائیداد تھی۔ ہر ایک مکان کے لئے وہی اپنی جائیداد کا ٹکڑا پیش کرتے رہے۔ یہاں تک کہ تمام جائیداد محبوب رب العالمین ﷺ کے نذر کر دی۔ مسجد کی طرح چار حجرے بھی کچی اینٹوں کے تھے اوپر کھجور کے پٹھوں اور پتوں کی چھت چھوٹے سے صحن کے گرد کھجور کی کھپچیوں (پٹھوں) کی دیواریں جن پر مٹی لیس دی گئی تھی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ کا ایک کواڑ تھا۔ باقی کے دروازوں پر ٹٹیاں تھیں۔ پانچ حجرے ایسے بنائے گئے کہ ان میں کچی اینٹیں بھی نہیں لگائی گئیں بلکہ ٹٹیاں کھڑی کرکے ان پر مٹی تھپیں دی گئی اور اوپر کھجور کے پٹھوں اور پتوں کی ہلکی سی چھت ڈال دی گئی۔ ان کے دروازوں پر نہ ٹٹیاں تھی نہ کواڑ، بلکہ ٹاٹ یا کمبل کے پردے پڑے رہتے تھے جو طول میں تین ہاتھ اور عرض میں ایک ہاتھ سے کچھ زائد تھے۔ چھتیں ایسی نیچی کہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کا دور تھا، جب میں ذرا بڑا ہو گیا تھا میں ان حجروں میں جاتا تو کھڑے ہو کر ان حجروں کی چھتوں کو ہاتھ لگالیا کرتا تھا۔ رات کو گھروں میں چراغ جلانے کا رواج نہیں تھا، لہذا ان حجروں میں رات کو صرف نور حق کی روشنی رہتی تھی۔

سنہ ۸۷ھ میں اموی خلیفہ ولید بن عبد الملک نے مسجد نبوی (علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) کی توسیع کی تو ان مبارک حجروں کو مسجد میں شامل کر لیا۔

ابو امامہ حضرت سہیل بن حنیف فرمایا کرتے تھے۔ کاش ان حجروں کو اسی طرح چھوڑ دیا جاتا تاکہ لوگ دیکھتے کہ جس نبی کے دست مبارک پر تمام خزانوں کی کنجیاں رکھ دی گئی تھیں اس نے خود اپنے لئے کیا پسند کیا تھا۔[1]

صفہ و اصحاب صفہ :

پہلے گذر چکا ہے کہ تبدیلی قبلہ کے بعد جب نماز جنوب کی جانب رخ کرکے پڑھی جانے لگی تو اس طرف کی دیوار میں جو دروازہ تھا وہ بند کر دیا گیا اور پہلی دیوار قبلہ (شمالی دیوار) میں دروازہ کھول دیا گیا۔ اس سے متصل چبوترہ بنا دیا گیا اور اس پر سائبان ڈال دیا گیا۔ اسی کو صفہ کہا جاتا تھا۔[2] نادار مسلمان جن کے اہل و عیال نہیں ہوتے تھے ان کا مسکن یہی ہوتا تھا۔ توکل ان کا سرمایہ ہوتا تھا۔ سوال کرنا ممنوع، تعلیم، روحانی تربیت اور رضاکارانہ خدمات ان کے فرائض اور مشاغل ہوتے تھے۔

---

[1] ابن سعد ص ۱۸۱ ج ۲ وفاء الوفاء ص ۳۲۷ ج ۱ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ اور دوسرے اکابر تابعین نے بھی اسی جذبہ کا اظہار فرمایا۔

[2] قال عیاض الصفه بضم الصاد و تشدید الفاء ظلة فی موخر مسجد النبی ﷺ یاوی الیها المساکین۔ (وفاء الوفاء ص ۳۲۱ ج ۱)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ستر اصحاب صفہ کو دیکھا کہ ان کے پاس چادر تک نہ تھی فقط تہہ بند تھا یا صرف کمبل جس کو اپنی گردنوں میں باندھ لیتے تھے۔ کمبل بھی اس قدر چھوٹا کہ کسی کی آدھی پنڈلیوں تک پہنچتا، کسی کے ٹخنوں تک۔ نماز میں ستر کھلنے کا خطرہ رہتا تو ہاتھ سے تھامے رکھتے تھے ۔[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کھانے کی چیز صدقہ میں آتی تو ان کو دیدیتے، خود تناول نہیں فرماتے تھے کیونکہ صدقہ آپ کے لئے حرام تھا۔ جو چیز بطور ہدیہ آتی تو ان کو بلالیتے اور ان کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے۔[2]

یہ حضرات فاقہ سے نہیں گھبراتے تھے کیونکہ خود اپنے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے کہ کئی کئی وقت گزر جاتے اور فاقہ نہیں ٹوٹتا، بھوک سے کبھی اتنا ضعف ہو جاتا کہ نماز کی حالت میں گر پڑتے، لوگوں کو خیال ہوتا کہ دورہ پڑ گیا ہے حالانکہ دورہ فاقہ کا ہوتا تھا۔[3]

کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو انصار پر تقسیم فرمادیتے کہ اپنے بساط کے موجب ہر شخص ایک ایک دو دو کو لیجائے اور اپنے ساتھ ان کو کھانا کھلائے۔[4]

مسجد مبارک کے دوستونوں میں ایک رسی بندھی رہتی تھی۔ کھجوروں کے موسم میں حضرات انصار کھجوروں کے گچھے (خوشے) اپنے باغات سے لاکر لٹکادیتے تھے، جو کھجور پک جاتا اس کو لکڑی سے جھاڑ کر کھالیا کرتے تھے[5]۔ ان بہادر و جاں باز فقراء اور درویشان باوقار کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بشارت دیا کرتے تھے۔

لو تعلمون ما لکم عند اللہ لاحببتم ان تزدادوا فقراً و حاجۃ۔[6]

"اگر تم جان جاؤ کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں تمہارے لئے کیا تیار ہے تو تم آرزو کرو کہ ہمارا یہ فقر و فاقہ اور بڑھ جائے۔"

ان حضرات کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔

نماز جنازہ کی جگہ:

---

[1] بخاری شریف ص ۶۳، ج ا و فتح الباری ص ۴۲۶ ج ا
[2] ترمذی شریف باب فی معیشت اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم ص ۵۹ ج ۲ ،
[3] ترمذی شریف باب فی معیشت اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم ص ۵۹ ج ۲ ،
[4] یہ بھی صورت ہوتی کہ آپ فرمادیتے کہ جن کے یہاں دو کھانے والے ہوں وہ تیسرے کو لیجائے اور جس کے یہاں کھانے والے چار ہوں وہ دو دو کو لیجائے اور ساتھ کھانا کھلائے۔ ایک روز آپ نے اسی طرح اصحاب صفہ کو تقسیم فرمادیا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے یہاں چار کھانے والے تھے۔ خود حضرت ابو بکر، ان کے صاحبزادے اور اہلیہ اور ایک خادم مگر آپ اپنے ساتھ تین کو لے گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سات اصحاب کو لے گئے (بخاری شریف ص ۸۴ و ص ۵۰۶ وغیرہ)
[5] وفاء الوفاء ص ۳۲۴ ج ا
[6] ایضاً ص ۳۲۲ ج ا و ترمذی شریف باب فی معیشہ اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم ص ۵۹ ج ۲ ،

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب آنحضرت ﷺ ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے تو جس کسی بیمار کی نزعی کیفیت ہوتی (مرنے کے قریب ہوتا) تو آنحضرت ﷺ کو اطلاع دی جاتی۔ آپ تشریف لاتے اس کے لئے دعا فرماتے۔ وہ شخص وفات پا جاتا تو اکثر ایسا ہوتا کہ تجہیز و تکفین آپ کے سامنے ہی ہوتی اور آپ دفن کے وقت تک وہاں رہتے تھے۔ اس میں آپ کو بہت دیر ہو جاتی تھی۔ اس کا ہمیں احساس ہوا تو ہم نے یہ کر لیا کہ وفات کے بعد آنحضرت ﷺ کو اطلاع دیتے۔ آپ تشریف لاتے، نماز جنازہ پڑھاتے پھر کبھی واپس تشریف لے جاتے اور کبھی دفن ہونے تک وہاں تشریف رکھتے۔ پھر ہمیں محسوس ہوا کہ آپ کو اس میں بھی زحمت ہوتی ہے تو یہ طے کر لیا کہ آنحضرت ﷺ کو تکلیف نہ دی جائے گی بلکہ جنازہ لے کر خود آپ کی خدمت میں پہنچ جایا کریں گے۔ چنانچہ اس پر عمل ہوا۔ جب جنازہ لیکر کاشانہ نبوت پر پہنچے تو قریب ہی ایک جگہ تھی وہاں آپ نماز پڑھاتے۔ پھر یہی معمول ہو گیا کہ اسی خاص جگہ پر نماز جنازہ پڑھائی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ اس جگہ کا نام ہی موضع الجنائز پڑ گیا۔ ❶

نماز باجماعت

عبادت، عربی لفظ ہے جس کا ترجمہ پوجا کیا جاتا ہے۔ اس کی حقیقت ہے غایۃ التذلل یعنی انتہا درجہ عاجزی، بے چارگی، بے بسی، اسی کے اظہار کو عبودیت کہتے ہیں۔ اپنے مالک اور خالق کے سامنے اپنی بے بسی اور عاجزی کے اظہار کے لئے جماعت کی ضرورت نہیں بلکہ گوشہ خلوت کی ضرورت ہے۔ کیونکہ پر کیف اور پر خلوص وہ عاجزی ہوتی ہے جو تنہائی میں ہو، جہاں بندہ تصور معبود میں غرق ہو۔ معبود اور مالک کے سوا کسی کا وجود تو کیا کسی کا تصور بھی نہ ہو۔ اسلام نے اس کو تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ❷ :

---

❶ طبقات ابن سعد ص ۱۴ جلد اول قسم ثانی، آنحضرت ﷺ کا معمول یہی تھا کہ موضع الجنائز میں نماز پڑھایا کرتے تھے جیسا کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے جو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے باب الصلوٰۃ علی الجنائز بالمصلی والمسجد میں پیش کی ہیں۔ ص ۷۷ اگر بعض مرتبہ کسی عارض کی وجہ سے مسجد میں بھی نماز پڑھ لی ہے۔ فتح الباری ص ۱۵۵ ج ۳ باب مذکور) اسی وجہ سے امام ابو حنیفہ اور امام مالک رحمہا اللہ کا مذہب یہ ہے کہ کسی خاص ضرورت کے بغیر مسجد میں نماز جنازہ مکروہ ہے۔ البتہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ جائز قرار دیتے ہیں (واللہ اعلم بالصواب)

❷ فرائض کے علاوہ نوافل میں سنت یہی ہے کہ اپنے مکان میں پڑھی جائیں۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے سید الثقلین ﷺ سے دریافت کیا کہ افضل کیا ہے، مکان میں یا مسجد میں۔ ارشاد ہوا تم دیکھتے ہو میرا مکان مسجد سے کتنا قریب ہے۔ اس کے باوجود اپنے مکان میں نماز پڑھوں یہ مجھے زیادہ محبوب ہے بمقابلہ مسجد میں نماز پڑھنے کے۔ اِلّا یہ کہ فرض نماز ہو (ابن ماجہ) ارشاد ہوا مکان میں نماز پڑھنا نور ہے لہذا اپنے مکانات کو منور کرو (ابن خزیمہ)۔ ارشاد ہوا کچھ نمازیں (نفلیں) گھروں میں پڑھا کرو اپنے مکانات کو قبریں نہ بنالو (بخاری شریف وغیرہ)۔ ایک ارشاد یہ ہے کہ جہاں لوگ نماز پڑھتے ہوئے دیکھیں

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً (سورہ الاعراف۔ ۵۵)

"پکارو اپنے رب کو عاجزی کرتے ہوئے، گڑگڑاتے ہوئے پوشیدہ طور پر"

دوسرے موقع پر ارشاد ہے:

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ﴿۲۰۵﴾

(سورہ الاعراف، آیت ۲۰۵)

"یاد کر اپنے رب کو دل ہی دل میں عاجزی اور نیاز مندی کے ساتھ ڈرتے ڈرتے اور زبان سے بھی آہستہ آہستہ بغیر پکارے صبح وشام اور ایسا نہ ہو کہ تم ان میں ہو جاؤ جو غافل رہتے ہیں۔"

لیکن جس طرح اسلام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے عبادت کو مکمل کیا۔ مثلاً پہلی امتوں میں کسی امت کی نماز میں صرف سجدہ ہوتا تھا۔ رکوع نہیں ہوتا تھا۔ کسی امت کی نماز میں صرف رکوع اور کسی امت کی نماز میں صرف قیام ہوتا تھا۔ کھڑے کھڑے دعائیں پڑھا کرتے تھے، نہ سجدہ کرتے نہ رکوع۔ مگر محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ جس نماز کی تعلیم دی گئی اس میں قیام اور قعدہ بھی ہے اور سجدہ اور رکوع بھی۔ پھر جس طرح ظاہری ارکان کے لحاظ سے مکمل ہے۔ معنی کے لحاظ سے بھی مکمل ہے کہ سب سے پہلے اللہ اکبر کہا جاتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی بڑائی اور عظمت کا اقرار۔ پھر اس کی حمد وثناء[1] اور اس کے ارشادات[2] اور آیاتِ الٰہیہ کی تذکیر، پھر جملہ نقائص سے اس کی پاکی اور عظمت[3]، اس کی پروردگاری اور بلندی وبرتری کا اعتراف اور اس[4] بات کا اظہار کہ وہ حمد کرنے والوں کی حمد سنتا ہے۔ پھر بارگاہ رب

(مثلاً مسجد) ایسی جگہ نماز پڑھی جائے۔ اس کے مقابلہ میں گھر میں نماز پڑھنے کی وہی فضیلت ہے جو فرض نماز کی فضیلت نفل نماز پر ہے۔ ترغیب ترہیب (بحوالہ بیہقی)

[1] سورہ فاتحہ کا پڑھنا فرض یا واجب ہے جس کے شروع میں ہے:۔ الحمد للہ رب العٰلمین، الرحمن الرحیم، مالک یوم الدین۔ اور اس سورت کی اہمیت یہ ہے کہ حدیث میں اس سورت کو نماز سے تعبیر کیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان نصف تقسیم کر دیا ہے اور میرے بندے کے لئے وہ ہے جو وہ مانگتا ہے (تقسیم کی تفصیل یہ ہے) کہ بندہ کہتا ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری ثناء کی، پھر بندہ کہتا ہے مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندہ نے میری عظمت بیان کی، پھر بندہ کہتا ہے: اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان مشترک ہے اور بندہ کی درخواست منظور ہے۔ پھر بندہ کہتا ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ، صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ، تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ بندے نے اپنے لئے درخواست کی ہے اس کی درخواست منظور ہو گی۔ مسلم شریف ص ۱۷۰ ج ۱

[2] سورہ فاتحہ کے بعد قرآن پاک کا کچھ حصہ پڑھنا ضروری ہے۔ قرآن پاک میں احکام بھی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور توحید رسالت کے دلائل بھی۔ مشاہدات یا تاریخی واقعات کے ذریعہ پیش کئے گئے ہیں۔

[3] سبحان ربی العظیم رکوع میں۔ سجدہ میں سبحان ربی الاعلیٰ

[4] رکوع سے کھڑے ہوتے ہوئے سمع اللہ لمن حمدہ (وہ اس کی سنتا ہے جو اس کی حمد کرتا ہے۔

ذوالجلال میں جملہ تعظیمات [1] کی پیش کش۔ اس کے رسول پر درود و سلام۔ پھر اپنے لئے دعا۔

اس ظاہری اور معنوی تکمیل کے ساتھ ایک خصوصیت یہ ہے کہ انفرادی عمل کو اجتماعی عمل بنایا گیا اور جو کام الگ الگ کرنے کا تھا اس میں سب کی شرکت لازم کر دی گئی یعنی پانچ وقت کی نمازیں، جن کا پڑھنا ہر ایک عاقل بالغ مسلمان کے لئے ہر حالت میں ضروری ہے [2]۔ جن کو فرض کہا جاتا ہے ان کے متعلق نہایت تاکید [3] سے حکم ہوا کہ سب مل کر ایک ساتھ پڑھیں۔ ایک پڑھانے والا ہو (امام) باقی سب اس کی پیروی کرنے والے (مقتدی)۔

اس جماعت کا ایک مرکز ہونا چاہئے [4] جس کو مسجد کہا جاتا ہے۔ پنج وقتہ نمازوں میں ایک مخصوص اور محدود حلقہ (مثلاً محلہ) کے خدا پرستوں کا اجتماع ہونا چاہئے۔ ہفتہ میں ایک مرتبہ اس سے وسیع پیمانہ پر اور اسلامی تہوار یعنی عید، بقر عید کے موقع پر اس علاقہ کے تمام حلقوں کا مشترکہ اجتماع، آبادی سے باہر کسی وسیع مقام پر ہونا چاہئے۔

جماعت کے فوائد :

بیشک بندہ اور خدا کے درمیان جو تعلق اور رشتہ ہے اس کے تسلیم کرنے اور اس کے بروئے کار لانے کے لئے مظاہرہ کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر یہ تو ضروری ہے کہ بندگان خدا میں یاد خدا کا جذبہ پیدا ہو، خدا پرستی کا رواج ہو، پرستش حق کی فضا بنے۔ اللہ تعالیٰ کا نام کھلم کھلا لیا جائے۔ اس کی عظمت و معبودیت کی شان دکھائی جائے تاکہ جو خدا کو بھولے ہوئے ہیں انہیں اللہ یاد آئے، جو اپنے رب سے ٹوٹے ہوئے ہیں وہ اپنا رشتہ رب سے جوڑیں۔ ظاہر ہے یہ مبارک مقاصد اجتماع [5] کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے۔

تعلیم و تبلیغ اور اصلاح کے نقطہ نظر سے فائدہ یہ ہے کہ دوسروں کو ترغیب ہوتی ہے، شہری زندگی

---

[1] التحیات للہ والصلوٰت والطیبات۔

[2] مسافر ہو یا مقیم، بیمار ہو یا تندرست۔

[3] اس سلسلہ میں آنحضرت ﷺ کے ارشادات آگے آئیں گے (انشاء اللہ) یہاں قرآن پاک کے اسلوب سے سبق لیجئے۔ قرآن پاک میں جہاں نماز کا حکم ہوا ہے عموماً جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۚ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ (سورہ بقرہ۔۲۳۸) اَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (سورہ اعراف۔۲۸) يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا (سورہ حج ۷۷ وغیرہ تک، نیز صلوا (نماز پڑھو) کے بجائے جگہ جگہ اقیموا الصلواۃ ارشاد ہوا ہے۔ اقامۃ الصلوات یہی ہے کہ نماز ایسی شان سے پڑھی جائے کہ دینداری اور خدا پرستی کی فضا بنے۔ کلمۃ اللہ سر بلند ہو شان حق نمایاں ہو۔

[4] قرآن حکیم نے اس مرکز کو یہ اہمیت دی ہے کہ ستر پوشی کا حکم دیا تو نماز کو مسجد سے تعبیر کیا۔ ارشاد ہے: خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (سورہ الاعراف۔ ۳۱) "لے لو اپنی آراستگی مسجد کے وقت (یعنی ہر نماز کے وقت) "یعنی با قاعدہ نماز وہی ہے جو اس طرح ہو کہ آپ آراستہ ہو کر مسجد میں جائیں۔"

[5] امام ابو حنیفہؒ نے اس اجتماع میں ایک وحدت تسلیم کی کہ امام کو اصل قرار دیا اور مقتدیوں کو اس کا تابع۔ قرأت فاتحہ اور قرأت قرآن کا فریضہ امام ادا کریگا۔ اس کی قرأت سب کی قرأت ہو گی: من کان لہ امام فقرأۃ الامام لہ قرأۃ (الحدیث)

میں خدا پرستی کا رواج ہوتا ہے اس کا شوق بڑھتا ہے۔ معاشی اور سماجی لحاظ سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مل جل کر کام کرنے کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ تعاون اور اشتراک عمل کی رسم پڑتی ہے اور جب "ایک ہی صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں محمود وایاز" تو اخوت اور مساوات بھی نظریہ کی حد سے آگے بڑھ کر میدان عمل میں جلوہ گر ہوتی ہے اور جب ایک صف میں کندھے [1] سے کندھا ملا کر سیدھے کھڑے ہوتے ہیں کہ نہ کوئی آگے نکلا ہوا ہو اور نہ کوئی پیچھے ہٹا ہو۔ ہر ایک کا ٹخنہ دوسرے کے ٹخنہ کی سیدھ میں ہو۔ اور یہ سب خواہ ان کی تعداد لاکھوں ہو، ایک ہی امام کی آواز پر کبھی ہاتھ کانوں تک اٹھائیں، کبھی ہاتھ باندھ لیں، کبھی سیدھے کھڑے ہوں کبھی ایک ساتھ جھک جائیں، کبھی زمین پر ماتھے رکھ دیں کبھی دوزانو بیٹھ جائیں، تو ایک عسکری تربیت اور فوجی نظم وضبط کی شکل رونما ہوتی ہے۔ سب سے اہم بات یہ کہ مسجد مسلمانوں کے اجتماعی مسائل کا مرکز بھی بنی۔ یہیں ان کو انصاف مہیا کرنے کے بندوبست ہونے لگے اور یہیں مسلمانوں کی ضرورتوں، ان کے دکھ درد میں شریک ہونے کے اقدامات ہونے لگے۔ غرض اس طرح کے بہت سے فائدے وجود پذیر اور ظہور فرما ہوتے ہیں۔ مختصر یہ کہ جب مدینہ میں آزاد فضا میسر آئی اور یہ موقع ملا کہ اللہ کا نام کھلم کھلا لیا جائے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جماعت کو لازم قرار دیا [2]۔ یہاں تک کہ حضرات صحابہ کا عام مذاق یہی بن گیا کہ جماعت کے بغیر وہ نماز کو جائز ہی نہیں سمجھتے تھے [3]۔ بیمار آدمی بھی ساتھیوں کے سہارے مسجد میں آتا اور جماعت میں شریک ہوتا تھا اور سستی وہی کرتا تھا جس کے دل میں نفاق ہوتا تھا۔ پھر شہر یا آبادی ہی نہیں بلکہ جہاں بھی تین مسلمان ہوں ان کے لئے یہی حکم ہوا کہ اگر وہ جماعت سے نماز نہیں پڑھتے تو ان پر شیطان مسلط ہو جاتا ہے۔ (کہ ان کے مذہبی معاملات درہم برہم ہو جاتے ہیں ان کا صحیح نظم قائم نہیں ہوتا۔)

---

[1] ارشاد خداوندی ہے: اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ (سورہ صف۔۴) اللہ تعالیٰ محبت فرماتا ہے ان سے جو راہ خدا میں اس طرح صف باندھ کر مقابلہ باطنی دشمن یعنی شیطان اور شیطانی جذبات سے ہوتا ہے۔

[2] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں نے ارادہ کیا کہ میں لکڑیاں جمع کراؤں۔ پھر نماز پڑھنے کیلئے نماز کی اذان دیدی جائے تو کسی کو کہدوں کہ وہ نماز پڑھائے پھر میں ان کے یہاں جاؤں جو جماعت میں حاضر نہ ہوں اور ان کے گھروں کو آگ لگادوں (بخاری شریف ص۸۹) اندازہ فرمایئے رحمۃ للعلمین صلی اللہ علیہ وسلم جو اہل ایمان کے حق میں ایسے رؤف رحیم ہیں کہ ہر وہ بات ان کو شاق ہوتی ہے جو مسلمانوں کے لئے پریشانی کا سبب بنے، ترک جماعت پر اتنے ناراض ہوں) کتنی ضروری ہوئی۔

[3] قد روی عن غیر واحد من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم انھم قالوا من سمع النداء فلم یجب فلا صلوٰۃ لہ (ترمذی شریف ص۳۰)

مواخات

مہاجرین اور انصار (رضوان اللہ علیہم اجمعین) میں بھائی چارہ

(۱)

پچاس کے قریب صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے مدینہ آ چکے ہیں۔ باقی آ رہے ہیں۔ آنے والوں میں وہ بھی ہیں جو مکہ میں صاحب حیثیت تھے۔ جائیدادوں اور کاروبار کے مالک تھے، مگر اب یہ سب قرآن پاک کے الفاظ میں "الفقراء" ہیں [1]، کیونکہ نہ صرف جائیدادوں پر بلکہ ان کے مال و متاع اور سامان و اسباب پر بھی دوسروں کا قبضہ ہو چکا ہے۔

عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسے رعب و داب اور دھاک کے آدمی چند ہی تھے جنہوں نے کھلم کھلا ہجرت کی۔ باقی سب وہ تھے جو چھپتے چھپاتے خالی ہاتھ بمشکل تمام مدینہ پہنچے تھے۔ ان کے بدن کے کپڑے بھی سالم نہیں تھے۔ (کسی قدر تفصیل گزشتہ صفحات میں گزر چکی ہے)

(۲)

پوری دنیا میں صرف وہ مٹھی بھر جاں نثاران، پردیسی فقراء اور تہی دستوں کے مددگار تھے جنہوں نے بیعت عقبہ کے موقع پر ان کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دی تھی، مگر یہ کتنے تھے؟ ان کے ذرائع کیا تھے؟ صرف تہتر یا چھہتر جب کہ ان میں دو عورتیں بھی تھیں۔ [2]

(۳)

یثرب اول تو کاروباری قصبہ نہیں تھا اور جو کاروبار تھا اس پر یہودیوں کا قبضہ تھا۔ قبیلہ اوس اور خزرج کے لوگ جن سے حضرات انصار کا تعلق تھا وہ کاشتکار تھے۔ کسی کے پاس اپنی زمین تھی کوئی دوسروں کی زمین میں بٹائی پر کاشت کرتا تھا۔ جن کی زمینیں اپنی تھیں اقتصادی ڈھانچہ ان کا بھی بگڑا ہوا تھا۔ جس کے پاس جو کچھ پس انداز تھا وہ اوس اور خزرج کی آپس کی لڑائی میں ختم ہو چکا تھا جن کا سلسلہ تقریباً ایک سو بیس سال کے بعد تین چار سال پہلے ختم ہوا تھا۔

عموماً بیع سلم [1] (بدھنی) کی شکل میں یا سود پر پیشگی رقم لے لی جاتی تھی اور اکثر ایسا ہوتا تھا کہ پوری پیداوار اس سلم یا سود کی نذر ہو جاتی تھی۔

---

[1] سورہ ۵۹ حشر، آیت ۸،

[2] جو حضرات بیعت کے موقع پر حاضر نہیں ہو سکے اور مسلمان ہو چکے تھے ان کی تعداد بھی اس سے زیادہ نہ ہو گی۔

ان قبیلوں کے کچھ لوگ ان حالات سے مستثنیٰ تھے مگر ان میں سے چند کے سوا باقی سب صاحب جائیداد، بڑے لوگ اپنے سابق مذہب پر قائم تھے۔

(۴)

اللہ کے گھر (مسجد مبارک) کی تعمیر شروع ہوئی تو رحمتہ اللعالمین ﷺ کے سامنے ان درماندہ پر دیسی مہاجرین کی بود و باش کا مسئلہ بھی تھا کہ اگر ان کے رہنے کا ٹھکانا ہو جائے تو دار الھجرت میں وطن کی کچھ آسائش میسر آسکے اور پراگندہ حالی ختم ہو۔

ممکن تھا ان کے لئے الگ محلہ آباد کر دیا جاتا۔ معاشرت کا جو فرق تھا کہ اہل مدینہ کاشتکار اور زمیندار تھے اور مہاجرین تاجر پیشہ، شہری زندگی کے عادی، اس کا بھی تقاضا یہی ہونا چاہئے کہ ان کی آبادی الگ ہوتی۔ نئی آبادی کے لئے مالی مشکلات کا حل وہ باہمی تعاون تھا جس نے بلا کسی غیر معمولی خرچ کے مسجد مبارک اور ازواج مطہرات کے حجرات کی تعمیر کرادی تھی۔ لیکن علیحدہ آبادی سے مہاجرین اور انصار میں شیر و شکر جیسی یگانگت نہیں پیدا ہو سکتی تھی اور باہمی انسیت و الفت کی وہ نعمت جو اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کو عطا فرمائی تھی (جس کو کلام پاک میں خاص طور پر نمایاں فرمایا گیا تھا)[2] وہ مشاہدہ بن کر سامنے نہیں آسکتی تھی۔

جن کو مساوات، اشتراک عمل اور ایک دوسرے کے لئے ایثار و اخلاص کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کرنا تھا۔ علیحدہ آبادی نہ ان کے لئے مناسب تھی نہ وہ خود یہ علیحدگی برداشت کر سکتے تھے جو اسلامی معاشرہ میں اونچ نیچ کی بنیاد بن جاتی۔

اس کے علاوہ تعلیم و تربیت کے لحاظ سے جس مساوی سطح کی ضرورت تھی علیحدہ آبادی اس کے لئے خلیج بن جاتی۔

حضرات مہاجرین کم و بیش دس بارہ سال تک برکات نبوت سے فیضیاب ہو کر تربیت یافتہ عالم و فاضل بن چکے تھے۔ حضرات انصار کی مخلصانہ ذہانت اگرچہ ان کے لئے رہنما ہوتی تھی مگر اس ذہانت میں رحمتہ اللعالمین ﷺ "رؤف رحیم" کا رنگ بھرنے اور حضرات انصار کو مہاجرین کی سطح پر لانے کے لئے جس تواصی بالحق[3] باہمی احتساب، افادہ اور استفادہ، تعلیم و تعلم کی ضرورت تھی الگ آبادی کی صورت میں وہ پوری نہیں ہو سکتی تھی۔

---

[1] بخاری شریف ص ۲۹۸،

[2] هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۲﴾ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ۭ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۶۳﴾ (الانفال، آیت ۶۲، ۶۳)

[3] ایک دوسرے کو حق پر قائم رہنے اور اس پر عمل کرنے کی نصیحت کرنا۔

(۵)

عرب میں عقد موالات کا طریقہ رائج تھا۔ غیر قبیلہ کا آدمی کسی بھی قبیلہ میں پہنچتا، اور ایک معاہدہ کر کے اس قبیلہ میں داخل ہو جاتا، اب اسی قبیلہ کی طرف منسوب ہوتا۔ معاہدات صلح و جنگ میں شریک رہتا اور مرنے کے بعد اس کا ترکہ بھی اسی قبیلہ میں تقسیم کیا جاتا۔ حضرات مہاجرین اور انصار میں یہ عقد ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ عقد موالات کچھ روایتیں رکھتا تھا۔ ان میں ایسی روایات [1] بھی تھیں جن کو اسلام برداشت نہیں کر سکتا۔ آنحضرت ﷺ نے ان کو بدبودار [2] فرمایا۔ اور قرآن حکیم نے انکی مخالف اور متضاد بنیادوں [3] پر اسلامی تہذیب و اخلاق کی عمارت بلند کی۔ اب یہ پیغمبرانہ تدبر تھا کہ عقد موالات کے بجائے آپ نے عقد مواخات کی بنیاد ڈالی۔

(۶)

حضرت انس رضی اللہ عنہ کے مکان میں حضرات مہاجرین و انصار (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کا اجتماع ہوا۔ یہ کل نوے حضرات تھے۔ پینتالیس مہاجرین، پینتالیس انصار، آنحضرت ﷺ نے اپنی صوابدید کے موجب ان میں سے ایک ایک انصاری کو ایک ایک مہاجر کا نام بنام بھائی قرار دے دیا۔ یہ رحمتہ اللعالمین ﷺ کی پیغمبرانہ فراست اور مردم شناسی تھی کہ جن کو آپ نے بھائی بنایا فطری طور پر ان کے مزاج برادرانہ تھے۔ وہ حقیقی بھائیوں سے بھی زیادہ ایک دوسرے کے ہمدرد اور مددگار بن گئے اور مزاجوں کی موافقت کے ساتھ جب حضرات مہاجرین سے لِلّٰھِیّت اور اعلیٰ اخلاق کا بھی ظہور ہوا تو حضرات انصار کے اخلاص نے عقیدت کی

---

[1] ہمارے زمانہ کا سیاسی گٹھ جوڑ اور پارٹی بندی اس کا نمونہ ہے کہ حق و انصاف کا نام لینا بھی جرم ہوتا ہے۔ جابجا، جائز و ناجائز پارٹی کی حمایت کی جاتی ہے اور اسی کو تدبر اور دانش مندی سمجھا جاتا ہے۔

[2] دعوھا فانھا منتنہ بخاری شریف ص۷۲۹

[3] زمانہ جاہلیت میں اس تحقیق کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی تھی کہ حق پر کون ہے اور تقاضا انصاف کیا ہے۔ صرف یہ معاہدہ (عقد موالات) ہی دلیل ہوتا تھا یعنی چونکہ ہمارا حلیف میدان جنگ میں ہے تو ہمارا فرض ہے کہ ہم بھی اس کی حمایت میں میدان جنگ میں ہوں۔ اسلام نے اس قسم کے معاہدہ ہی کو حرام قرار دیا۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کا مشہور ارشاد ہے لاحلف فی الاسلام اور مسلمانوں کیلئے قرآن پاک کی خاص ہدایت یہ ہے یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ (النساء۔۱۳۵) ترجمہ: مسلمانو! ایسے ہو جاؤ کہ انصاف پر مضبوطی سے قائم رہنے والے اور اللہ کے لئے گواہی دینے والے یہ اللہ کے لئے گواہی (سچی گواہی) خواہ خود تمہارے خلاف ہو یا ماں باپ اور قرابت والوں کے خلاف ہو۔" نیز ارشاد ہے: "اگر کسی قوم سے کسی بنا پر ناراضگی بغض اور غصہ ہے تو ہرگز ہرگز ایسا نہ ہو کہ یہ بغض تمہیں ابھار دے۔ اس بات پر کہ اس کے ساتھ انصاف نہ کرو۔ ہر حال میں انصاف کرو۔ یہی تقویٰ سے لگتی ہوئی بات ہے" (سورہ مائدہ رکوع ۲ آیت ۸) "اور ایک گروہ نے اگر تمہیں خانہ کعبہ میں جانے سے روک دیا ہے جس سے تمہیں غم و غصہ ہے تو اس کا یہ اثر ہرگز نہ ہونا چاہئے کہ یہ غم و غصہ تمہیں اس بات پر ابھار دے کہ تم زیادتی کرنے لگو (تمہارا دستور تو یہ ہونا چاہئے کہ نیکی اور پرہیزگاری کے کام میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور ظلم کے کام میں مدد نہ کرو)" (سورہ ۵ مائدہ آیت ۲)

شان اختیار کرلی۔

ام العلاء رضی اللہ عنہا ایک انصاری خاتون تھیں جن کے گھرانے کے حصہ میں حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ آئے تھے۔ وہ اپنے مہمان کی اتنی معتقد ہوگئیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی تو ام العلاء رضی اللہ عنہا نے بڑے وثوق سے کہا: شہادتی علیک لقد اکرمک اللہ یعنی میں قسم کھاکر کہتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے یقیناً آپ کو بخش دیا ہے۔ ❶

رشتہ اخوت اور حضرات انصار کا ایثار

وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ (سورہ نساء۔۳۳)

"اور جن سے اقرار باندھا تم نے ان کو پہناؤ ان کا حصہ (شاہ عبد القادرؒ)

عرب میں عقد موالات کا اثر مرنے کے بعد یہ ظاہر ہوتا تھا کہ مولیٰ (جس سے یہ معاملہ ہوتا تھا) وہ چھٹے حصے کا مستحق ہوا کرتا تھا۔ مندرجہ بالا آیت کے بموجب رشتہ اخوت کا اثر وفات کے بعد ظاہر ہونا چاہئے تھا کہ ایک دوسرے کا وارث ہوتا۔ مگر حضرات انصار نے بیعت عقبہ کے سلسلہ میں جب دعوت دی تھی تو امداد کا وعدہ بھی کیا تھا۔ آقاء دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے جب رشتہ اخوت قائم فرمایا تو حضرات انصار کی مخلصانہ اور ایثار شیوہ ذہانت نے اس کے معنیٰ یہ سمجھے کہ امداد کا طریقہ برادرانہ ہونا چاہئے۔

امداد کرنے کے لئے املاک تقسیم نہیں کی جاتی مگر برادر زندگی میں برابر کا شریک ہوتا ہے۔ لہٰذا حضرات انصار نے فیصلہ فرمایا کہ مہاجر بھائیوں کو اپنی زندگیوں میں برابر کا شریک بنالیں۔ چنانچہ دربار رسالت میں درخواست پیش کر دی:

اقسم بيننا وبی اخواننا النخيل ❷

"ہمارے اور ہمارے بھائیوں کے درمیان باغات تقسیم فرما دیجئے۔"

منصوبہ یہ تھا کہ بھائیوں کا حصہ بھائیوں کے قبضہ میں دیدیا جائے۔ وہ اس کو اپنی ملک سمجھیں، اپنی صوابدید کے بموجب اس میں تصرف کریں اور فائدہ اٹھائیں لیکن رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت نے یہ منظور

---

❶ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح وثوق کرلینے اور قسم کھانے کو پسند نہیں فرمایا۔ کیونکہ کسی کو معلوم نہیں ہے کہ اس کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا۔ آپ نے تعلیم دی کہ یہ کہنا چاہئے کہ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بخش دیا ہوگا۔ (بخاری شریف ص۱۶۶) مگر حضرت ام العلاء رضی اللہ عنہا کا یہ وثوق اور یقین اس بناء پر تھا کہ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کے غیر معمولی تقویٰ اور آپ کے اعلیٰ اخلاق نے ان کو گرویدہ اور معتقد بنا دیا تھا۔

❷ بخاری شریف ص ۳۱۲ و ص ۵۳۴

نہیں فرمایا کہ حضرات انصار کی املاک سے ان کی ملکیت ختم ہو۔ دوسری طرف دشواری یہ تھی کہ خود حضرات انصار کا جو مقصد تھا وہ اس پیشکش سے پورا نہیں ہوتا تھا۔ حضرات انصار کا مقصد تو یہ تھا کہ مہاجرین کی مالی مشکلات ختم ہوں لیکن اس طرح تقسیم کے بعد حضرات مہاجرین "صاحب زمیں" ضرور ہو جاتے مگر یہ حضرات تاجر پیشہ کاشتکاری اور زراعت سے ناواقف تھے۔ وہ ان افتادہ زمینوں سے پیداوار کر کے وہ امداد حاصل نہیں کر سکتے تھے جس کے لئے حضرات انصار نے یہ ایثار کیا تھا۔

رحمت عالم ﷺ نے حضرات انصار کو اس دشواری کی طرف توجہ دلائی۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: امداد کی صورت یہ ہے کہ زمین و باغ کے بجائے پیداوار کا حصہ مہاجرین کو دو۔

باغات کی خدمت اور زمین میں کاشت کی ذمہ داری آپ صاحبان لیں اور پیداوار مہاجرین کو دیدیں ۔ ❶

حضرات مہاجرین نے بھی یہی فرمائش کی: کام کی ذمہ داری آپ لیں اور پیداوار میں ہمیں شریک کر لیں۔

حضرات انصار نے جیسے ہی یہ تجویز سنیں، دفعۃً ان کے جذبات کی صدا بلند ہوئی:

"سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا" (ہم نے سن لیا ہے ہم پوری پوری تعمیل کرینگے۔ البقرہ۔ ۲۸۵) دنیا نے بہت سے انقلاب دیکھے مگر اس انقلاب کی کوئی مثال چشم عالم کے سامنے نہیں آئی کہ مالک خود اپنی مرضی سے کاشتکار اور اجنبی لوگ پردیس سے آئے ہوئے خود بخود حصہ دار بن گئے۔ ❷

حضرات انصار رضوان اللہ علیہم اجمعین کا تصور یہی تھا اگرچہ آنحضرت ﷺ نے اس کو منظور نہیں فرمایا۔ حضرات مہاجرین کی حیثیت کو عارضی قرار دیا۔ چنانچہ جب حضرات مہاجرین کو افتادہ زمینیں مل گئیں تو حضرات انصار کی جائیدادیں واپس کر دی گئیں۔

---

❶ البدایہ والنہایہ ص۲۲۹ ج۳ و ص۲۲۸ ج۳

❷ عام طور پر یہی صورت ہوئی اگرچہ بعض حضرات نے یہ بھی کہا کہ زمینیں اور باغ لے لیا اور خود کام کیا۔ حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا کو جو درخت دیئے گئے تھے وہ ان پر مالکانہ تصرف کرتی رہیں اور اپنی ملک ہی سمجھتی رہیں۔ حتیٰ کہ جب ان سے واپس کرنے کو کہا گیا تو تیار نہ ہوئیں۔ آنحضرت ﷺ نے تقریباً دس گنی جائیداد دیکر ان کو واپس کرنے پر راضی کیا (ص ۷۹ و ۸۰ ج ۴ البدایہ والنہایہ بحوالہ مسند احمد) علامہ علی بن برہان الدین حلبیؒ کی تحقیق یہ ہے کہ حضرات انصار کی پیش کش اگرچہ یکساں تھی کہ وہ اپنی نصف املاک دینا چاہتے تھے۔ مگر حضرات مہاجرین میں سے بعض نے تو اس کو اس صورت سے منظور کیا کہ حضرات انصار ہی کام کرینگے اور ان کی پیداوار مہاجرین حضرات کو دیتے رہیں گے اور بعض نے ان اراضی کو بطور بٹائی منظور کیا کہ وہ خود کام کریں گے اور نصف حصہ انصار کو دیتے رہیں گے۔ (سیرۃ حلبیہ ص۲۹۷ ج ۲)۔ مگر اس دوسری صورت میں کوئی خاص ایثار نہیں ہے حالانکہ حضرات انصار کا ایثار اتنا تھا کہ مہاجرین حضرات کو یہ فکر ہو گیا کہ تمام اجر و ثواب یہ سمیٹ لینگے ہم تہی دامن رہ جائیں گے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

یہ ایثار کیوں تھا؟

قرآن شریف میں ہم بھی پڑھتے ہیں:

اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا مَتَاعٌ ۡ وَاِنَّ الْاٰخِرَةَ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ [1] (سورہ المومن۔ ۳۹)

"یہ دنیا (موجودہ زندگی) صرف چند دن کا کام چلانا ہے اور برت لینا ہے۔ بیشک آخرت ہی ٹھیراؤ (مستقل قیام) کا مقام ہے۔"

وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ (سورہ العنکبوت۔ ۶۴)

"بیشک اصل زندگی عالم آخرت ہے"

وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّ اَعْظَمَ اَجْرًا ؕ (سورہ مزمل۔ ۲۰)

"اور جو نیک عمل اپنے لئے آگے بھیج دو گے اس کو اللہ کے پاس پہنچ کر اس سے اچھا اور ثواب میں بڑا پاؤ گے۔"

ہمارا عقیدہ یہی ہے اور بلاشبہ ان آیتوں پر ہمارا ایمان ہے۔ لیکن ہمارے ایمان و عقیدہ کو یقین کا وہ درجہ حاصل نہیں ہے جو مشاہدہ کی شان رکھتا ہو۔ پھر مشاہدہ بھی غلطی کر جاتا ہے۔ ہماری آنکھیں آفتاب کو گردش کرتا ہوا دیکھتی ہیں۔ ہر صبح و شام کو طلوع و غروب ہمارا مشاہدہ ہے۔ لیکن سائنس کے ماہرین کہتے ہیں کہ یہ مشاہدہ غلط ہے۔ آفتاب گردش نہیں کرتا زمین گھومتی ہے۔ جب مشاہدہ بھی غلط ہو جاتا ہے تو یقین کا کوئی اور درجہ بھی ہو سکتا ہے جو مشاہدہ سے بالا ہو۔ جو سراسر یقین ہی یقین ہو۔ اس میں کسی طرح بھی شک و شبہ یا کسی قسم کے احتمال کی گنجائش نہ ہو۔ جس کو اصطلاحاً عین الیقین [2] کہتے ہیں۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو یقین کا یہی درجہ [3] حاصل تھا۔ اسی یقین کی بنا پر حضرات انصار اپنی جائیدادیں تقسیم کرنے پر خوش تھے کہ ہم نے آخرت کی حقیقی زندگی کے لئے بہت بڑا سرمایہ حاصل کر لیا اور جس کو راہ خدا میں اپنی ملک سے نکالا اس پر ابدی اور لازوال ملک کی مہر لگ گئی جو کبھی مٹنے والی

---

[1] یہ جو زندگی ہے دنیا کی سو برت لینا ہے اور وہ گھر جو پچھلا ہے وہی ہے ٹھیراؤ کا گھر" (حضرت شاہ عبد القادرؒ)

[2] مشاہدہ آتش یقین پیدا کر دیتا ہے کہ یہ آگ ہے اور یہ جلاتی ہے۔ لیکن جو یقین آتش سوزاں میں بھسم ہونے والے کو ہو سکتا ہے وہ صرف مشاہدہ کرنے والے یا تاپنے والے کو نہیں ہو سکتا۔ جلنے اور خاکستر ہونے والے کا یقین ہی ہے عین الیقین ہے۔

[3] یہی عین الیقین صحابہ کرام کی افضلیت کا سبب ہے کیونکہ امت میں یہ درجہ کسی کو بھی حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ امت میں کسی کو بھی یہ شرف حاصل نہیں ہے کہ صادق مصدوق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے بالمشافہ کوئی ارشاد سنا ہو جس سے یقین کا آفتاب روشن ہوا ہو۔

نہیں ہے۔ دوسری طرف اسی یقین اور عین الیقین نے ان حضرات مہاجرین کے پاک دلوں میں اضطراب پیدا کر دیا جو مفت میں صاحب جائیداد اور زمیندار بن گئے تھے۔ اضطراب اس پر تھا کہ حضرات انصار کے اس ایثار کا ثمرہ یہ ہو گا کہ اجر و ثواب کا ہر ایک درجہ حضرات انصار ہی حاصل کر لیں گے۔ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) ہم اس درجات تک نہیں پہنچ سکیں گے۔

چنانچہ حضرات مہاجرین نے اپنے آقا کی خدمت میں (ﷺ) عرض کیا:

"یارسول اللہ جن لوگوں میں ہم آکر اترے ہیں ہماری چشم بصیرت نے ان جیسے ہمدرد و غمگسار نہیں دیکھے۔ تنگی ہو یا فراخی ان کی ہمدردی میں فرق نہیں آتا۔ اپنی جائیدادیں ہمیں دیں پھر کام کی ذمہ داری بھی خود لے لی۔ محنت وہ خود کریں گے اور نفع میں ہمارا حصہ لگائیں گے پس سارا اجر و ثواب وہی سمیٹ لیں گے۔"

آنحضرت ﷺ نے حضرات مہاجرین کو اطمینان دلایا کہ:

"اگر تم ان کا احسان [1] مانو اور ان کے لئے دل سے دعا کرتے رہو تو تمہارا ثواب بھی کم نہ ہو گا۔" [2]

حضرات انصار کے اسی یقین کا یہ اثر تھا کہ جو ایثار کر چکے تھے اس پر وہ قانع نہیں تھے۔ چنانچہ جائیداد کے اس بٹوارہ کے بعد بھی ان کا دست کرم کوتاہ نہیں ہوا وہ ان کی طرف بھی بڑھتا رہا۔ جنہیں جائیداد نہیں ملی تھی جو گرہستی اور صاحب اہل و عیال نہیں تھے، یہ اصحاب صفہ تھے ان کی خدمت بھی وہ اپنا فرض سمجھتے تھے۔

ایثار و اخلاص کی مثالیں

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلَىٰٓ اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (سورہ حشر۔۹)

---

[1] ہمارے ایک بزرگ تحریر فرماتے ہیں: دعا کا احسان درہم و دینار کے احسان سے کم نہیں ہے۔ پھر فرماتے ہیں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے یہاں جب کوئی سائل آتا اور دعائیں دیتا جیسا کہ سائلوں کا طریقہ ہے تو ام المومنین بھی اس فقیر کو دعائیں دیتیں اور بعد میں خیرات دیتیں۔ کسی نے کہا: اے ام المومنین آپ سائل کو صدقہ بھی دیتی ہو اور جس طرح وہ آپ کو دعا دیتا ہے آپ بھی دعا دیتی ہیں۔ فرمایا: میں اگر اس کو دعا نہ دوں اور فقط صدقہ دوں تو اس کا احسان مجھ پر زیادہ رہے گا کیونکہ دعا، صدقہ سے کہیں بہتر ہے۔ اس لئے دعا کی مکافات دعا سے کر دیتی ہوں تا کہ میرا صدقہ خالص رہے دعا کے مقابلہ میں نہ ہو۔ کذا فی المفاتیح شرح المصابیح۔ لہذا جو شخص دراہم معدودہ دیگر مخلصانہ دعاؤں کا سودا کر سکتا ہے وہ کبھی نہ چوکے اور اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دے دعا ضرور حاصل کرے۔

جمادے چند دادم جاں خریدم بحمد اللہ زہے ارزاں خریدم

سیرۃ المصطفےٰ از حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی ص ۱۳۳ ج ۱

[2] البدایہ والنہایہ ص ۲۲۸ ج ۱

"اپنے سے مقدم رکھتے ہیں اگرچہ ان پر فاقہ ہی ہو"

اس آیت میں حضرات انصار کی جو خصوصیت بیان فرمائی گئی اس کی مثال [1] حضرت ابو طلحہ کا واقعہ ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ:

ایک فاقہ زدہ شخص آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آیا کہ یارسول اللہ میں سخت بھوکا ہوں [2]۔ آپ نے گھروالوں سے دریافت کرایا کچھ کھانے کو ہے؟ ہر ایک گھر سے جواب آیا صرف پانی ہے۔ آپ نے حاضرین سے فرمایا: کوئی صاحب ان کو اپنے ساتھ لے جاسکتے ہیں۔ حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: میں حاضر ہوں۔ غرض وہ اپنے ساتھ لے گئے۔ گھر میں جاکر بیوی سے کہا: رسول اللہ ﷺ کے مہمان کی عزت کرو (ادب و احترام سے مدارات کرو) اہلیہ محترمہ نے کہا: صرف بچوں کے سہارے کا کھانا موجود ہے۔ حضرت ابو طلحہ نے فرمایا: جو کچھ ہے۔ تیار کرو، چراغ [3] روشن کرلو بچوں کو بہلا کر سلادو۔ محترم خاتون نے ایسا ہی کیا۔ کھانا تیار کیا چراغ جلایا جب کھانے بیٹھے تو یہ خاتون اٹھیں بظاہر اس لئے کہ چراغ کی بتی بڑھادیں (لو تیز کردیں) مگر بڑھانے کے بجائے میاں بیوی کی آپس کی تجویز کے مطابق چراغ بجھادیا۔ اندھیری میں کھانا شروع [4] کیا۔ میاں بیوی صرف ہاتھ اور منہ چلاتے رہے گویا کھا رہے ہیں، کھایا کچھ نہیں۔ بھوکے پیٹ رات گزاری۔ [5]

یہ تھا ایثار۔ اب اخلاص ملاحظہ فرمایئے کہ آنحضرت ﷺ نے ظاہر فرمادیا تھا کہ اقتدار میں حضرات انصار کا حصہ نہیں ہوگا۔ ان کے مقابلہ میں دوسروں کو بڑھایا جائے گا۔ مگر ان حضرات کو نہ اپنے اقتدار کی طلب تھی نہ اولاد کے لئے۔ وہ خود بھی عشق مولا میں گم تھے۔ اسی عشق کا متوالا اپنی اولاد کو دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کو اپنے آقا محمد ﷺ کی خوشنودی مطلوب تھی اور اس آقا کی خوشنودی کے ذریعہ تمام آقاؤں کے آقا حضرت حق جلّ مجدہ کی رضا حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ان کو اس پر ناز تھا کہ جہاں یہ پیشن گوئی کی جاتی تھی:

---

[1] ایک اور مثال بھی بیان کی گئی ہے کہ ایک صاحب کو بکری کی سری پیش کی گئی۔ انہوں نے کہا فلاں صاحب اور ان کے بچے زیادہ ضرورت مند ہیں چنانچہ سری ان کے یہاں بھیجی گئی۔ انہوں نے ایک دوسرے صاحب کا نام لے کر اور ان کی ضروریات ظاہر کرکے ان کے یہاں بھجوادی۔ اسی طرح سات آدمیوں میں گھوم کر پہلے شخص کے پاس آئی۔ ہر ایک دوسرے کو اپنے سے مقدم رکھتا تھا (ص ۹۵ ج ۷ فتح الباری بحوالہ ابن مردویہ)

[2] فتح الباری ص ۹۴ ج ۷

[3] گویا مہمان کے اعزاز میں۔ کیونکہ کسی ضرورت سے ہی چراغ جلایا جاتا تھا، ورنہ عام طور پر گھر میں چراغ جلانے کا دستور نہیں تھا۔ بخاری شریف ص ۵۶

[4] عام عادت تھی اس لئے دوبارہ چراغ جلانے کا اہتمام نہیں کیا گیا۔

[5] بخاری شریف ص ۵۳۵ و ص ۵۳۶

انکم ستلقون بعدی اثرۃ "تم میرے بعد دیکھو گے کہ دوسروں کو تم پر ترجیح دیجائیگی"۔ ان کو بڑھایا جائے گا تم کو نظر انداز کیا جائے گا۔

وہاں بشارت بھی ساتھ ساتھ دی جاتی تھی۔

فاصبروا حتی تلقونی و موعدکم الحوض ❶

"صبر کرنا یہاں تک کہ تمہاری میری ملاقات ہو اور ملاقات کا مقام حوض کوثر ہو گا، اسی کا وعدہ ہے۔"

اور جب ان حضرات کے ایثار و اخلاص کا یہ عالم ہے تو کیا یہ ہو سکتا ہے کہ جس کی ایک نظر نے پوری جماعت میں یہ اخلاص و ایثار پیدا کیا وہ خود اخلاص و ایثار سے تہی دامن ہو (معاذ اللہ) اور کیا محمد رسول اللہ کے ایثار، اخلاص اور آپ کی صداقت و حقانیت کی یہ کھلی ہوئی دلیل نہیں ہے۔ ﷺ

صلوٰت اللہ علیہ وعلیٰ اصحابہ الکرام واتباعہ اجمعین۔ آمین

اخلاص وللّٰہیت کی انتہا

جو آپ کے کام آئے وہ بہتر ہے اُس سے جو ہمارے پاس رہے

وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى (الاعلیٰ۔۱۷)

يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّاۤ اُوْتُوْا ۔(سورہ حشر۔ ۹)

"محبت کرتے ہیں ان سے جو وطن چھوڑ کر آئے ان کے پاس اور نہیں پاتے اپنے دلوں میں کوئی رشک اس سے جو دیا جائے مہاجرین کو۔"

سنہ ۴ھ میں قبیلہ بنی نضیر کے یہودیوں نے آنحضرت ﷺ کو شہید کر دینے کا منصوبہ بنایا۔ وہ کامیاب نہیں ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو ان کے شر سے محفوظ رکھا۔ مگر ظاہر ہے ان کے اس منصوبہ سے وہ معاہدہ ختم ہو گیا جو بقاء باہم کے متعلق سنہ ۱ ہجری میں ہوا تھا۔

(تفصیل آگے آئے گی) لامحالہ ان کو وہ سزا دی گئی جو ازروئے معاہدہ لازم تھی یعنی ان کو اس علاقہ سے خارج کر دیا گیا، انکی جائیدادیں اسلامی محروسہ میں داخل ہوئیں۔ چونکہ یہ علاقہ جنگ کے بغیر قبضہ میں آیا تھا تو اس کو مجاہدین پر تقسیم نہیں کیا گیا بلکہ وحی الٰہی ❷ نے اس کو خاص رسول اللہ ﷺ کا حق قرار

---

❶ بخاری شریف ص ۵۳۵

❷ سورہ ۵۹ الحشر آیت ۶

دیا۔ ❶

رسول خدا رحمتہ اللعالمین ﷺ کے سامنے سب سے پہلے حضرات صحابہ کی مشکلات تھیں۔ آپ نے حضرات انصار کو جمع فرما کر استصواب فرمایا کہ اس علاقہ کی اراضی انصار اور مہاجرین دونوں کو دی جائیں یا صرف حضرات مہاجرین کو دی جائیں تا کہ وہ حضرات انصار کی جائیدادیں واپس کردیں اور ان کے مکانات خالی کردیں؟

ارشاد گرامی کا جواب دینے کے لئے قبیلہ اوس اور خزرج کے دونوں سردار سعد بن عبادہ (خزرج)، سعد بن معاذ (اوس) کھڑے ہوئے۔ عرض کیا یارسول اللہ جو کچھ آپ تقسیم فرمائیں حضرات مہاجرین کو تقسیم فرمادیں۔ ہمیں نہ اپنے مکانات کی ضرورت ہے نہ جائیدادوں کی۔ بلکہ ہم بہت خوش ہونگے اگر ہماری جائیدادوں اور ملکیتوں میں سے کچھ اور مہاجرین کو عنایت فرمادیں، جو راہ خدا میں وطن سے بے وطن ہوئے، گھروں سے اجڑے، جائیدادوں سے محروم ہوئے۔

آنحضرت ﷺ نے یہ حوصلہ مندانہ جواب سنا تو مطمعن ہوئے اور دعا دی:

اللھم ارحم الانصار وابناء الانصار

(اے اللہ رحم فرما انصار پر اور انصار کی اولاد پر)

اور بعض دوسری روایتوں میں تیسرا لفظ ابناء ابناء الانصار بھی ہے۔

اب آپ نے اس علاقہ کا ایک حصہ حضرات مہاجرین کو عنایت فرمایا۔ حضرات انصار میں سے دو صاحب بہت ضرورت مند تھے۔ حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ اور حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ ان کو کچھ جائیداد عطا فرمائی، باقی علاقہ اپنے پاس رکھا جس میں آنحضرت ﷺ کی طرف سے کاشت ہوتی تھی ❷ اور اسکی آمدنی میں سے ازواج مطہرات کا نفقہ ادا فرماتے تھے۔ باقی تمام آمدنی مسلمانوں کی جماعتی ❸ اور انفرادی

---

❶ اس وقت تک مملکت کی ضرورتیں بھی غیر معمولی تھیں کہ ایک مملکت کی بنیاد رکھی جارہی تھی اور حضرات مہاجرین و انصار میں اگرچہ ایسے صاحب استطاعت بھی تھے جو ضروریات زندگی فراہم کرسکتے تھے مگر کچھ ایسے تہی دست بھی تھے کہ فاقہ کے سوا ان کے پاس کچھ نہیں تھا تو اگر یہ جائیداد مجاہدین پر مساویانہ تقسیم کردی جاتی تو نہ مملکت کی بنیادی ضرورتیں پوری ہوسکتی تھیں نہ فاقہ زدہ انصار و مہاجرین کو قابل اعتماد امداد مل سکتی تھی۔ اب قرآن پاک کے الفاظ میں ان جائیدادوں پر آنحضرت ﷺ کا تسلط تسلیم کرایا گیا۔ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ (حشر آیت ۶) یعنی تمام جائیداد پر آپ کا اختیار تمیزی تسلیم کیا گیا تو آپ نے مساویانہ تقسیم کے بجائے ایسا بندوبست فرمایا کہ افراد کی ضرورتیں بھی پوری ہوئیں اور جماعت کی اقتصادی اور جنگی ضرورتوں کو بھی مدد مل سکی۔ واللہ اعلم

❷ السیرۃ الحلبیہ ص۲۹۷ ج۲

❸ فیجعلہ فجعل مال اللہ۔ بخاری شریف ص۵۷۵ و ص۸۰۷ وغیرہ فی السلاح والکراع عدۃ فی سبیل اللہ (ص ۴۲۵ بخاری شریف و قسطلانی)

خصوصاً جہاد کی ضرورتوں میں صرف کر دیتے تھے۔

بہر حال حضرات انصار نے نہ صرف یہ کہ اس زمین میں حصہ لینے سے معذرت کر دی بلکہ اپنی باقی جائیدادوں کے متعلق بھی پیش کش کر دی۔ یہ ہے عملی مثال اس بلندی حوصلہ اور وسعت قلب کی جس کو زیب عنوان آیت میں سراہا گیا ہے۔

چند سال بعد بحرین کا علاقہ محروسہ اسلامیہ میں داخل ہوا تو آنحضرت ﷺ نے چاہا کہ حضرات انصار کو کچھ زمینیں عطا فرما دیں۔ مگر حضرات انصار نے ان کے لینے سے صرف انکار ہی نہیں بلکہ بضد ہو گئے کہ جتنی زمینیں ہمیں عطا فرمائی ہیں اتنی ہی حضرات مہاجرین کو بھی عنایت فرما دیں۔ اتنی گنجائش نہیں تھی۔ ارشاد ہوا:

اما لا فاصبروا حتی تلقونی انه سیصبکم اثرۃ (بخاری شریف ص ۵۳۵)

اگر آپ صاحبان منظور نہیں کرتے تو صبر سے کام لو یہاں تک کہ تم (حوض کوثر پر) مجھ سے ملو گے (یعنی اس ایثار کے جواب میں ایثار نہیں ہو گا) بلکہ تمہیں ترجیحات سے واسطہ پڑے گا کہ دوسروں کو تم پر مقدم رکھا جائے گا۔ تمہارے حقوق کا لحاظ نہیں رکھا جائے گا۔

اسماء گرامی برادران مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہم

رجسٹروں کو اس وقت توفیق نہیں ہوئی تھی کہ حضرات صحابہ کے اسماء گرامی اپنے صفحات میں محفوظ کریں اور بھائی بننے والوں کو لکھاوٹ کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ تاہم راوی حضرات کے سینوں نے جو نام محفوظ رکھے عیون الاثر فتح الباری و سیرۃ ابن ہشام کے حوالہ سے یہاں درج کئے جاتے ہیں:

حضرات مہاجرین	حضرات انصار	حضرات مہاجرین	حضرات انصار
ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ	خارجہ بن زید رضی اللہ عنہ	حاطب بن بلتعہ رضی اللہ عنہ	عویم بن ساعدہ رضی اللہ عنہ
عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ	عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ	ابو مرثد رضی اللہ عنہ	عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ
ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ	سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ	عبد اللہ بن جحش رضی اللہ عنہ	عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ
عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ	سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ	عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہ	ابو دجانہ رضی اللہ عنہ
زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ	سلامہ بن سلامہ وقش رضی اللہ عنہ	ابو سلمہ بن عبد الاسد رضی اللہ عنہ	سعد بن خثیمہ رضی اللہ عنہ
عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ	اوس بن ثابت رضی اللہ عنہ	عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ	ابو الهیثم بن تیہان رضی اللہ عنہ
طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ	کعب بن مالک رضی اللہ عنہ	عبیدہ بن الحارث رضی اللہ عنہ	عمیر بن الحمام رضی اللہ عنہ

سعید بن زید رضی اللہ عنہ	ابی بن کعب رضی اللہ عنہ	طفیل بن الحارث رضی اللہ عنہ	سفیان نسر خزرجی رضی اللہ عنہ
مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ	ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ	صفوان بن بیضاء رضی اللہ عنہ	رافع بن معلیٰ رضی اللہ عنہ
ابوحذیفہ بن عتبہ رضی اللہ عنہ	عباد بن بشر رضی اللہ عنہ	مقداد رضی اللہ عنہ	عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ
عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ	حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ	ذوالشمالین رضی اللہ عنہ	یزید بن الحارث رضی اللہ عنہ
ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ	منذر بن عمرو رضی اللہ عنہ	ارقم رضی اللہ عنہ	طلحہ بن زید رضی اللہ عنہ
سلمان الفارسی رضی اللہ عنہ	ابوالدرداء عویمر بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ	زید بن الخطاب رضی اللہ عنہ	معن بن عدی رضی اللہ عنہ
بلال رضی اللہ عنہ	ابودریحہ عبداللہ بن عبدالرحمن رضی اللہ عنہ	عمرو بن سراقہ رضی اللہ عنہ	سعد بن زید رضی اللہ عنہ
عاقل بن بکیر رضی اللہ عنہ	مبشر بن عبدالمنذر رضی اللہ عنہ	عکاشہ بن محصن رضی اللہ عنہ	مجذر بن وماء رضی اللہ عنہ
خنیسبن حذاقہ رضی اللہ عنہ	منذر بن محمد رضی اللہ عنہ	عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ	حارث بن صمہ رضی اللہ عنہ
سرہ بن ابی رھم رضی اللہ عنہ	عبادہ بن الخشخاش رضی اللہ عنہ	مجع مولیٰ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ	سراقہ بن عمرو بن عطیہ رضی اللہ عنہ

مواخات قبل ہجرت

تعاون وتناصر اورافادہ واستفادہ کی ضرورت جیسی مدینہ طیبہ میں تھی ہجرت سے پہلے مکہ معظمہ میں بھی تھی، کیونکہ اس سے بے سہاروں کو سہارا مل جاتا تھا اور بے پناہوں کو پناہ۔ چنانچہ بقول علامہ حافظ ابن عبدالبر: مکہ میں بھی رشتہ اخوت مواخات کے ذریعہ مضبوط کیا گیا تھا۔ یہ برادران مہاجرین ۱۸ تھے۔ ان کے مبارک اسماء گرامی سے اس صفحہ کو آراستہ کیا جارہا ہے۔

۱۔ سیدنا ومولانا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	حضرت علی کرم اللہ وجہہ
۲۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ	عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ
۳۔ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ	عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ
۴ حمزہ رضی اللہ عنہ	زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ
۵۔ زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ	عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ
۶۔ عبیدہ بن الحارث رضی اللہ عنہ	بلال بن رباح رضی اللہ عنہ
۷۔ مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ	سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ
۸۔ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ	سالم مولیٰ ابی حذیفہ رضی اللہ عنہ
۹۔ سعید بن زید رضی اللہ عنہ	طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ

(ماخوذ از عیون الاثر ص۱۹۹ ج۱، حافظ ابن سید الناس)

مسجد اور حجرات کی تعمیر اور مواخات پر دوبارہ نظر

اقتصادی تعمیر، بنیادی نظریہ، طریقہ تعمیر اور دور حاضر کی اقتصادی تحریکات

محمد رسول اللہ (فداہ روحی ﷺ) اور حضرات مہاجرین جو مسجد کی اور پھر حجروں (ازواج مطہرات کے بیوت) کی تعمیر کر رہے ہیں، اسی شہر کے رہنے والے ہیں جو ملک عرب کا مرکزی شہر ہے، جو اپنے تمدن میں دنیا کے متمدن شہروں سے پیچھے نہیں ہے۔ جس کی آبادی باقاعدہ ہے۔ مختلف محلوں میں بٹی ہوئی۔ بیچ میں سڑکیں، بازار پر رونق، مکانات پختہ، ہر طرح کی آرائش سے آراستہ۔ ایک مکان وہ بھی ہے جس کو "دارالقواریر"[1] کہا جاتا تھا۔ (شیش محل) آنحضرت ﷺ اور آپ کے مہاجر رفقاء نے انہیں محلوں میں پرورش پائی تھی، انہیں گلیوں اور کوچوں میں کھیلے تھے۔ انہیں سڑکوں پر دوڑے اور چلے تھے۔ پھر تاجر بن کر انہیں بازاروں میں خرید و فروخت کرتے رہے تھے۔

دارالہجرت (مدینہ طیبہ) میں جب یہ حضرات خود مزدور اور معمار بن کر کچی اینٹوں، چھوٹے بڑے ناہموار پتھروں، کھجور کی ٹٹیوں اور کھجور کے پٹھوں اور پتوں سے مسجد مبارک اور حجروں کی تعمیر کر رہے تھے۔ تو اپنے خاندانی مکانات اور مکہ کے محلات کا نقشہ ان کے ذہنوں سے محو نہیں ہوا تھا۔ نبوت کے ابتدائی تین سال میں جو تربیت دی گئی تھی اس کا نصاب اور طریقہ تربیت پہلے گذر چکا ہے۔ یہ تربیت صرف تین سال تک ہی نہیں رہی بلکہ قیام مکہ کی پوری مدت میں اس کا سلسلہ جاری رہا اور وہ رنگ جو پہلے تین سال میں کھلا تھا وہ پختہ اور زیادہ پختہ ہوتا رہا۔ بلاشبہ یہ اسی تربیت کا نتیجہ ہے کہ تمدن کے تمام نقشوں کو چھوڑ کر جفاکش، زاہدانہ اور درویشانہ زندگی کا نقشہ جمایا جا رہا ہے۔

مگر قرآن پاک میں حضرت حق جل مجدہ کا ارشاد تو یہ ہے:

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۭ قُلْ هِىَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ (سورہ الاعراف۔ ۳۲)

"تو کہہ! کس نے منع کیا ہے رونق اللہ کی جو پیدا کی اُس نے اپنے بندوں کے واسطے اور ستھری چیزیں کھانے کی۔ تو کہہ وہ ہے ایمان والوں کے واسطے دنیا کی زندگی میں نری (مخصوص طور پر) اُن کی ہیں قیامت کے دن۔"

پھر زینت سے یہ اجتناب کیوں؟

---

[1] معجم البلدان

آپ کو فراموش نہ ہونا چاہئے کہ حضرات صحابہ نے اس دور کو تعمیر ملت کا دور اول قرار دیا تھا۔ چنانچہ اسی سال کو اسلامی سنہ (سنہ ہجری کا پہلا سال) مانا گیا۔ کلام الٰہی نے بھی من اول یوم[1] کا لفظ استعمال کر کے صحابہ کرام کے اس تخیل کی تائید فرمائی۔

آج ہر طرف پس ماندہ قوموں کو ترقی دینے کا شور ہے۔ لیکن جب ان کی ہمدردی کے دعویدار سیاسی رہنما مساوات اور سوشلزم کا نام لے کر کہتے ہیں "معیار زندگی بلند کرو" تو مسجد مبارک اور تعیر حجرات کا سادہ نقشہ خاموشی سے اشارہ کرتا ہے کہ قوم کی تعمیر ایسے نعرے سے نہیں ہو سکتی بلکہ اس طرح کے عمل سے ہوتی ہے۔ ہمدردی یہ نہیں کہ آپ اپنی کوٹھی کی سب سے اونچی منزل پر رونق افروز ہو کر خاک نشین غریبوں کو حکم دیدیں کہ ایسی ہی کوٹھی تم بھی بناؤ تا کہ مساوات اور برابری رونما ہو۔ اس کو ہمدردی نہیں کہا جاسکتا یہ ستم ظریفی ہے۔ اس نعرے سے آپ اپنے کردار کو مشتبہ کر دیتے ہیں کہ آپ اس نمائشی نعرے سے غریبوں کو سبز باغ دکھا کر اپنی عیش پرستی کے لئے وجہ جواز[2] نکالتے ہیں۔

ہمدردی یہ ہے کہ آپ قصر معلّٰی کی سطح بالا سے نیچے اتریں، غریبوں کی ٹوٹی چٹائی پر ان کے برابر بیٹھیں، پھر ان کو ساتھ لے کر آگے بڑھیں۔ یعنی پہلا مرحلہ یہ ہے کہ بلند کرنے کے بجائے آپ معیار زندگی کو برابر کریں۔ سیرتِ مبارکہ کا ایک روشن باب یہ ہے کہ آپ نے اقتصادی تعمیر و ترقی کیلئے یہی اسلوب اختیار فرمایا۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمایئے:

(۱) ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا حجرہ ٹٹیوں کا تھا۔ ٹٹیوں میں سوراخ ہو گئے تھے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ دومتہ الجندل میں تشریف لے گئے تو حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے اس غیبوبت میں حجرے کی دیواریں کچی اینٹوں کی بنوالیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ سے واپس ہوئے تو سب سے پہلے انہیں کے یہاں تشریف لے گئے۔ دریافت کیا: یہ تعمیر کیسی۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے معذرت کی کہ دیوار اس لئے بنوالی ہے کہ پردہ ہو جائے کسی کی نظر نہ پڑ سکے فرمایا: مال کا بدترین مصرف[3] یہ تعمیر[4] ہے۔

حاصل یہ ہے کہ آپ نے (صلی اللہ علیہ وسلم) عذر قبول فرمایا: مگر اس عمل کی تائید اور حمایت نہیں فرمائی جس سے ایک امتیاز پیدا ہو رہا تھا۔

---

[1] لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ (سورہ توبہ)

[2] یعنی جب معیار زندگی بلند کرنا نصب العین قرار دیا گیا تو جس کا معیار بلند ہو گیا ہے وہ قابل اعتراض نہیں۔ گویا وہ منزل پر پہلے پہنچ گیا ہے۔

[3] یعنی کرایہ کے لئے مکانات بنوانا بھی ایک قسم کی زمینداری ہے جو پسند نہیں ہے (واللہ اعلم بالصواب)

[4] طبقات ابن سعد ۱۸۱ ج ۲ (الجزء الاول من القسم الثانی)

(۲) اسی دور کا یہ واقعہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک راستے کے کنارے پر ایک مکان دیکھا جو حال میں تعمیر ہوا تھا۔ اس کا پھاٹک شاندار بنایا گیا تھا اور پھاٹک پر قبہ نما محراب بھی رکھی گئی تھی۔ دریافت فرمایا: یہ مکان کس کا ہے۔ ایک انصاری کا نام بتایا گیا۔ آنحضرت ﷺ خاموش ہو گئے۔ اگلے روز یہ انصاری دربار رسالت میں حاضر ہوئے تو خلاف معمول آقا دو جہاں ﷺ کا رخ پلٹا ہوا پایا۔ حاضرین مجلس سے اس بے التفاتی کی وجہ معلوم کی تو کوئی خاص سبب کسی کو بھی معلوم نہیں تھا۔ البتہ کل کے واقعہ کا تذکرہ کیا گیا کہ جب حضرت والا ﷺ آپ کے مکان کی طرف سے گذرے تھے تو قبہ دار پھاٹک کو دیکھ کر دریافت فرمایا تھا کہ یہ پھاٹک کس کا ہے۔ انصاری جاں نثار نے یہ بات سنی، واپس مکان پر پہنچے اور پورے پھاٹک کو منہدم [1] کرا کر زمین کے برابر کر دیا۔ [2]

(۳) یمن کا ایک قبیلہ بنو اشعر تھا۔ اس قبیلہ کے جو خاندان مسلمان ہو گئے تھے وہ مدینہ میں رہتے تھے اور فوجی خدمات (جہاد) میں حصہ لیا کرتے تھے۔ ہر ایک خاندان اپنے آمد و خرچ کا خود ذمہ دار تھا۔ لیکن ان کا یہ بھی دستور تھا کہ اگر کسی کی آمدنی میں کمی ہو جاتی (مثلاً موسم کے ختم پر نئی فصل سے پہلے تنگی ہو جاتی یا سفر میں کسی کا توشہ ختم ہو جاتا) تو ایسا کرتے تھے کہ تمام خاندانوں میں جس کے یہاں جو غلہ یا توشہ ہوتا وہ سب ایک جگہ اکٹھا کر لیتے تھے پھر سب کو برابر تقسیم کر دیتے۔ یہ آپس کی ہمدردی اور باہمی اتفاق کی صورت آنحضرت ﷺ کو اتنی پسند تھی کہ مجمع میں اس کی تعریف فرماتے ہوئے یہاں تک فرماتے:

هم مني وانا منهم (وہ میرے ہیں میں ان کا) (بخاری شریف ص۳۳۸)

(۴) حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آنحضرت ﷺ کی سب سے چھوٹی صاحبزادی تھیں۔ آنحضرت ﷺ کو ان سے بہت زیادہ تعلق خاطر تھا۔ جب آپ سفر پر تشریف لے جاتے تو سب سے آخر میں ان سے رخصت ہوتے۔ اور جب سفر سے واپس ہو جاتے تو سب سے پہلے ان کے یہاں تشریف لے جاتے۔ ایک مرتبہ آپ سفر سے واپس ہوئے اور حسب معمول ان کے یہاں تشریف لے گئے مگر حجرہ (کمرہ) کے اندر نہیں داخل ہوئے، دروازہ سے ہی واپس تشریف لے آئے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اس مرتبہ نئی بات یہ کی تھی کہ حجرے کے دروازے پر کپڑے کا پردہ آراستہ کر دیا تھا۔

---

[1] اخلاص کی انتہا یہ ہے کہ منہدم کر دینے کی اطلاع بھی نہیں دی۔ کچھ دنوں بعد جب دوبارہ اس طرف سے آنحضرت ﷺ کا گزر ہوا تو خود آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اس پھاٹک کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ تب آپ نے فرمایا اما ان کل بناء وبال علی صاحبه الاما لا الاما لا الاما لا ہر ایک تعمیر اس کے بانی کے حق میں وبال ہے مگر وہ جو ضروری ہو بہت ضروری ہو جس کے بغیر چارہ نہ ہو

[2] ابوداؤد شریف باب فی البناء ص ۳۶۴ ج ۲ مجتبائی

حضرت علی رضی اللہ عنہ اس وقت موجود نہیں تھے۔ واپس ہوئے تو حضرت فاطمہ غمگین بیٹھی تھیں جب انہیں معلوم ہوا کہ غمگین اس لئے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تھے اور خلاف معمول باہر سے ہی واپس ہو گئے تو خدمت مبارک میں حاضر ہو کر کبیدگی کا سبب دریافت کیا۔ ارشاد ہوا:
"دروازہ پر کپڑے کا پردہ سجا رکھا ہے مجھے ایسے تکلفات سے کیا واسطہ۔"
اب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ناراضگی کا سبب معلوم ہوا تو معافی چاہی اور عرض کیا جو حکم ہو اس کی تعمیل کروں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک غریب عیالدار کا نام لیا اور فرمایا کہ یہ کپڑا ان کے یہاں پہنچا دو۔ [1]

(۵) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہ وغیرھما کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو سونے کے زیورات سے منع کیا۔ یہاں تک فرمادیا کہ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اپنے محبوب کو آگ کا کنگن پہنائے وہ اس کو سونے کا کنگن پہنا دے۔ [2]

(علماء کا اتفاق ہے کہ یہ ممانعت ابتداء میں تھی اس کے بعد عورتوں کو سونے کے زیورات کی اجازت دی گئی، البتہ یہ ضروری قرار دیا گیا کہ ہر سال ان کی زکوٰۃ بلاناغہ پوری پوری ادا ہوتی رہے)

سلسلہ مواخات اور سیاسی رہنماؤں کیلئے ایک سبق

وَيُزَكِّيهِمْ [3] وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (آل عمران آیت ۱۶۴)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں قیام فرما ہوئے تو آپ کی حیثیت سیاسی سربراہ (امیر) کی بھی تھی۔ آپ مہاجرین کی آبادکاری کیلئے کوئی قانون بنا سکتے تھے۔ مگر سیرۃ مبارکہ کا سبق یہ ہے کہ قانون بنانا کارگر نہیں، دلوں کو بنانا چاہئے۔ سیاسی یا اقتصادی انقلاب کے بجائے دلوں کی دنیا میں انقلاب برپا کرو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک بہت مشہور [4] ارشاد ہے جس کا مفہوم یہ ہے:
"جسم انسان میں ایک پارچہ گوشت ہے اگر وہ ٹھیک ہے تو بدن کی پوری عمارت آباد، اگر وہ خراب ہے تو بدن کی پوری عمارت ویران۔ یاد رکھو وہ قلب ہے۔"

کلام اللہ شریف نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان یہ بیان فرمائی تھی:

---

[1] ابوداؤد شریف باب فی اتخاذ الستور
[2] ابوداؤد شریف باب ماجاء فی الذہب النساء ص ۲۳۰ ج ۲ مجتبائی
[3] ان کو (اہل ایمان کو) پاک صاف کرتے ہیں (سنوارتے ہیں) اور ان کو کتاب اور حکمت (دانش و بینش) کی تعلیم دیتے ہیں۔ سورہ ۳، آیت ۱۶۳
[4] بخاری شریف وغیرہ صحاح

”تمہارا (اہل ایمان کا) رنج و کلفت میں پڑنا اس پر بہت شاق (سخت ناگوار) گذرتا ہے۔ تمہاری بھلائی کا حریص (بہت خواہشمند) ہے وہ مومنوں کے لئے شفقت رکھنے والا رحمت والا ہے۔[1] وہ ان کو (اہل ایمان کو) اللہ کی آیتیں سناتا ہے اور ان کو سنوارتا ہے (ہر طرح کی برائیوں سے انہیں پاک کرتا ہے)“[2]

قانون کے سامنے چاروناچار گردنیں جھک جاتی ہیں مگر دل نہیں سنورتے۔ یہ نبی رحمت، رؤف رحیم کی نظر کیمیا اثر کی برکت تھی کہ حضرات انصار کے دل ایسے سنوارے، بخل اور حب مال کی برائی ختم ہوکر ایثار، فدائیت اور سخاوت کے وہ بے پناہ جذبات ان میں موجزن ہوئے کہ جیسے ہی رشتہ اخوت قائم ہوا انہوں نے خود درخواست پیش کر دی۔

اقسم بیننا وبین اخواننا النخیل[3]

ہمارے اور ہمارے بھائیوں کے درمیان باغات تقسیم کر دیجئے۔“

حضرات انصار کا اصرار یہ تھا کہ حضرات مہاجرین کو ان جائیدادوں کا مالک بنادیا جائے لیکن رحمۃ اللعالمین ﷺ جیسے غریب اور پردیسی مہاجرین کے حق میں مشفق و محسن تھے، اسی طرح آپ کا دامن رحمت انصار پر بھی پھیلا ہوا تھا۔ ان کے حق میں بھی آپ رؤف رحیم تھے۔ آپ نے ملکیت کی تقسیم منظور نہیں فرمائی۔ صرف پیداوار کی تقسیم کا فیصلہ فرمایا۔ تفصیل پہلے گذر چکی ہے۔ (یہ ہونی چاہیے شان سیاسی سربراہ اور رہنماء قوم کی)

---

[1] سورہ ۹ توبہ آیت ۱۲۸

[2] سورہ ۳ آل عمران آیت ۱۶۴

[3] بخاری شریف ص ۳۱۲ و ص ۵۳۴

سیرت مبارکہ کے اشارات
اور
تحریکات دور حاضر کے نظریات میں بنیادی فرق

وَبِضِدِّهَاتَتَبَيَّنُ الْاَشْيَاءُ

سیرت مبارکہ کے پر تقدس سلسلہ میں سوشلزم کمیونزم وغیرہ دور حاضر کی تحریکات کا ذکر کرنا سوءادب اور گستاخی ہے۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بِضِدِّهَاتَتَبَيَّنُ الْاَشْيَاءُ (یعنی کسی حقیقت کی پوری وضاحت جب ہوتی ہے جب اس کی مقابل اور برعکس چیز کو سامنے رکھا جائے)

نور آفتاب کی قدر اسی وقت ہوتی ہے جب ظلمت شب کی مصیبت جھیلی ہو۔ لہذا ان تحریکات کے بنیادی نظریات کا کسی قدر تذکرہ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سیرت مبارکہ کے ان اشارات کی وضاحت ہو سکے جن کا تعلق اقتصادیات سے ہے اور انصاف پسند اہل بصیرت ان کی قدر و منزلت معلوم کر سکیں۔ اس کے علاوہ واقعہ یہ ہے کہ تحریکات حاضرہ کے متوالوں میں ایسے بھی ہیں جو ان تحریکات کا پیوند دامن اسلام سے جوڑنا چاہتے ہیں اور اس کو اسلام پر ایک احسان سمجھتے ہیں۔ لہذا بنیادی فرق کی وضاحت اس لئے بھی ضروری ہے کہ ایسے محسنین اسلام کے سامنے حقیقت جلوہ گر ہو سکے۔

(۱)

سب سے پہلا فرق یہ ہے کہ ان تحریکات کے بانیوں نے اس حقیقت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی جس کا سمجھنا سب سے پہلے ضروری تھا۔

ان تحریکات کا منشاء اگر انسانی سماج کی فلاح و بہبود ہے تو سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ انسان کو سمجھنے کی کوشش کریں کہ انسان کیا ہے۔ انسانیت کیا ہے، تاکہ انسان کی فلاح و بہبود کے معنٰی اور ترقی کا معیار معین ہو سکے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ موجودہ تحریکات دور حاضر کی پیداوار ہیں اور اس سے پہلے انسان کے دماغ پر تالے

پڑے ہوئے تھے۔ ان تالوں کی کنجیاں بیسویں صدی عیسوی میں انسان کے ہاتھ آئی ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ صرف ڈیزائن اور نقشہ بدلا ہے ورنہ ان تحریکات کی بنیادیں بہت قدیم ہیں اور اس طرح کے انقلاب سے دنیا ہمیشہ دوچار ہوتی رہی ہے۔ [1]

موجودہ تحریکات اور ان کی ہم جنس سابق تحریکات کی مشترکہ کوتاہی یہ ہے کہ ان کی بنیاد صرف خدا فراموشی پر نہیں ہے بلکہ خود فراموشی بھی ان کی بنیادوں کا کنکریٹ اور اینٹ گارا ہے۔

انسان کیا ہے، کیوں پیدا ہوا، اس کا مستقبل کیا ہے۔ اس کائنات میں اس کی حیثیت کیا ہے۔ موت کی حقیقت کیا ہے؟ وہ فنا ہے یا انتقال (یعنی حالت کی تبدیلی اور ایک عالم سے دوسرے عالم کی طرف منتقل ہو جانا)

اگر موت انتقال ہے اور انسان موت کے بعد بھی باقی رہنے والی حقیقت ہے تو مابعد الموت کا تعلق موجودہ زندگی سے کیا ہے؟۔ قول و عمل اگر باقی رہنے والی حقیقتیں ہیں تو کس طرح؟ اور ان کا کچھ اثر مابعد الموت ہو گا یا نہیں۔ عاقبت اندیش انسان کا فرض ہے کہ میدان عمل میں قدم رکھنے سے پہلے ان سوالات کو حل کر لے۔ ان سوالات سے غفلت خود فراموشی ہے جس کا نتیجہ خدا فراموشی ہوتا ہے۔ من لم یعرف نفسہ لم یعرف ربہ۔

انسان ایک جاندار ہے۔ جو اپنے اندر غور و فکر اور تحقیق و تنقید کی طاقت رکھتا ہے۔ جس کی بنا پر اس نے خاص طرح کی زندگی اختیار کی۔ جس نے درجہ بدرجہ ترقی کرتے ہوئے موجودہ تمدن کی صورت اختیار کر لی۔ جس کے بہت سے شعبوں میں سے ایک شعبہ وہ ہے جس کو سائنس اور فلسفہ کہا جاتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں وہ کائنات کی آخری سرحد تک پرواز کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کو کچھ ایسے ضابطوں اور قوانین کی ضرورت ہے جو اس زندگی کو محفوظ رکھ سکیں۔ اور اس کو خوشگوار بنا سکیں۔ چنانچہ وہ یہ ضابطے بناتا ہے اور ان کو رائج کرتا ہے۔

یہ ہیں وہ انکشافات جو تحریکات کے بانی صاحبان کو حقیقت انسان کے متعلق خود بخود یا اس سائنس اور فلسفہ کے ذریعے سے ہو گئے جس کا دعویٰ ہے کہ وہ ہر چیز کی حقیقت سے واقف ہے۔ لیکن اس کائنات میں انسان کی حیثیت کیا ہے اس کا جواب سائنس اور فلسفہ نے بھی نہیں دیا۔ اس کے برعکس قرآن حکیم کے شروع ہی میں چند تمہیدی فقروں کے بعد سب سے پہلے انسان کی وہ خصوصیت بیان کی گئی ہے جو اس کو

---

[1] فارسی زبان اور تاریخ ایران سے دلچسپی رکھنے والے مزدوک سے واقف ہیں جس نے تقریباً پانچویں صدی عیسوی میں تحریک چلائی تھی کہ زر، زن اور زمین سب کے لئے مشترک ہے۔ زنان را خلاص گردانید واموال را مباح داشت وہمہ مردمان رادر خواستہ زن شریک ساخت چنانکہ در آتش وآب وعلف انباز ند (دبستان مذہب) والملل و نحل ص ۸۶ ج ۲، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو احقر کی تصنیف "اقتصادی تحریکات اور اسلامی تعلیم کے اشارات۔"

باقی تمام مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے۔ ساتھ ساتھ اس کی وہ حیثیت واضح کی گئی ہے جو اس کو پوری کائنات یعنی عالم مخلوقات میں حاصل ہے۔

(۳)

صرف اسلام ہی نہیں بلکہ جملہ مذاہب اس پر متفق ہیں کہ

(۱) انسان کا خاتمہ موت پر نہیں ہو جاتا بلکہ وہ ایک ایسی حقیقت ہے جو موت کے بعد بھی باقی رہتی ہے۔ موت کی حقیقت فنا ہو جانا نہیں ہے بلکہ موت ایک تبدیلی اور انتقال ہے یعنی عالم مشاہدہ سے ایک ایسے عالم کی طرف منتقل ہو جانا جو ہمارے مشاہدہ سے بالا ہے۔

(۲) اور یہ کہ انسان کا حقیقی اور دائمی مستقبل وہ ہے جس کا آغاز اس انتقال اور اس تبدیلی کے بعد ہو گا جس کو موت کہا جاتا ہے۔

لیکن اگر حقیقی مستقبل اور حقیقی زندگی وہ ہے جو موت کی گھاٹی کو پار کرنے کے بعد سامنے آئے گی تو موجودہ زندگی کا تعلق اس سے کیا ہو گا؟ اس زندگی کا آغاز از سر نو ہو گا یعنی نیست سے ہست اور عدم کی جگہ ایک وجود کا آغاز ہو گا یا وہ زندگی موجودہ زندگی کا نتیجہ اور ثمرہ ہوئی۔ گویا آج ہم بو رہے ہیں اور مرنے کے بعد اس کو کاٹیں گے یا وہ ایک قدرتی ارتقا ہو گا۔ یعنی جس طرح انسان کا موجودہ وجود ایک ارتقائی درجہ ہے جو تخلیق کے بہت سے مراحل طے کرنے کے بعد ظہور پذیر ہوا ہے[1]۔ ایسے ہی مابعد الموت بھی ایک ارتقائی درجہ ہو گا۔ سائنس نے اس کا جواب نہیں دیا۔ مذہب اس کا جواب دیتا ہے اور قرآن حکیم اس جواب کو سامنے رکھ کر نہ صرف اقتصادیات وسیاسیات بلکہ انسان کی پوری زندگی کے لئے ضابطہ حیات مقرر کرتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کی سیرۃ مبارکہ جو قرآن کے سانچہ میں ڈھلی ہوئی ہے اس کی عکاسی کرتی ہے۔

(۴)

خدا کو اس کی ضرورت نہیں ہے کہ انسان اس کو مانے۔ انسان کو ضرورت ہے کہ اپنے آپ کو باہوش ثابت کرنے کے لئے خدا کو مانے۔ اس شخص کو باہوش نہیں کہا جا سکتا جس کا دعویٰ یہ ہو کہ تاج محل

---

[1] ڈارون کا نظریہ ہمارے پیش نظر نہیں ہے۔ ہمارے پیش نظر قرآنی آیات ہیں جن میں یہ ترتیب قائم کی گئی ہے کہ انسان کی سرشت مٹی سے ہوئی۔ پھر ہر انسان کے مراتب تولید میں نطفہ، پھر حلقہ (خون بستہ) پھر گوشت کا لوتھڑا پھر انسانی شکل، پھر نفخ روح، پھر ولادت، پھر بچپن، جوانی، کہولت، پھر بڑھاپا، بس جس طرح نفخ روح (جان پڑ جانے کے بعد) بطن مادر میں رہا اور وہاں سے اس عالم میں آیا۔ یہ بھی ایک انتقال ہے۔ اسی طرح موجودہ عالم بطن گیتی ہے جہاں وہ اپنے اوصاف وخصائل اور اپنے کردار عمل کے ساتھ نشوونما پا رہا ہے اور مرنے کے معنٰی کہ وہ بطن گیتی سے دوسرے عالم میں منتقل ہو گا اور جس طرح ماں باپ کی خصلتیں اور ان کے امراض عموماً بچہ میں سرایت کر جاتے ہیں انسان کے اعمال وکردار کے اچھے برے اثرات بھی انسان میں اثر کر جائیں گے۔ دوسرے عالم میں ان کے اثرات ظاہر ہونگے۔

خود بخود وجود میں آگیا۔

یہ شخص اگر اسی کور باطنی کے ساتھ تاج محل کی سیر کرتا ہے تو نہ صرف یہ کہ وہ بانی اور معماروں کی قدر نہیں کرے گا۔ بلکہ یہ کہ وہ سنگ تراشی، نقش سازی، ڈیزائن سازی اور انجینئرنگ وغیرہ کے تصورات سے بھی محروم رہے گا۔ اس کے ذہن میں بھی نہیں آئے گا کہ ڈیزائن سازی بھی کوئی خاص فن ہے۔ سنگ خارا اور سنگ مرمر پر پھول اور بوٹیاں بنانا پھر ان میں رنگ بھرنا اور ایسے مسالے تیار کرنا کہ صدہا سال کی سیکڑوں برساتیں ان پر کوئی اثر نہ کر سکیں۔ عمارت کے طول و عرض، بلندی وغیرہ کو موزوں رکھنا بھی قابل قدر ہنر ہیں۔

یہ ظالم تاج محل کو خود رومان کر ان تمام فنون اور ان کے ماہرین پر ظلم کرتا ہے۔ ان فنون کے ایجاد کرنے اور ترقی دینے کا کوئی سوال اس کے سامنے نہیں آتا۔ وہ خود اپنے اوپر بھی ظلم کرتا ہے اور اپنی ظالمانہ فطرت سے ان تمام فنون کو بھی مجروح اور مفلوج کر دیتا ہے۔ ایسے کور باطنوں کو اگر اقتدار کی باگ ڈور دیدی جائے تو کیا تمدن ایک قدم بھی آگے بڑھ سکے گا۔

کائنات کے اس تاج محل میں جو حسن اور خوبیاں ہیں ان کو صحیح طور پر وہی پہچان سکتا ہے جو اس کے پیدا کرنے والے کو پہچانے۔ اسی کو معرفت حق کہا جاتا ہے۔ معرفت حق حقیقت پسندی اور خدا پرستی کی بنیاد ہے۔ اس کو مضبوط کرنے اور ترقی دینے کا نام روحانیت ہے۔

(۵)

انسان کی حیثیت:

انسان کی حیثیت اگر یہ ہے کہ وہ ایک جاندار ہے جس کو عقل کی نعمت دے دی گئی ہے۔ تو اس سے اعلیٰ اخلاق، شرافت اور روحانیت کا مطالبہ خاص وزن نہیں رکھتا۔ اگر وزن رکھتا ہے تو صرف اتنا جو بتقاضاء عقل ضروری ہو۔ مگر اسلام نے انسان کی حیثیت بہت بلند قرار دی ہے۔ وہ کمالات تخلیق کا بہترین نمونہ [1] اور نظام قدرت کا شاہکار ہے جس کو یہ عزت اور عظمت [2] دی گئی ہے کہ وہ اس پوری کائنات میں خالق کائنات کا خلیفہ [3] ہے۔ کائنات کی بڑی سے بڑی مخلوق حتیٰ کہ چاند سورج اور زمین و آسمان کو بھی خالق و قادر ذوالجلال نے اس کے لئے مسخر [4] کر دیا ہے۔ وہ ہر ایک پر حکم چلا سکتا ہے جس کو چاہے اپنے

---

1. لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْۤ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ (سورہ والتین۔ ۴)
2. وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْۤ اٰدَمَ (سورہ بنی اسرائیل۔ ۷۰)
3. اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (سورہ بقرہ آیت ۳۰)
4. وَسَخَّرَ لَکُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَیْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَکُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ (سورہ ابراہیم۔ ۳۳) وَسَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ (سورہ جاثیہ آیت ۱۲)

کام میں لا سکتا ہے۔

یہ ہے انسان کی حیثیت اسلام کی نظر میں اور خود فراموشی یہ ہے کہ انسان اپنی اس حیثیت سے اور اس حیثیت کے بموجب جو اس کے فرائض ہیں ان سے غافل ہو۔

فرائض :

خلافت و نیابت کے منصب جلیل کا جس طرح یہ تقاضا ہے کہ خلیفہ اپنے آقا کا فرمانبر دار اور وفادار ہو۔ ایسے ہی اس کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے آقا کے کمالات کا مظہر ہو۔ اور ان نقائص سے پاک ہو جو کمالات کی ضد ہیں اور عیب سمجھے جاتے ہیں۔ قرآن حکیم نے سب سے پہلے فقروں میں خالق کائنات کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے۔

۱۔ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ	بہت رحم کرنے ولا بہت مہربان
۲۔ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ	تمام جہانوں کا پالنے والا
۳۔ مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ	مالک انصاف کے دن کا

(۱) سب سے پہلے ضروری ہے کہ انسان میں رحم ہو۔ شفقت اور مہربانی ہو۔

(۲) اس کی فطرت میں تربیت ہو (یعنی پرورش کرنا، سکھانا، سدھانا، ضرورتمندوں کی ضرورتیں پوری کرنا) سخاوت، بخشش اور سیر چشمی جیسے صفات سے وہ آراستہ ہو۔

رب العالمین خود نہیں کھاتا دوسروں کو کھلاتا ہے۔ وہ بھوک پیاس سے بھی بے نیاز ہے لیکن انسان (جو کھانے پینے کا محتاج ہے) اگر بھوکوں کی ضرورت کو اپنی بھوک سے مقدم رکھے تو اس کا نام ایثار اور قربانی ہے۔

(۳) رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ سب سے بڑا منصف ہے اس کے خلیفہ کو بھی عدل وانصاف کا پیکر ہونا چاہئے۔

(۴) خالق کائنات رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ عٰلِمُ غَیْبِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ [1] ہے یَعْلَمُ مَا فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ [2]۔ اس کی صفت ہے اس کے خلیفہ اور نائب کو بھی ذی علم ہونا چاہئے۔ وہ عٰلِمُ غَیْبِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اور عٰلِمُ مَا فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ نہیں ہو سکتا، مگر اس کا فرض ہے کہ اپنے علم کو زیادہ سے زیادہ وسعت دے اور دعا کرتا رہے۔ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا [3]

---

[1] ان تمام باتوں کا جاننے والا جو پردۂ آسمان میں یا سینۂ زمین میں چھپی ہوئی ہیں۔ (الفاطر۔۳۸)

[2] ان تمام باتوں اور ان تمام طاقتوں کو جانتا ہے جو سمندر یا خشکی میں ودیعت ہیں۔ (الانعام۔۵۹)

[3] سورہ طٰہٰ آیت ۱۱۴

(۵) رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ صرف خالق ہی نہیں بلکہ اس کی صفت ہے: بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ [4] نئی طرح بنانے والا (ایجاد کرنے والا) زمینوں اور آسمانوں کا۔

فکر انسان کو بھی چاہئے کہ تخلیق وایجاد کی باریکیوں کی تلاش کرنے میں مصروف رہے۔ وہ نیست کو ہست اور معدوم کو موجود تو نہیں کر سکتا۔ یہ تو وہی کر سکتا ہے جس کے ایک حکم "کن" پر نیست ہست بن جائے [1] اور عدم محض جامہ وجود سے آراستہ ہو جائے۔ البتہ وہ یہ ضرور کر سکتا ہے کہ موجودات کی پوشیدہ صلاحیتوں کا کھوج لگائے اور مخفی طاقتوں کے اسباب وذرائع معلوم کر کے جدید ایجادات کو بروئے کار لائے

-

مختصر یہ کہ یہ اوصاف کمال کا سلسلہ ہے۔ ان کے برعکس اوصاف نقص ہیں۔ رحم، مہربانی اور شفقت کے مقابلہ میں سخت مزاجی، سنگ دلی، جبر و قہر، سخاوت اور سیر چشمی کے مقابلہ میں بخل، تنگ دلی اور کنجوسی، حاجت روائی اور کارسازی کے مقابلہ میں خود غرضی اور نفع اندوزی، ایثار کے مقابلہ میں، حرص طمع، رشوت ستانی اور ذخیرہ اندوزی، عدل وانصاف کے مقابلہ میں ظلم، علم کے مقابلہ میں جہل وسفاہت، تحقیق و تنقید کے مقابلہ میں اندھی تقلید۔

انسان میں قدرت نے دونوں صلاحیتیں رکھی ہیں۔ وہ اوصاف وکمال کو اپنا کر کامل و مکمل بھی بن سکتا ہے اور اوصاف نقص کو اختیار کر کے، ذلیل، کمینہ اور شیطان اخرس بھی بن سکتا ہے۔ شریعت [2] کا مطالبہ یہ ہے کہ انسان اوصاف نقص سے پاک ہو کر اوصاف کمال اختیار کرے۔ اسی کو تقدس کہا جاتا ہے۔ اس مطالبہ کو پورا کرنے کی کوشش تزکیہ ہے جو آنحضرت ﷺ کی بعثت کا اہم مقصد اور آپ کی زندگی کا اہم ترین کارنامہ ہے۔

کہا جاتا ہے کہ دور حاضر کی تحریکات کا مقصد یہ ہے کہ ملک کا ہر ایک باشندہ خوشحال ہو، زندگی کی ضرورتیں اس کو میسر ہوں، باشندگان ملک اطمینان کی زندگی گزار سکیں۔ یہ مقصد بہت مبارک ہے لیکن جب تک انسان بری خصلتوں سے پاک نہ ہو کیا یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے؟ یہ دوسرا فرق ہے جو سیرت مبارکہ کی تعلیمات کو موجودہ تحریکات سے ممتاز کرتا ہے کہ سوشلزم و نیشنلزم وغیرہ کا اسکول تزکیہ اور اصلاح اخلاق کے مفہوم سے نا آشنا بلکہ اس کے ماحول میں یہ الفاظ قطعاً بے جوڑ اور مضحکہ انگیز ہیں جبکہ سیرۃ مبارکہ کی تعلیمات تزکیہ کو ایسا محور قرار دیتی ہیں کہ ہر ایک نظام اسی کے گرد گھومتا ہے اور اسی کی

---

[4] سورہ الانعام آیت ۱۰۱

[1] ہو جا۔ یعنی عالم کون وہست میں آجا۔ عالم وجود میں آجا۔

[2] اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۔(سورہ الاحزاب۔ ۷۲)

درگاہ سے سند جواز حاصل کرتا ہے۔ کوئی بھی نظام ہو اگر اس کی بنیاد تزکیہ پر نہیں ہے تو باطل اور فاسد ہے، کیونکہ سیرت مبارکہ کی تعلیمات کا مطمح نظر صرف حیوانی زندگی نہیں جو چند روزہ عارضی ہے بلکہ اس کا مطمع نظر وہ حقیقی زندگی ہے جو ابدی اور دائمی ہوگی جس کی خوش گواری تزکیہ پر موقوف ہے۔

(۶)

ٹیکس کی عربی ضربیہ ہے۔ آپ پورے قرآن شریف کا مطالعہ کرلیجئے آپ کو کہیں کوئی ایسا لفظ نہیں ملے گا جو مالی نظام کے سلسلہ میں ٹیکس اور ضربیہ کے مفہوم کو ادا کرتا ہو۔ کیونکہ ٹیکس کی تہ میں جبر اور قہر ہوتا ہے۔ قانون کے بنانے والے اگرچہ عوام کے نمائندے ہوتے ہیں مگر اس کے نفاذ کی پشت پر حکومت کی مسلح طاقت ہوتی ہے۔ اس طرح استحصال تو ہوسکتا ہے کہ حکومت کو رقم مل جائے اور اس کے بجٹ کا خسارہ پورا ہوجائے مگر ادا کرنے والوں کے اخلاق کی اصلاح اور دلوں کا تزکیہ نہیں ہوسکتا۔ بخل، طمع، حرص جیسے امراض بدستور رہتے ہیں اور آرڈی ننس یا قانون کی بھیانک طاقت ان امراض میں نفرت، غصہ ،بغض اور عداوت جیسی بیماریوں کا اضافہ کردیتی ہے۔

جاگیرداری نظام، سرمایہ داری، زمیندارہ، انتہا یہ کہ فرد کی ملکیت ختم کردی جائے تو بہت سے محشر تو برپا ہوسکتے ہیں مگر دلوں کی پاکی اور اخلاق کی اصلاح نہیں ہوسکتی۔ بلکہ خاتمہ ملکیت سے عائلی نظام [1] درہم برہم ہوجاتا ہے جس کا نتیجہ [2] وہ نفرت انگیز انارکی ہوتا ہے جو دامن عصمت وعفت کے بھی تار پود بکھیر دیتا ہے۔

جس مالی نظام کی قرآن حکیم رہنمائی کرتا ہے اس کا نتیجہ اگرچہ یہ ہوسکتا ہے کہ سرمایہ داری، جاگیرداری حتیٰ کہ ملکیت بھی ختم ہوجائے [3]، مگر یہ خاتمہ اس طرح ہوگا کہ دلوں کی دنیا بھی بدل جائے گی

---

[1] صاحب خانہ کا اثر اور دباؤ نہ رہے تو ظاہر ہے گھر کا نظام درہم برہم اور اثر اور دباؤ صرف اس بنا پر نہیں کہ بیوی کا شوہر یا بچوں کا باپ ہے بلکہ دباؤ اور اثر اس لئے ہوتا ہے کہ وہ مالک و قابض ہے۔ بے دست و پا صاحب خانہ کا اثر صرف اخلاقی مطالبہ ہوتا ہے اور جب باپ کا دباؤ نہ ہو تو کیا اولاد با اخلاق بن سکتی ہے؟

[2] خانگی نظام ختم ہونے کے بعد جب سرکاری پرورش گاہوں میں بچے پرورش پائیں گے تو ایک طرف قرابت اور رشتہ داری کے جملہ حقوق ختم بلکہ رشتہ داروں کو پہچاننا مشکل بھی ہوگا اور بے کار بھی، دوسری جانب جنسی تعلقات کے لئے سلسلہ ازدواج بے معنیٰ ہوجائے گا۔ تفصیلات کے لئے ملاحظہ فرمایئے احقر کی تصنیف "دور حاضر کے سیاسی اور اقتصادی مسائل" "اور اسلامی تعلیم کے اشارات"

[3] انسان اللہ کا خلیفہ اور نائب ہے تو ہر چیز کا اصل مالک اللہ ہے۔ بندہ کی ملکیت صرف نیابت ہے جو مالک حقیقی کی منشا اور اس کی مصلحت کے تحت اور اس کے احکام کے تابع ہوگی۔ پھر اللہ تعالیٰ رب العالمین ہے۔ اپنے بندوں کا محافظ مشکلات کو حل کرنے والا۔ حاجتوں کو پورا کرنے والا (حل المشکلات قاضی الحاجات) پس جب بھی پرورش، حفاظت، تعلیم وتربیت وغیرہ کی ضرورتیں پیش آئیں گی، انسان پر بحیثیت نائب و خلیفہ ان ضرورتوں کو پورا کرنا ضروری ہوگا۔ انفرادی ضرورتیں افراد سے پوری ہوں گی۔ زکوٰۃ وصدقات اسی لئے ہیں کہ ضرورت مند افراد کی انفرادی ضرورتیں پوری کی جائیں۔ لہٰذا ان کی ادائیگی کے لئے حکومت کا توسط ضروری نہیں ہے وہ وہاں بھی لازم نہیں جہاں اسلامی حکومت نہیں ہے۔ صاحب استطاعت کا فرض

خارجی طاقت یعنی آرڈیننس یا قانون کی شورا شوری۔ اہل ثروت اور ارباب دولت کو سراسیمہ اور پریشان نہیں کرے گی بلکہ خود اپنے اندرونی جذبات کی سوزش ان کی نظر میں اس دولت کو وبال جان اور اس کے خرچ کرنے کو راحت واطمینان بنادے گی۔

مالی نظام کے سلسلہ میں جو الفاظ قرآن حکیم یا سنت نبویہ نے استعمال فرمائے ان پر نظر ڈالئے۔ وہ سب انقلاب انگیز ہیں مگر بجٹ کے خسارہ کو پورا کرنے کے لئے نہیں بلکہ دلوں کی بیماریوں کو دور کرنے کیلئے۔

سب سے پہلا اور سب سے مشہور لفظ زکوٰۃ ہے جس کے مفہوم میں ،تزکیہ ، داخل ہے۔ زکوٰۃ کے معنٰی پاکی ہیں اور تزکیہ کے معنٰی پاک کر دینا۔ یعنی زکوٰۃ اس لئے فرض ہوتی ہے کہ دلوں کو پاک کر دے۔ بخل وہ ناپاکی ہے جو دلوں کو ہی نہیں بلکہ اس ملکیت کو بھی ناپاک کر دیتی ہے جو اس کے زیر اثر ہو۔ زکوٰۃ دل کو بخل سے پاک کرتی ہے تو ساتھ ساتھ دولت کو بھی پاک کر دیتی ہے۔ دوسرا لفظ صدقہ ہے جو صدق سے ماخوذ ہے۔ یعنی صدقہ اس بات کی عملی دلیل ہے کہ ملی ضرورتوں کے احساس یا غریبوں اور فقیروں کی ہمدردی کا دعویٰ ایک سچی حقیقت ہے۔ محض نمائش اور بناوٹ نہیں۔ یہ دو مد لازمی ہیں۔ ان کے مصارف بھی معین ہیں۔ یہ ضرورت مند افراد کی امداد کے لئے مخصوص ہیں۔ ان دو مدوں کے ذریعہ قوم کی غریبی دور ہو سکتی ہے۔ ان کے لئے حکومت کا واسطہ بھی ضروری نہیں براہ راست صاحب دولت پر فرض ہے کہ اتنی مقدار اپنی مِلک سے نکالے اور ضرورتمند کی ملکیت میں دیدے۔ مملکت یا ملّت کی اجتماعی ضرورتوں پر زکوٰۃ وصدقات واجبہ کی رقم صرف نہیں کی جاسکتی۔ ان ضرورتوں کے لئے قرآن حکیم نے فرض یا انفاق فی سبیل اللہ کا لفظ استعمال کیا ہے :

وَ اَقۡرِضُوا اللّٰهَ قَرۡضًا حَسَنًا (سورہ مزمل۔ ۱۴)

"قرض دو اللہ کو اچھی طرح قرض دینا۔"

وَ اَنۡفِقُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ وَلَا تُلۡقُوۡا بِاَیۡدِیۡکُمۡ اِلَی التَّهۡلُکَةِ (سورہ بقرہ آیت ۱۹۵)

"اور خرچ کرو اللہ کی راہ میں اور (خرچ کو بند کر کے یعنی بخل کر کے) مت ڈالو اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں"

ہے کہ وہ ضرورت مندوں کی ضرورتیں پوری کرے۔ اسی لئے ان میں تملیک بھی ضروری ہے یعنی ضرورت مند کو محض اجازت دے دینا کافی نہیں بلکہ مالک بنانا بھی ضروری ہوتا ہے۔ البتہ اجتماعی ضرورتیں ہیئت اجتماعیہ یعنی خلافت کے ذریعہ پوری ہوں گی۔ یہ اجتماعی ہیئت خلافت اِلٰهیّہ کی حیثیت سے افراد پر اقتدار رکھتی ہے اور افراد کی مملوکات پر بھی۔ وہ کسی کی ملک چھین نہیں سکتی مگر پابندی لگا سکتی ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمایئے "دور حاضر کے سیاسی و اقتصادی مسائل"

فرض کیجئے اسلامی مملکت کی مخالف حکومتیں اپنی جنگی طاقتیں زیادہ سے زیادہ مضبوط کر رہی ہیں۔ اسلامی مملکت کی آمدنی کے عام ذرائع دفاعی ضرورتیں نہیں پوری کر سکتے۔ ہنگامی امداد کی ضرورت ہوتی ہے، حکومتیں ایسی صورتوں میں قومی قرض [1] یا قرضہ جنگ کی اپیل کرتی ہیں۔ مگر قرآن حکیم یہ قرض اللہ کے لئے طلب کرتا ہے۔ انفاق یعنی خرچ کرنے کا حکم دیتا ہے تو وہ بھی فی سبیل اللہ یعنی پہلے انسان کا رشتہ اللہ سے جوڑتا ہے۔ غیر اللہ سے اس کے دل کو پاک کرتا ہے۔ مال و دولت اور ہر چیز کے مقابلہ میں اللہ کی محبت بڑھاتا ہے اور ایمان کا معیار یہ قرار دیتا ہے کہ:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (سورہ بقرہ آیت ۱۶۵)

"جو ایمان لائے وہ بہت بڑھے ہوئے ہیں اللہ کی محبت میں"

اسی محبت کے نتیجہ میں وہ اس سے مالی قربانی کا مطالبہ کرتا ہے۔ یہ ہے تزکیۂ قلب۔

(۷)

تزکیہ کس طرح ہوتا ہے:

تزکیہ کا آغاز خود اپنے نفس سے ہوتا ہے۔ پہلے خود اپنی اصلاح کرے، اپنے نفس کو بخل، طمع، حب مال جیسی آلودگی سے پاک کرے، تب درجہ بدرجہ دوسروں سے اصلاح قبول کر لینے کی توقع کر سکتا ہے۔

اس سلسلہ تحریر کا تعلق جناب رسالت مآب حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت مبارکہ سے ہے لہذا وہی مثالیں پیش کی جا رہی ہیں جن کا تعلق خود ذات اقدس سے ہو (ﷺ)۔

دولت پرستی اور حب مال سے قلب کو پاک کرنے کی ایک مثال یہ ہے کہ آپ نے (ﷺ) طے فرما لیا کہ جو کچھ آمد ہو وہ شام تک خرچ کر دی جائے۔ کاشانہ نبوت میں رات کو کوئی ایک حبہ بھی باقی نہ رہ سکے۔

گردنوں کو پھاند کر گزرنا خلاف ادب ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اس کی ممانعت فرمائی ہے۔ ہاں کسی مجبوری کی صورت میں یہ بے ادبی معاف سمجھی جائے گی۔ آنحضرت ﷺ کو ایک روز خود ایسا کرنا پڑا۔ آپ عصر کی نماز پڑھا رہے تھے کہ آپ کو خیال آیا کہ فلاں زوجہ مطہرہ کے یہاں آپ کی کچھ چاندی

---

[1] بہت ممکن ہے حکومتوں نے قرض کی اصطلاح بالواسطہ یا بلاواسطہ قرآن سے ہی سیکھی ہو۔ لیکن اگر یہ اصطلاح قرآن سے سیکھی ہے تو محض الفاظ قرآن کے ہیں روح قطعاً غیر قرآنی ہے۔ قرآن صاحب دولت سے اس تعلق کی بنا پر دولت لیتا ہے جو اس کا خدا کے ساتھ ہے اور حکومتیں سود کا لالچ دیکر قرض لیتی ہیں۔ قرآن والے قرض سے دولت کی محبت کم ہوتی ہے، بخل کے مرض میں تخفیف ہوتی ہے اور سرکاری قرض سے ان امراض میں کمی کے بجائے اضافہ ہوتا ہے اور سب سے زیادہ یہ ہے کہ قرآنی قرض کا بار صرف صاحب دولت پر پڑتا ہے کیونکہ وہ یہ سمجھ کر قرض لیتا ہے کہ اس کا اجر دنیا میں کچھ نہیں ملے گا اللہ کے یہاں ملے گا۔ اور سرکاری قرض کا بار غریبوں پر پڑتا ہے کیونکہ سود کی ادائیگی نئے ٹیکس لگا کر یا ٹیکسوں میں اضافہ کر کے کی جاتی ہے، جس کے نتیجہ میں غریب کی غریبی میں اضافہ ہوتا ہے اور دولتمند اور زیادہ دولتمند ہو جاتا ہے۔

رکھی ہوئی ہے، جیسے ہی آپ نے سلام پھیرا بڑی پھرتی سے آپ کھڑے ہوئے اور ان زوجہ مطہرہ کے یہاں تشریف لے گئے فوراً ہی واپس تشریف لے آئے۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ لوگ حیران ہیں کیا ماجرا ہے؟ خلاف معمول اس طرح تیزی سے کیوں تشریف لے گئے ابھی کوئی دریافت نہیں کرنے پایا تھا کہ آپ نے خود ہی فرمادیا: مجھے نماز پڑھتے ہوئے یاد آیا[1] کہ کچھ چاندی رکھی ہوئی ہے۔ مجھے گوارا نہیں کہ شام کا وقت ہو اور چاندی میرے پاس رہے (ایک روایت میں یہ ہے کہ چاندی میرے گھر میں رات گزارے) لہذا میں کہہ آیا ہوں کہ اس کو تقسیم[2] کردیں۔[3]

یہ احساس لطیف کی نزاکت ہے کہ عصر کا وقت ہے۔ شام ہونے اور رات آنے میں کافی دیر ہے[4]۔ مگر یہ دیر بھی دیر نہیں معلوم ہوئی۔ گویا دولت کی آلودگی سے جس قدر جلد ممکن ہو دامن پاک ہو جائے۔ یہ تھوڑی سی چاندی کا معاملہ تھا ممکن ہے دو تین تولہ ہی ہو مگر دولت کے بڑے سے بڑے انبار کے متعلق بھی آپ کا جذبہ یہی تھا۔

ایک دن کا واقعہ ہے رات کی چاندنی میں آپ تشریف لے جا رہے تھے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ آپ کے ساتھ تھے۔ سامنے احد کا پہاڑ تھا۔ آپ نے فرمایا اگر احد پہاڑ کی برابر سونا میرے پاس ہو تو میری خوشی یہ ہوگی کہ تین راتیں نہ گزرنے پائیں کہ وہ سب راہ خدا میں خرچ ہو جائے۔ ایک دینار بھی میرے پاس باقی نہ رہے بجز اس دینار کے جو کسی مطالبہ کو ادا کرنے کے لئے محفوظ رکھنا پڑے۔[5]

زندگی بھر درہم و دینار کو یہ سعادت میسر نہ ہوئی کہ کاشانہ نبوت میں رات گذار سکے۔ بعد وفات کے لئے ارشاد ہوا:

لا تقسم ورثتی دینارا ولا درهماً۔ ما ترکت بعد نفقة نسائی ومؤنة عاملی فهو صدقة[6]

(یعنی) یہ تو ہوگا ہی نہیں کہ میرے وارث دینار یا درہم تقسیم کر سکیں۔ (البتہ کچھ جائیدادیں میری تحویل میں ہیں۔ تو) ازواج کے نفقہ اور کارندے کے حق المحنت کے علاوہ جو کچھ میرا ترکہ ہو وہ صدقہ ہے

---

[1] نماز میں کسی بات کا یاد آجانا غیر اختیاری ہے اور یہ بھی فطری بات ہے کہ انسان کا ذہن اور دماغ ہر وقت کام کرتا رہتا ہے۔ لہذا فطری اور غیر اختیاری پر پابندی نہیں لگائی جاسکتی۔ البتہ نماز سے غافل ہو کر خیال میں مصروف اور مشغول نہ ہو جانا چاہئے۔ اس خیال کو ہٹا کر نماز ہی کی طرف دھیان لگا دینا چاہئے۔ سنت مبارکہ کی تعلیم یہی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

[2] ضرورت مند اور مستحق لوگوں کی کمی نہیں تھی۔

[3] بخاری شریف ص ۱۶۳ و ص ۱۱۷

[4] سلک احناف کے بموجب گرمیوں میں تقریباً دو گھنٹے اور حضرات شوافع کے مسلک کے بموجب دوسرے مثل ہی میں عصر کی نماز پڑھی گئی تھی تو ابھی تقریباً ایک تہائی دن باقی تھا۔ مگر الفاظ حدیث (کرهت ان یمسی اویبیت عندنا) بخاری شریف ص ۱۶۳ سے وہی متبادر ہے جس سے مسلک احناف کی تائید ہوتی ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

[5] بخاری شریف ص ۹۵۴ و ص ۳۲۱ وغیرہ

[6] بخاری شریف ص ۳۸۹

ہے“

استحصال کی بندش:

تزکیہ کا مطلب صرف یہی نہیں رہا کہ اکتناز نہ ہو۔ یعنی حاصل شدہ درہم و دینار کو شب باشی کا موقع نہ ملے (شام سے پہلے ہی خرچ کر دیا جائے) بلکہ تزکیہ کا دوسرا رخ یہ تھا کہ آمدنی صرف وہ ہو جو ہر طرح مقدس، طیب اور پاک ہو۔ پھر اس پاک میں بھی یہ پابندی کہ زکوٰۃ یا صدقہ نہ ہو۔ یہ پابندی نہ صرف اپنے لئے بلکہ

(الف) نسلاً بعد نسل اپنی تمام اولاد کے لئے۔

(ب) تمام خاندان کے لئے جو آل ہاشم کہلاتا تھا (انتہا یہ کہ)

(ج) اپنے خاندان کے تمام آزاد کردہ[1] غلاموں کے لئے

پھر لطف یہ کہ (۱) محمد رسول اللہ ﷺ کا تمام تر ترکہ صدقہ، آپ کے وارثوں کو یہ حق نہیں کہ اس کو تقسیم کر سکیں۔ مگر صدقہ یا زکوٰۃ کی یہ مجال نہیں کہ وہ آل ہاشم کا دامن چھو سکے۔ (۲) پوری امت کے لئے یہ ضابطہ کہ

توخذ من اغنیاءھم وترد علی فقراءھم

یعنی جس قوم یا گروہ کے دولت مندوں سے زکوٰۃ لی جائے وہ اسی گروہ یا قوم کے ضرورتمندوں کو دیدی جائے۔ مگر آنحضرت ﷺ اور آپ کے خاندان کے لئے اس میں یہ ترمیم کہ اس ضابطہ کا جزو اول تو واجب العمل کہ اگر دولت مند ہوں تو عام مسلمانوں کی طرح ان سے بھی زکوٰۃ و صدقہ لیا جائے۔ لیکن دوسرا جزو (کہ ان کے ضرورت مندوں کو دیا جائے) حرام۔ یعنی آل ہاشم کے دولت مند یہ نہیں کر سکتے کہ عام دستور کے بموجب وہ اپنی زکوٰۃ کی رقم یا صدقہ فطرا اپنے کسی ہاشمی رشتہ دار یا اس کے آزاد غلام کو دے دیں۔ یہ رقم لامحالہ کسی غیر ہاشمی مسلمان کو ہی دینی ہو گی۔

صدقہ کے کھجور آئے ہوئے پڑے تھے۔ جگر گوشہ رسول اللہ ﷺ حضرت حسن رضی اللہ عنہ بچے تھے[2]۔ انہوں نے ایک کھجور منہ میں رکھ لیا۔ جیسے ہی سرکار دوعالم ﷺ کی نظر پڑی لخت جگر کو تنبیہ فرماتے ہوئے ارشاد ہوا:

کخ کخ اما شعرت انا لا ناکل الصدقہ

---

[1] جن کو مولیٰ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ عربوں کا حوصلہ یہ تھا کہ وہ اپنے مولیٰ کو بھی اپنے خاندان کا فرد سمجھا کرتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے سوال کو یہی حیثیت دی ہے۔ ارشاد ہے: ان الصدقہ لاتحل لنا وان موالی القوم من انفسھم۔ ترمذی شریف ص ۸۳ ج ۱، ابوداؤد شریف ص ۲۴۰ ج او ھکذا فی النسائی ص ۳۶۶ ج ۱

[2] پیدائش نصف رمضان سنہ ۳ھ (تاریخ الخلفا) آنحضرت ﷺ کی وفات کے وقت تقریباً ساڑھے چھ سال عمر تھی۔

"اخ تھو۔ اخ تھو۔ تمہیں اتنی تمیز نہیں کہ ہم صدقہ ❸ نہیں کھایا کرتے۔"

رازدرون پردہ گداران کی کیفیت :

ان تمام پابندیوں اور احتیاطوں کے بعد اندرون نشیمن کیا حالت رہا کرتی تھی۔ ذرا جھانک کر دیکھو۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا۔ جب بھی میں کھانا کھانے بیٹھتی ہوں، طبیعت ایسی بھر آتی ہے کہ اگر چاہوں تو خوب روسکتی ہوں۔ مجھے وہ حالت یاد آجاتی ہے جو آنحضرت ﷺ کی موجودگی میں رہی۔ یہاں تک کہ ایسی حالت میں دنیا سے رخصت ہوگئے۔ خدا کی قسم کبھی بھی ایسا نہیں ہوا کہ دونوں وقت آپ روٹی اور گوشت سے شکم سیر ہوئے ہوں۔ ❶

میدہ آپ نے عمر بھر نہیں دیکھا۔ کبھی آپ کے لئے چپاتی نہیں پکائی گئی۔ جو کا آٹا بھی بے چھنا پکتا تھا، یہی خوراک تھی۔ اس پر بھی دو دو ماہ گزر جاتے تھے کہ چولہے میں آگ نہیں جلتی تھی۔ دو کالی چیزیں یعنی کھجور اور پانی غذا ہوا کرتی تھیں، البتہ انصاری پڑوسی دودھ بھیج دیا کرتے تھے۔ ❷ حضرت انس رضی اللہ عنہ (آنحضرت ﷺ کے خادم خاص) فرماتے ہیں: گھر کے ❸ آدمی نو تھے۔ دن رات کے خرچ کیلئے ان سب کے واسطے صرف ایک صاع ❹ ہوتا تھا اور ایسا بھی ہوا کہ آپ نے یہودی کے یہاں زرہ رہن رکھ کر جو منگوائے اور ایسا بھی ہوا میں آنحضرت ﷺ کے لئے جو کی روٹی اور باسی چربی لے گیا۔ ❺ اس کے سوا کچھ نہیں تھا۔

بچھانے کا گدا چمڑے کا تھا جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی، ❻ اکثر کھرّے چارپائی پر آرام فرماتے تھے۔ چٹائی کے پٹھے جسم مبارک میں گڑ جایا کرتے تھے۔ ❼

وفات ہوئی تو زرہ ایک یہودی کے یہاں ❽ تیس صاع جو کے عوض میں رہن تھی۔ ❾

(حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک موٹا کمبل پیوند لگا ہوا اور ایک موٹے کپڑے

---

❸ بخاری شریف ص ۲۰۲، وفتح الباری
❶ ترمذی شریف ص ۵۸ ج ۲
❷ بخاری شریف ص ۹۵۶
❸ ازواج مطہرات۔ دسویں خود آنحضرت ﷺ
❹ ایک صاع کاوزن دوسو ستر تولہ (تین سو چھ چھٹانک) تقریباً ۲ کیلو چھ ۶ سو گرام
❺ بخاری شریف ص ۳۴۱
❻ بخاری شریف ص ۹۵۶
❼ بخاری شریف ص ۳۳۵
❽ تیس صاع تقریباً ڈھائی من
❾ بخاری شریف ۴۰۹ و شمائل ترمذی شریف

کی لنگی نکال کر ہمیں دکھائی اور فرمایا ان دو کپڑوں میں رسول اللہ ﷺ کی روح قبض ہوئی۔ [10]

وفات کے بعد ترکہ یہ تھا: (ضروری) اسلحہ، ایک خچر، قطعہ آراضی جس کو صدقہ کر دیا تھا۔ [1]

ایک معمہ : ....

سنہ ۷ھ میں خیبر فتح ہوا۔ اس کے بعد ازواج مطہرات کے نفقے مقرر کر دیئے گئے۔ ہر ایک خاتون کا سالانہ نفقہ اسی (۸۰) وسق کھجور اور بیس وسق جو [2] ۔ ایک وسق ۲ کا وزن پانچ من ڈھائی سیر۔ اس حساب سے اسی وسق کھجور چار سو پانچ من اور بیس دسق جو ایک سو ایک من دس سیر۔ کھجور اور جو کا جو بھی نرخ مانا جائے۔ جب ایک شخص کی خوراک کے لئے مہینہ میں ایک من اور سال بھر میں بارہ من جو یا کھجور بہت کافی ہوتے ہیں تو یہ کئی سو من کی مقدار فاضل ہی تھی۔ اس کے ذریعہ زندگی بہت خوش حال بن سکتی تھی پھر یہ تنگی کیوں تھی؟

جواب: کوئی حساب داں اس معمہ کو حل نہیں کر سکتا۔ قرآن حکیم نے اس کا جواب دیا ہے۔ جب صحابہ کرام کی شان یہ بیان فرمائی:

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (سورہ حشر۔۹)

"(ضرورتمندوں کو) اپنے اوپر مقدم رکھتے ہیں باوجودیکہ خود ان کو شدید ضرورت ہوتی ہے۔"

اور اللہ کے پاک بندوں کی یہ شان بیان فرمائی:

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا (الدھر۔۸)

"اور کھلاتے ہیں کھانا اس کی محبت پر (جب کھانا خود ان کو بھی محبوب ہوتا ہے اور وہ خود بھی ضرورت مند ہوتے ہیں) مسکین کو، یتیم کو اور قیدی کو"۔

ان آیات کو سامنے رکھتے ہوئے اگر عوام کی اقتصادی حالت معلوم ہو جائے تو معمہ حل ہو جائے گا۔

عوام کی حالت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد جب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا گیا تو آپ کا مع اہل وعیال یومیہ وظیفہ نصف بکری [3] مقرر کیا گیا تھا کیونکہ متوسط درجہ کے مہاجر کی یومیہ آمدنی کا اوسط یہی تھا یہ آمدنی فی کس نہیں بلکہ فی گھر تھی۔

اور جب متوسط درجہ کے مہاجرین کی یہ آمدنی تھی تو غریبوں کی آمدنی کا اوسط تو فی گھر اس سے بھی

---

[10] بخاری شریف ص ۸۶۵ ترمذی شریف ص ۲۰۶ ج ۱

[1] بخاری شریف صد ۲۱۳،

[2] ایک دسق ساٹھ صاع کا اور ایک صاع ۳ سیر چھ چھٹانک (۲۷۰ تولہ)

[3] تاریخ الخلفاء ص ۵۸ مجتبائی بحوالہ طبقات ابن سعد

کم ہو گا جس کا لازمی تقاضا عمومی افلاس تھا۔ پس عمومی افلاس اور عوام کی خستہ حالی اس معمہ کا حل ہے۔
اسکی وضاحت حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے اس واقعہ سے ہوتی ہے:

خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں جب از سر نو وظائف مقرر کئے تو ہر ایک زوجہ مطہرہ کا سالانہ وظیفہ دس ہزار درہم مقرر کیا۔ ام المومنین حضرت زینب بنت جحش (رضی اللہ عنہا) کے یہاں یہ رقم پہلی مرتبہ پہنچی تو فرمایا: اللہ تعالیٰ امیر المومنین پر رحم فرمائے۔ یہ رقم میرے پاس بھیجی حالانکہ میری سہیلیوں میں ایسی ہیں جو مجھ سے زیادہ باہمت ہیں وہ زیادہ مستعدی سے اس رقم کو تقسیم کر سکتی تھیں۔

جب پیش کرنے والوں نے کہا: محترمہ! یہ تقسیم کرنے کے لئے نہیں ہیں یہ تو آپ کے جیب خرچ کے لئے ہیں تو فرمایا: اچھا یہاں ڈال دو۔ ان کو رکھوا کر ان پر کپڑا اڈلوا دیا۔ اور اپنی خادمہ سے فرمایا: کپڑے کے نیچے ہاتھ ڈال کر فلاں خاندان کے لئے رقم نکالو۔ فلاں خاندان کے لئے نکالو۔ اسی طرح خاندان شمار کراتی رہیں اور ان کے لئے رقومات علیحدہ کراتی رہیں۔ خادمہ نے کہا: سیدہ میں بھی تو حاضر ہوں کچھ میرے لئے بھی، فرمایا: جو کچھ کپڑے کے نیچے رہ گیا ہے وہ تمہارا ہے۔

خادمہ نے کپڑا اٹھایا تو صرف پچاسی درہم باقی تھے۔ وہ اس کو عطا فرما دیئے۔ [1]

یہ تھا اسلامی سوشلزم، اگر اس کو سوشلزم کہا جاسکتا ہے جو تقسیم دولت کا قانون نہیں بنواتا بلکہ دلوں میں دولت سے نفرت اور غریبوں کی ہمدردی کا وہ جذبہ بھر دیتا ہے کہ ان کو اطمینان جب ہی ہوتا ہے جب پوری دولت تقسیم ہو جائے اور امیر غریب کی سطح پر آجائے۔ اسی کو تزکیہ کہا جاتا ہے کہ بخل، حب مال اور حرص و طمع کے جراثیم سے وہ پارہ گوشت پاک وصاف ہو جائے جس کو دل کہا جاتا ہے۔

نتیجہ:

یہ بحث بظاہر بے محل ہے مگر جب شروع ہو گئی تو اب یہ بھی ملاحظہ فرمایئے کہ یہ اقتصادی نظام جس کی بناء مساوات پر رکھی گئی تھی جس کے لئے دولت مند غریب کی سطح پر آجاتے تھے وہ کتنی جلد کامیاب ہوا اور کیسا کامیاب ہوا۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا وظیفہ یومیہ نصف بکری معین کیا گیا تھا یعنی پانچ درہم یومیہ۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے دوسالہ دور خلافت میں درج رجسٹر مسلمانوں کے وظائف مقرر کئے تو اسی نسبت سے یعنی فی کس پانچ درہم یومیہ۔ [1]

---

[1] کتاب الخراج الامام ابی یوسف ؒ ص ۴۵۔

[1] کتاب الاموال لابی عبید حدیث ۶۴۶ ص ۳۶۳۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ: فضائل، خدمات اور مناصب کا لحاظ کرتے ہوئے وظائف مقرر فرمائے جو بارہ ہزار درہم [2] سالانہ تک تھے۔ جہاں تک عام مسلمانوں کا تعلق تھا تو یہ ضابطہ مقرر کر دیا کہ جیسے ہی بچہ پیدا ہو اس کا وظیفہ جاری کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ یمن کا علاقہ زرخیز تھا تو وہاں یہ حالت ہو گئی کہ ایسے ضرورت مند نہ رہے جن کو زکوٰۃ دی جا سکے۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ یمن کے والی (گورنر) تھے انہوں نے جو زکوٰۃ وصدقات کی رقمیں وصول کیں ان کا ایک تہائی مرکز بیت المال (مدینہ) میں بھیجا مگر بجائے مبارکباد کے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی جانب سے تنبیہ نامہ پہنچا:

"آپ کو یمن اس لئے نہیں بھیجا گیا کہ وہاں سے چندہ یا جزیہ وصول کر کے یہاں بھیجیں۔ آپ کو اس لئے بھیجا گیا ہے کہ وہاں کے اہل استطاعت سے زکوٰۃ وصدقات وصول کریں اور اسی علاقہ کے ضرورت مندوں پر تقسیم کر دیں۔ پھر آپ نے یہ رقم کیسے بھیجی"؟

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے جواب میں لکھا:

سب کو دے دیا گیا جب یہاں کوئی لینے والا نہ رہا تو یہ فاضل رقم بھیج دی"۔

اگلے سال حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے نصف اور تیسرے سال زکوٰۃ کی پوری رقم مرکزی بیت المال میں بھیج دی اور جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس مرتبہ بھی اتنی سختی سے لکھا تو حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا دو لفظی جواب یہ تھا۔

ماوجدت احداً یاخذ منی شیئاً [3]

کوئی نہیں ملا جو مجھ سے کچھ لے لے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا دور شروع ہوا تو مدینہ کی یہ حالت ہو گئی کہ لوگ زکوٰۃ کی رقم لئے پھرتے تھے اور کوئی شخص ایسا نہیں ملتا تھا جو اسے قبول کر لے۔

سنہ ۷ھ میں خیبر فتح ہوا تھا۔ اس وقت سے اسلامی مملکت اس قابل ہوئی تھی کہ کسی درجہ پر مالی نظام قائم ہو سکا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا دور خلافت سنہ ۲۳ھ سے شروع ہوا اس سولہ سال کے عرصہ میں پوری مملکت کی یہ حالت ہو گئی کہ غریبی کا نام ونشان نہیں رہا۔ [4] ساتھ ساتھ تعمیرات کا سلسلہ شروع

---

[2] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارہ ہزار درہم سالانہ باقی تمام ازواج کے دس دس ہزار۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور تمام مہاجرین کے جو غزوہ بدر میں شریک تھے پانچ پانچ ہزار۔ حضرات انصار جو بدر میں شریک تھے ان کے چار چار ہزار (کتاب الاموال لابی عبید حدیث ۵۴۹ صفحہ ۲۲۴)

[3] کتاب الاموال لابی عبید حدیث ۱۹۱، صفحہ ۵۹۶۔

[4] اس نظام کی بنیادیں اتنی مضبوط تھیں کہ شدید خانہ جنگی کے باوجود خوشحالی کا دور دورہ رہا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت یعنی خلافت راشدہ کے تیس سال ختم ہونے کے بعد اگرچہ وصول اور خرچ کے بارہ میں وہ احتیاط باقی نہیں رہی تھی مگر جو اقتصادی ساکھ قائم ہو چکی تھی وہ قائم رہی۔ جس کی ایک مثال یہ تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت سے تقریباً ستاون سال بعد جب

ہوا تو وہی مدینہ جس میں قبہ دار پھاٹک ناپسند فرمایا گیا تھا اب اس کی تعمیرات محدود علاقہ سے آگے بڑھ کر کوہ سلع تک پہنچ گئیں۔ جو احد کے قریب مدینہ سے تقریباً چار میل کے فاصلہ پر ہے۔

تیسرا کام: قریش و اہل یثرب کا معاہدہ

یہود سے مصالحت

(۱)

یثرب و مضافات یثرب (مدینہ) اس عرب کا ایک علاقہ تھا جہاں نہ کوئی حکومت و سلطنت تھی نہ فوج اور پولیس۔ پورا عرب آزاد و خود سر قبائل کا ایک وسیع جنگل تھا۔ وہاں صرف معاہدات کا ایک نظام تھا ۔ وہی قبائل کو جوڑتا تھا اور وہی حفاظت کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ دو قبیلوں میں اگر جنگ ہو گئی تو وہ ان قبیلوں تک ہی نہیں رہتی تھی بلکہ ان کے حلیف اور معاہد قبیلے میدان میں اتر آتے تھے۔ اس طرح دو قبیلوں کی لڑائی دو نظاموں (دو قبائلی گروپوں) کی لڑائی بن جاتی تھی۔

یثرب کے دو قبیلے اوس و خزرج کے افراد مسلمان ہوئے تھے ان کے بھی معاہدات تھے۔ یثرب کے قریب (بنو قریظہ، بنو نضیر وغیرہ) یہود کے جو قبائل آباد تھے ان معاہدات میں شریک تھے۔ بن قریظہ ، قبیلہ اوس کے حلیف تھے۔

ان معاہدات میں جس طرح دفاع کی ذمہ داری ہوتی تھی کہ حملہ آور کا مقابلہ آپس کی متحدہ طاقت سے کریں گے اسی طرح یہ بھی ہوتا تھا کہ اگر حلیف قبیلہ کا کوئی شخص کسی کو قتل کر دے تو اس کی تلافی کی کیا صورت ہو گی۔

پنچائتی قسم کے کچھ قاعدے اصول متعارفہ کے طور پر رائج تھے جو عام طور پر تسلیم کئے جاتے تھے ۔ ان کے بموجب قتل کی بعض صورتوں میں "قصاص" ہوتا تھا۔ یعنی جان کے بدلے جان بعض صورتوں

حضرت عمر بن عبد العزیز (المتوفی رجب سنہ ۱۰۷ھ ، ۷۲۰ء) نے نظام حکومت اپنے ہاتھ میں لیا تو آپ نے عبد الحمید بن عبد الرحمن (گورنر عراق) کو حکم بھیجا کہ وظائف مقررہ ادا کر دیں۔ گورنر صاحب نے تعمیل حکم کے بعد رپورٹ بھیجی کہ تمام وظائف ادا کئے جا چکے ہیں تب بھی کافی رقم باقی ہے۔ دربار خلافت سے حکم صادر ہوا آپ کے صوبہ میں جتنے مقروض ہیں ان کا جائزہ لو اور ان سب کے قرض ادا کر دو جو فضول خرچی کی بنیاد پر مقروض نہ ہوئے ہوں۔ گورنر صاحب نے تعمیل کے بعد رپورٹ بھیجی کہ سب مقروض کے قرض ادا کئے جا چکے ہیں تب بھی رقم باقی ہے۔ حکم صادر ہوا جن نوجوانوں کے نکاح نہیں ہوئے ان کے نکاح کرا دیجئے اور مہر اس رقم سے ادا کر دیجئے۔ گورنر صاحب نے اس حکم کی تعمیل کے بعد بھی یہی رپورٹ بھیجی کہ رقم باقی ہے۔ حکم صادر ہوا جو غیر مسلم کاشتکار جزیہ ادا کرتے ہیں ان کا جائزہ لیجئے۔ ان کو تقاوی کی ضرورت ہو تو ان کی تقاوی دید یجئے کہ وہ آسانی اور سہولت کے ساتھ زمیں بو سکیں۔ (کتاب الاموال لابی عبید ص ۲۵۱ حدیث ۶۲۱)

میں جان کے بدلے جان نہیں بلکہ دیت لازم ہوتی تھی۔ دیت کے سو اونٹ مقرر تھے۔ دیت اور بعض صورتوں میں "خون بہا" صرف قاتل یا قاتل کے اہل خانہ سے وصول نہیں کیا جاتا تھا بلکہ قاتل کی سوسائٹی سے وصول کیا جاتا تھا۔ جس کو عاقلہ کہتے تھے۔ اس کی حدود ہوتی تھیں اس میں (سوسائٹی میں) قاتل کے قبیلے کے آدمی بھی ہوتے تھے۔ حلیف قبیلوں کو بھی اس میں شریک ہونا پڑتا تھا اور معاہدات میں یہ طے ہوتا تھا کہ اگر دیت لازم ہو تو کس قبیلہ کو دیت میں کتنا حصہ لینا ہوگا۔ ان شرائط کو جو قصاص، خون بہا اور دیت کے متعلق ہوا کرتی تھیں ان کو "معاقل" کہا جاتا تھا۔

(۲)

قریشی حضرات جو ہجرت کر کے مدینہ آئے تھے ایک نیا عنصر تھے۔ اگرچہ حضرات انصار نے ان کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا اور اس طرح مکی اور مدنی مسلمانوں کا ایک گروپ بن سکتا تھا جو ایک نئی سیاسی اور مذہبی پارٹی کی حیثیت میں رونما ہوتا؟ مگر رحمت عالم ﷺ نے یہ صورت اختیار نہیں فرمائی۔

یہ گروپ ایک وزن رکھتا تھا اور اگر صرف سیاسی انقلاب مقصود ہوتا تو یہ گروپ کار آمد ہو سکتا تھا لیکن جس کا نصب العین دعوت الی اللہ تھا وہ اس جتھہ بندی کو پسند نہیں کر سکتا تھا۔

حضرات انصار یعنی قبیلہ اوس اور قبیلہ خزرج کے جو افراد مسلمان ہوئے تھے ان کے پورے قبیلے اور کتنے بطن مسلمان نہیں ہوئے تھے اور بہت سے وہ تھے کہ ان کے گھر کے بھی سب آدمی مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ وہ سابق مذہب پر قائم تھے۔ اس طرح کی جتھہ بندی آپس میں تصادم اور مقابلہ کی شکل پیدا کر دیتی جس کا نتیجہ فساد فی الارض اور قطع ارحام ہوتا جو اسلام میں بدترین جرم ہے۔

جتھہ بندی اور علیحدگی کے برخلاف رحمت عالم ﷺ نے اتفاق و اتحاد اور میل ملاپ کا راستہ اختیار کیا۔ آپ نے اس علاقہ کے تمام باشندوں میں خیر سگالی اور تعاون و امداد باہمی کی روح پیدا کرنی چاہی۔ مواخات جس کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے اس کی پہلی کڑی تھی۔ جس سے آپ نے مہاجرین اور انصار میں نہ صرف تعاون اور خیر سگالی کا رشتہ قائم کیا بلکہ انصار اور مہاجرین کو بھائی بھائی بنا دیا۔

یثرب میں ایک فرقہ مشرکین کا تھا جو قریش مکہ کا ہم مذہب تھا اور قریش مکہ اس کو آسانی سے اپنا آلہ کار بنا سکتے تھے۔ دوسرا فرقہ یثرب کے قرب وجوار میں یہود کا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے حضرات مہاجرین کا رابطہ ان سے بھی قائم کر دینا چاہا۔

(۳)

مدینہ میں تشریف لانے کے بعد آپ نے جو کام سب سے پہلے کئے ان میں تیسرا کام یہ تھا کہ آپ نے مہاجرین اور ان تمام فرقوں میں بقاء باہم، تعاون اور خیر خواہی اور خیر اندیشی کا رشتہ قائم کرنے کے لئے ایک تحریر مرتب فرمائی اس کو عہد نامہ بھی کہہ سکتے ہیں اور ایک وفاق کا دستور اساسی بھی۔ قریش مکہ کی تمام

کوششوں کو ناکام بناتے ہوئے جس کامیابی کے ساتھ آنحضرت ﷺ اور حضرات مہاجرین مکہ سے نکل کر مدینہ تشریف لائے تھے اور یہاں ایک مرکز کی بنیاد ڈال دی تھی اس نے جس طرح قریش کو چراغ پا کر دیا تھا حتیٰ کہ انہوں نے فوراً [1] ہی اس مرکز کو ختم کرنے کی سازش شروع کر دی تھی اس کا بھی تقاضا تھا کہ حضرات مہاجرین اور باشندگان یثرب و مضافات یثرب کے درمیان تعاون، تحفظ اور بقاء باہم کا عہد و پیمان ہو۔ اس عہد نامہ سے یہ تقاضا بھی پورا ہو رہا تھا۔

(۴)

اس عہد نامہ کا ایک فریق حضرات قریش میں جو ایمان و اسلام سے مشرف ہوئے اور ہجرت کر کے مدینہ میں قیام پذیر ہوئے جن کو عہد نامہ میں المومنین والمسلمین من قریش سے تعبیر کیا گیا ہے، دوسرا فریق اہل یثرب ہیں (کسی مذہبی فرقہ کی بناء پر نہیں بلکہ باشندہ یثرب کی حیثیت سے) ان میں حضرات انصار کے علاوہ وہ بھی شامل ہیں جو اب تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ اپنے کفر و شرک پر قائم تھے۔ ان میں عبداللہ بن ابی بن سلول جیسے رؤسا بھی تھے جو کھلم کھلا [2] آنحضرت ﷺ اور اسلام کی مخالفت کیا کرتے تھے۔

یہود بنو نضیر، بنو قریظہ، بنو قینقاع وغیرہ اہل یثرب نہیں ہیں۔ یہ قبائل یثرب سے باہر مضافات یثرب میں آباد تھے۔ اہل یثرب (اوس اور خزرج) سے ان کے معاہدات تھے۔ ان معاہدات کو آنحضرت ﷺ نے نظر انداز نہیں فرمایا بلکہ ان کو مستحکم اور مضبوط کیا ہے۔ چنانچہ انہیں معاہدات کے واسطہ سے ان کو اس عہد نامہ میں شامل فرمایا ہے:

آنحضرت ﷺ کوئی فریق [3] نہیں ہیں آپ ایک سرپرست ہیں اور اس معاہدہ کے بانی کی حیثیت سے آپ کو مرکزی شخصیت تسلیم کیا گیا ہے اور یہ طے کیا گیا ہے کہ باہمی نزاعات میں آپ کی ذات پاک مرجع ہوگی اور آپ کا فیصلہ آخری ہوگا۔

آپ کی یہ مرکزی حیثیت کسی مادی طاقت کی بنیاد پر نہیں ہے۔ انصار و مہاجرین کی مٹھی بھر جماعت جو آپ کے ساتھ تھی یہ طاقت نہیں رکھتی تھی کہ مشرکین یثرب اور قبائل یہود کو اس پر مجبور کر دے کہ وہ آپ کو مرکز اور مرجع تسلیم کریں۔ یہ آپ کی پر تقدس شخصیت کا اعجاز تھا کہ مخالفین کے قلوب بھی اس

---

[1] چنانچہ اپنے ہم مشرب یعنی مشرکین مدینہ کو خط لکھا کہ مسلمانوں کو نکال دو یا ان سے جنگ کرو، ورنہ ہم مدینہ پہنچیں گے اور تمہارے جوانوں کو قتل کر دیں گے۔ عورتوں کی آبرو خراب کرینگے (ابوداؤد شریف باب خیر النضیر) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو عہد زریں جلد اول (قریش کی طرف سے یثرب میں مخالف محاذ)

[2] ملاحظہ ہو بخاری شریف ص ۶۵۶ وص ۹۱۶ وص ۹۲۴ وغیرہ حدیث اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ جس میں تذکرہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک مجمع کو خطاب فرمانا چاہا تو عبداللہ بن ابی بن سلول نے توہین آمیز انداز سے مخالفت کی۔

[3] جو تمام جہانوں کے لئے رحمت بن کر آیا وہ تو سب کا تھا وہ کسی ایک کا کیسے ہو سکتا تھا۔

اعتراف پر مجبور ہو گئے کہ آپ سے صرف سچائی، انصاف اور ہمدردی و خیر خواہی کی توقع کی جا سکتی ہے۔ آپ جیسا شخص کاذب و ظالم نہیں ہو سکتا۔ آپ کی اسی مقبولیت نے جو چند روز میں حاصل ہو گئی تھی آپ کو مرجع اور مرکز بنایا اور آپ کی اسی مقبولیت نے ان کا بھی وزن بڑھا دیا جو آپ کے جاں نثار تھے۔ پھر اس معاہدہ کے ایک ایک لفظ پر نظر ڈالئے کوئی بات بھی ایسی نہیں جس کا انکار کیا جا سکے۔ سچائی، تقویٰ اور نیک کردار کی تاکید بار بار کی گئی ہے جس سے انکار کوئی بھی نہیں کر سکتا تھا۔

سرپرستانہ حیثیت کے علاوہ (جو نزاع کے وقت مرجع بنے گی) اور کوئی اختیار آپ نے اپنے لئے منظور نہیں کرایا۔

دنیا کی تاریخ نے اس عہد نامہ کو یہ اہمیت دی ہے کہ اس کو "اقدم دستور مسجل فی العالم" (دنیا میں بنیادی حقوق کی سب سے پہلی باقاعدہ دستاویز) بھی کہا گیا۔ لہذا ہم اس کو بجنسہ نقل کرتے ہیں۔ اردوداں حضرات کی آسانی کے لئے ہر ایک فقرہ کے سامنے اس کا ترجمہ کر دیا گیا ہے۔ فقروں کے شروع میں نمبر عہد نامہ میں نہیں ہیں۔ یہ مترجم کا اضافہ ہے تاکہ منشاء اور مفہوم پوری طرح واضح ہو جائے۔ اس عہد نامہ کی حیثیت ابن ہشام نے ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

قال ابن اسحاق وکتب رسول اللہ ﷺ کتاباً بین المھاجرین والانصار و وادع فیہ یہود وعاھدھم و اقرھم علی دینھم واموالھم علیھم وشرط واشترط لھم

(ترجمہ: فن مغازی کے امام علامہ ابن اسحاق نے بیان فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے ایک کتاب (تحریر) لکھی۔ مہاجرین اور انصار کے درمیان اس تحریر میں یہود سے بھی مصالحت کی صورت اختیار کی۔ ان سے معاہدہ کیا اور ان کو اپنے دین پر قائم رکھا اور جو جائیدادیں ان کی تھیں ان پر قائم رکھا۔ کچھ شرطیں ان پر لگائیں اور کچھ شرطیں ان کے لئے تسلیم کیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(۱) ھٰذا کتاب من محمد النبی رسول اللہ بین المومنین والمسلمین من قریش واھل یثرب ومن تبعھم فلحق بھم وجاھد معھم

"یہ تحریر ہے محمد اللہ کے نبی کی طرف سے جو اللہ کے رسول ہیں قریش کے مومنین و مسلمین اور اہل یثرب کے درمیان اور جو ان کے [1] تابع ہیں اور ان سے الحاق کئے ہوئے ہیں۔ اور کوشش وجدوجہد

---

[1] نحوی قاعدہ کے لحاظ سے مطلب یہ ہو گا کہ جو اہل یثرب کے تابع اور ان کے ساتھ ہیں۔ اسی عہد نامہ کے دوسرے حصہ میں یہود کا تذکرہ ہے اس میں یہود بنی النجار، یہود بنی الحارث وغیرہ کے الفاظ میں جن سے اسی کی تائید ہوتی ہے یعنی بنی النجار کے ساتھ جو یہود ہیں انہیں یہود بنی النجار کہا گیا ہے باقی دوسری صورت کہ یہ معنیٰ لئے جائیں کہ جو یہود مسلمانوں کے تابع ہیں وہ

میں ان کے ساتھ ہیں۔

(۲) انّھم امۃً واحدۃ دون الناس

"یہ کہ یہ سب (اپنے ماسوا) تمام انسانوں کے مقابلہ میں ایک امت ❷ ہونگے"

(۳) المھاجرون من قریش علی ربعتھم۔ ❸

"قریش کے وہ افراد جو ہجرت کر کے آئے ہیں وہ اپنے حال پر بدستور رہیں گے۔ ان کی آزادی اور ان کے حقوق بدستور رہیں گے۔"

یتعاقلون بینھم وھم تغدون عانیھم بالمعروف والقسط بین المسلمین

"قصاص وخون بہا اور دیت کے متعلق جو ان کا دستور ہے اور جو ان کے معاہدات ہیں وہ بدستور رہیں گے ان کا کوئی شخص قید ہوگا تو اس کا فدیہ وہ خود ادا کرینگے (کوئی حلیف اس کا ذمہ دار نہیں ہوگا) یہ تمام باتیں اس طرح ہونگی کہ مسلمانوں کے ساتھ بھی عام دستور کے مطابق بھلائی اور انصاف کا معاملہ طے کیا جائے گا۔"

(۴) وبنوعوف علی ربعتھم یتعاقلون معاقلھم الاولیٰ کل طائفۃ تفدی عانیھا بالمعروف والقسط بین المومنین۔

بنو عوف کی آزادی اور ان کے حقوق بدستور رہیں گے۔ قصاص، خون بہا اور دیت کے متعلق جو ان کا دستور ہے اور جو ان کے معاہدات ہیں وہ بدستور رہیں گے۔ ان کا کوئی شخص قید ہوگا تو اس کا فدیہ وہ خود ادا کریں گے۔ یہ تمام باتیں اس طرح ہونگی کہ مسلمانوں کے ساتھ عام دستور کے مطابق بھلائی اور انصاف کا معاملہ کیا جائے۔

پھر اسی طرح قبائل بنو الحارث، بنو ساعدہ، بنو جشم، بنو النجار، بنو عمرو بن عوف، بنو بنیت، بنو الاوس کے نام لئے گئے ہیں اور ہر ایک قبیلہ کے نام کے ساتھ یہ صراحت کر دی گئی ہے جو مہاجرین اور بنو عوف کے لئے کی گئی ہے کہ ان کی آزادی اور ان کے حقوق بدستور رہیں گے۔ قصاص۔ خون بہا اور دیت کے متعلق جو ان کا دستور ہے اور جو ان کے معاہدات ہیں وہ بدستور رہیں گے۔ ان کا کوئی شخص قید ہو جائے گا تو اس کا فدیہ وہ خود ادا کریں گے۔ یہ تمام باتیں اسی طرح ہوں گی کہ مسلمانوں کے ساتھ بھی عام دستور کے مطابق بھلائی اور انصاف کا معاملہ کیا جائے گا۔

نحوی لحاظ سے بھی صحیح نہیں ہیں اور عہد نامہ کے سیاق اور پرداخت کے بھی مخالف ہے۔ علاوہ ازیں جو یہود مسلمانوں کے ساتھ ہوں ان کو ایک علیحدہ فقرہ (۱۱) میں بیان کیا گیا ہے۔

❷ گروہ، قوم، جماعت یعنی اگر مذہبی آزادی حاصل رہے تو مسلمان دوسری قوم یا گروہ کے ساتھ مل کر امۃ واحدہ ہو سکتے ہیں۔

❸ ربعتھم کعبۃ ای حالۃ حسنۃ وامرھم الذی کانوا علیہ (قاموس)

(۵) ان المومنین لا یترکون مفرحاً[1] ان یعطوہ بالمعروف فی فداء اوعقل

یہ کہ مسلمان کسی ایسے شخص کو جو قرض میں دبا ہو اکثر العیال ہو اس بات سے نہیں چھوڑیں گے (محروم نہیں کرینگے) کہ اس کو اچھی طرح عطیہ دیں۔ فدیہ یا دیت کے سلسلہ میں[2]

(۶) وان لایحالف مومن مولیٰ مومن دونہ

اور یہ کہ کسی مسلمان کو یہ حق نہیں ہو گا کہ وہ کسی مسلمان کو نظر انداز کر کے اس کے حلیف سے معاہدہ کرلے (جو مسلمان پہلے سے حلیف ہے اس کو بھی اس معاہدہ اور عہد وپیمان میں شریک رکھنا ہو گا)

(۷) وان المومنین المتقین ایدیھم علی کل من بغی منھم اوابتغی[3] دسیعۃ ظلم۔ اواثم اوعدوان اوفساد بین المومنین وان ایدیھم علیہ جمیعاً ولوکان ولد احدھم

اور یہ کہ اہل تقویٰ مومنین سب کی طاقت متحد رہے گی، اس شخص کے مقابلہ میں جو ان سے بغاوت کرے (ان پر ظلم وزیادتی کرے) یا ظالمانہ طریقہ پر ان سے وصول کرنا چاہے، یا مسلمانوں کے آپس میں گناہ، ظلم یا فساد پھیلانا چاہے۔ ایسے شخص کے مقابلہ میں ان کی طاقت متحد رہے گی خواہ (وہ ظالم) کسی کا اپنا لڑکا ہی ہو۔

(۸) ولا یقتل مومن مومنا فی کافر ولا یُنصر کافر علی مومن

"یہ کہ کوئی مومن کسی مومن کو کسی کافر کی حمایت[4] میں قتل نہیں کرے گا۔ نہ کسی کافر کی کسی مومن کے مقابلہ میں مدد کی جائے گی۔"

---

[1] المفرج المثقل من الدین الکثیر والعیال (ابن ہشام ص ۳۰۲ ج ۱)

[2] یعنی اگر کوئی مقروض اور کثیر العیال مسلمان ہو اور اس پر کسی سلسلہ میں فدیہ یا دیت لازم ہو جائے تو مسلمانوں کو حق ہو گا کہ وہ اچھی طرح اس کی امداد کریں اور اس کے ساتھ وہی معاملہ کریں جو عام مسلمانوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو اس امداد کا حق ہو گا اس پر کسی کو اعتراض کرنے کا موقع نہیں ہو گا۔ (واللہ اعلم)

[3] ای ابتغی منھم ان یدفعوالیہ علی وجہ ظلمھم ای کونھم مظلومین (مجمع البحار)

[4] حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ مکہ کے مشہور رئیس، دشمن اسلام امیہ بن خلف سے کاروباری سلسلہ میں معاہدہ کئے ہوئے تھے۔ غزوہ بدر میں حضرات انصار نے امیہ بن خلف کا تعاقب کیا۔ حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے اس کو بچانا چاہا اس میں خود ان کو بھی تلوار لگ گئی اور زخمی ہو گئے مگر مجاہدین انصار نے امیہ کو قتل کر ہی دیا۔ (بخاری شریف ص ۳۰۸) اب اگر امیہ کے حامی ان انصار سے قتل امیہ کا بدلہ لینا چاہتے (جیسا کہ قاعدہ تھا، بلکہ ضروری سمجھا جاتا تھا) اور اس سلسلہ میں معاہدہ کی بنا پر یا کسی اور تعلق کی بنا پر حضرت عبد الرحمن رضی اللہ عنہ سے مدد چاہتے تو معاہدہ کی اس دفعہ کے بموجب حضرت عبد الرحمن رضی اللہ عنہ کے لئے جائز نہ تھا کہ وہ حامیانہ امیہ بن خلف کی امداد کرتے۔ اس دفعہ کے معنیٰ یہ بھی لئے گئے ہیں کہ کوئی مسلمان کسی مسلمان کو کسی کافر کے مقابلہ میں قتل کرنے کا مجاز نہ ہو گا۔ مگر اس مفہوم کے لئے لفظ "بکافر" ہونا چاہئے تھا۔ یہاں "فی کافر" ہے فی کافر کی صورت میں معنے وہی ہو سکتے ہیں جو ترجمہ میں لکھے گئے۔ علاوہ ازیں میدان جنگ یا دارالحرب میں تو بیشک یہی ہے مگر دارالاسلام میں یہ حکم نہیں ہے وہاں اگر مسلمان کسی ذمی کو قتل کردے تو امام اعظم کا مسلک یہی ہے کہ مسلمان کو ذمی کافر کے قصاص میں قتل کیا جائے گا۔ واللہ اعلم بالصواب

(۹) وان ذمة الله واحدة يجير عليهم ادناهم

یہ کہ اللہ کی ذمہ داری (پناہ) ایک ہے (یعنی اللہ کے نام پر جو ذمہ داری لی جائیگی اس کا احترام تمام مسلمانوں پر لازم ہو گا) پناہ دے سکتا ہے مسلمانوں کی ذمہ داری پر سب سے معمولی درجہ کا مسلمان بھی۔ [1]

(۱۰) وان المومنين بعضهم موالى بعض دون الناس

اور یہ کہ ہر ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا ولی ہو گا (معاہدہ صلح وجنگ میں شریک ہو گا) یہ ولایت غیر مسلم کو حاصل نہیں ہو گی۔

(۱۱) وانه من تبعنا من يهود فان له النصر الاسوة غير مظلومين ولا متناصر عليهم

اور یہ کہ جو یہودی ہمارے ساتھ ہوں گے ان کی مدد کی جائے گی۔ ان کے ساتھ ہمدردی کی جائے گی وہ مظلوم نہیں ہونگے نہ ان کے ساتھ انتقامی [2] کارروائی کی جائے گی۔

(۱۲) وان سلم المومنين واحدة لايسالم مومن دون مومن فی قتال فی سبیل الله الاعلی سواء وعدل بينهم

اور یہ کہ مسلمانوں کی صلح ایک ہے۔ کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کے بغیر قتال فی سبیل اللہ (راہ خدا میں جنگ) کے سلسلہ میں صلح نہیں کر سکتا مگر اس صورت میں کہ مساوات ہو اور آپس میں پوری طرح انصاف ہو (جب کسی معمولی مسلمان کے عہدوپیمان کو بھی یہ اہمیت ہے کہ وہ سب مسلمانوں کا عہدوپیمان مانا جاتا ہے تو مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ صلح یا عہد وپیمان ایسی صورت سے کرے جس میں حقوق کی مساوات اور سراسر عدل وانصاف ہو۔ اگر اس میں کوتاہی کی ہے تو صرف اپنے حق میں نہیں بلکہ تمام مسلمانوں کے حق میں کوتاہی ہے [3]) واللہ اعلم

(۱۳) وان كان غازية غزت معنا يعقب بعضها بعضا [1]

"اور یہ کہ مجاہدین (غازیوں) کی جو جماعت ہمارے ساتھ (ہمارے نظام کے ماتحت) غزوہ کریگی اس کا غزوہ نمبروار ہو گا۔ ایک ہی جماعت (فوج) مسلسل نہیں جائے گی بلکہ اگر ایک مرتبہ جا چکی ہے تو اب دوسری جماعت جائے گی۔ اس کے بعد اپنے نمبر پر یہ جا سکے گی۔"

---

[1] یعنی اگر معمولی درجہ کا مسلمان جو ذمہ دارانہ حیثیت نہیں رکھتا، نہ افسر ہے نہ عہدیدار، عام مسلمان میں سے ایک ہے وہ بھی کسی غیر مسلم کو پناہ دیدے یا اس سے کوئی معاہدہ کر لے تو تمام مسلمانوں پر اس کی پابندی ضروری ہو گی۔

[2] یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ ان کے برخلاف ان کے مخالفین کی مدد نہیں کی جائے گی۔

[3] اس کے باوجود افسر اعلیٰ کو مسترد کرنے کا حق نہیں ہے۔ وہ مسترد اسی وقت کر سکتا ہے جب ایسا عہدوپیمان ہو جس میں سراسر معصیت ہے، کسی حرام کو جائز یا حلال کو حرام قرار دے دیا گیا ہو۔ تفصیلات کتب فقہ میں ہیں۔

[1] ای یکون الغزوة بينهم نوباً فاذا خرجت طائفة ثم عادت لم تكلف ان تعيد ثانية حتى يعقبها اخرى غيرها (مجمع البحار تحت کلمة عقب)

(۱۴) وان المومنین یبی ءُ بعضهم بعضاً بمانال دماءهم فی سبیل الله

"اور یہ کہ مسلمان ایک دوسرے کے برابر ہو گا۔ اس (امتحان کی بنا پر جو پیش آیا ہو گا ان کے خونوں کو اللہ کی راہ میں۔ یعنی جانی قربانی معیار ہے فرق مراتب اسی معیار پر ہو گا جنکی قربانیاں مساوی ہیں ان کا درجہ بھی مساوی ہو گا۔ اس کا مفاد یہ ہے کہ قبائل میں جو فرق مراتب [1] پہلے تھا اب وہ قابل تسلیم نہیں ہو گا۔ جب تک قربانیاں بھی اس درجہ کی نہ ہوں۔"

(۱۵) وان المومنین المتقین علی احسن هدی واقومه

اور یہ مومن متقی بہت بہتر طور وطریق اور نہایت مضبوط اصول پر قائم رہیں گے (اہل ایمان اور اہل تقویٰ کا فرض ہو گا کہ ان کے اطوار بہتر اور ان کے اصول واخلاق مضبوط ہوں)

(۱۶) وانه لایجیرمشرك مالا بقریش ولانفسا ولا یحول دونه علی مومن

اور یہ کہ کوئی مشرک قریش کے کسی مال کی ذمہ داری نہیں لے گا نہ کسی قریش کی جان کی ضمانت کرے گا (پناہ دیگا) نہ کسی قریش کی حمایت میں کسی مسلمان کے آڑے آئے گا۔

(۱۷) وانه من اعتسبط مومناً قتلاً عن بینة فانه قود بها الاان یرضی ولا المقتول بالعقل وان المومنین علیه کافة ولایحل لهم الاقیام علیه

جو شخص کسی بے قصور مسلمان کو قتل کر دیگا جس کا بینہ (باقاعدہ) شہادت موجود ہو تو اس کے قصاص میں ماخوذ ہو گا۔ (جان کے بدلہ جان دینا ہو گی) البتہ اگر مقتول کے وارث خون بہا پر راضی ہو جائیں تو خون بہا دینا ہو گا اور تمام مسلمانوں کو جماعتی حیثیت میں اس اصول کو نافذ کرنا ہو گا جب تک اس پر عمل نہ ہو جائے کسی اور کام میں مشغول ہو جانا مسلمانوں کے لئے درست نہ ہو گا۔

(۱۸) انه لایحل لمومن اقر بما فی هٰذه الصحیفة واٰمن بالله والیوم الاخر ان ینصر محدثا [2] اویوویه وانه من نصره او اٰواه علیه لعنة الله وغضبه یوم القیٰمة لایوخذ منه صرف ولا عدل

اور یہ کہ جائز نہیں ہو گا کسی صاحب ایمان کے لئے جو اس دستاویز کے مضمون کا اقرار کرے اور جو اللہ

---

[1] چنانچہ پہلے قبائل بنی تمیم، بنی اسد، بنی عامر افضل مانے جاتے تھے اور ان کے مقابلہ میں قبائل جھینہ، مزینہ، مسلم اور غفار کا درجہ کم تھا، مگر چونکہ یہ قبائل پہلے ہی اسلام سے مشرف ہوئے اور حضرات انصار ومہاجرین کے ساتھ خدمات انجام دیں تو آنحضرت ﷺ نے ان کی فضیلت بیان فرمائی۔ ارشاد ہوا: قریش والانصار وجهینه ومزینه واسلم وغفار واشجع میرے مدد گار ہیں اور اللہ اور رسول ان کے مدد گار ہیں۔ اللہ اور رسول کے علاوہ ان قبائل کا اور کوئی مدد گار نہیں ہے۔ (بخاری شریف باب ذکر اسلم وغفار مزینہ وجہینہ واشجع ص ۴۹۸)

[2] محدثا۔ دال پر زیر جنایت کرنے والا (مجمع البحار) یہ کوئی فتنہ اٹھانے والا، سازش کرنے والا بھی ہو سکتا ہے اور بدعتی یعنی کسی بدعت کا ایجاد کرنے والا بھی ہو سکتا ہے اور اگر دال پر زبر ہو تو مراد فتنہ یا بدعت ہو گی اور یہ مطلب ہو گا کہ کسی صاحب ایمان کے لئے جائز نہیں ہو گا کہ کسی فتنہ کو پسند کرے اور اس کو بڑھنے اور پھیلنے کا موقع دے۔ والایوءه الرضاعنه وصبره علیه واقرار فاعله (مجمع البحار)

اور قیامت کے دن پر ایمان لائے یہ کہ کسی فتنہ پرداز کی مدد کرے یا کسی فتنہ اٹھانے والے کو پناہ دے (اپنے یہاں ٹھیرائے)۔ اور جو اس کی مدد کرے گا اور اس کو پناہ دیگا (ٹھیرنے کا موقع دیگا) اس پر اللہ کی لعنت خدا کا غضب، قیامت کے روز نہ اس کی توبہ قبول ہو نہ فدیہ (کفارہ) [2]

(۱۹) وانکم مهما اختلفتم فيه من شيئ فان مرده الى الله والى محمد

اور یہ کہ جب بھی اس عہد نامہ کی کسی بات میں اختلاف کرو تو مرجع اللہ ہو گا اور محمد ﷺ اس کا فیصلہ ذات اقدس محمد ﷺ کے حوالہ ہو گا جو اس عہد نامہ کے بانی اور معاہدہ کرنے والوں کے سرپرست ہیں۔ اور آپ سے ہی فیصلہ کی اپیل ہو گی۔

(۲۰) وان اليهود ينفقون مع المومنين ما داموا محاربين

جب تک کسی جنگ کا سلسلہ رہے تو مصارف جنگ مسلمانوں کے ساتھ یہود کو بھی برداشت کرنے ہوں گے۔

(۲۱) وان يهود بنى عوف امة مع المومنين لليهود دينهم وللمسلمين دينهم۔ مواليهم و انفسهم الامن ظلم او اثم فانه لا يوقع الا نفسه و اهل بيته

اور یہ کہ بنی عوف کے یہودی اور مسلمان ایک امت ہونگے۔ یہود کے لئے ان کا دین ہو گا اور مسلمانوں کے لئے ان کا دین۔ اپنے اپنے مذہبوں میں آزاد رہتے ہوئے تیسرے کے مقابلہ میں ایک متحدہ طاقت ہونگے۔ اور جو ان کے موالی ہیں آزاد کردہ غلام یا ان کے حلیف اور وہ خود ان سب کے لئے یہی ہے (کہ وہ اپنے دین پر) مگر وہ شخص جو ظلم کرے۔ کیونکہ ایسا شخص خود اپنے آپ کو اور اپنے اہل بیت (متعلقین) ہی کو برباد کرے گا۔ (اس بربادی کی ذمہ داری خود اس پر ہو گی)۔

(۲۲) وان ليهود بنى النجار مثل ماليهود بنى عوف

یہود بنی نجار کے لئے بھی وہی شرطیں اور وہی حقوق ہیں جو یہود بنی عوف کے بیان کئے گئے۔

(۲۳) اس کے بعد یہود بنی الحارث، یہود بنی ساعدہ، یہود بنی جشم، یہود بنی الاوس، یہود بنی ثعلبہ کا نام لیا گیا ہے اور ہر ایک کے متعلق یہ الفاظ دہرائے گئے ہیں۔ مثل ما لیہود بنی عوف، ان کو وہی حقوق حاصل ہونگے جو یہود بنی عوف کے حقوق ہیں۔

آخر میں یہ ہے:

الامن ظلم او اثم فانه لا يوقع الا نفسه و اهل بيته

مگر وہ شخص جو ظلم کرے یا کوئی جرم کرے کیونکہ ایسا شخص خود اپنے آپ کو اور اپنے بیت (متعلقین) کو برباد کر دیگا اس بربادی کی ذمہ داری خود اس پر ہو گی۔

---

[2] یہ معنی بھی کئے گئے ہیں کہ نہ اس کی نفل عبادت قبول ہو نہ فرض۔ (مجمع البحار)

(۲۴) پھر یہ چند تشریحی اور توضیحی دفعات ہیں:

(الف) وان جفنة بطن من ثعلبة

(الف) یہ کہ جفنہ، ثعلبہ کا بطن (ضمنی قبیلہ) ہے۔

(ب) وان لبنی الشطینة مثل ما لیھود بنی عوف و ان البر دون الاثم

(ب) یہ کہ بنی شطنہ کے وہی حقوق ہیں جو یہود بنی عوف کے (تسلیم کئے گئے) اور یہ کہ ہر (نیکی اور بھلائی) نصب العین اور اصول کار ہو گا گناہ اور جرم نہیں۔

(ج) وان موالی ثعلبه کانفسھم

(ج) قبیلہ ثعلبہ کے موالی (حلیف آزاد کردہ غلام) کی حیثیت، خود بنی ثعلبہ جیسی ہو گی۔

(د) وان بطانة[1] یہود کانفسھم

(د) یہود کے اہل وعیال ان کے خواص اور ماتحت خاندانوں اور افراد کی حیثیت خود یہود جیسی ہو گی (ان کے وہی حقوق ہونگے جو یہود کے ہیں)۔

(ہ) وانه لایخرج منھم احد الا باذن محمد

(ہ) اور یہ کہ جو جس کے ماتحت یا جس کے ساتھ ہے وہ اس سے علیحدہ نہیں ہو گا مگر محمد ﷺ کی اجازت سے

(۲۵) وانه لاینحجز علی ثار جرح

اور یہ کہ نہیں بندش لگائے گا کوئی زخم کے قصاص (زخم کے بدلے میں زخم) پر[2]۔

(۲۶) وانه من فتك فبنفسه واهل بیته الا من ظلم وان الله علی ابر ھذا

”جو کسی کو بے خبری میں دھوکہ سے مار دے اس کی ذمہ داری خود اس پر ہے، اور اس کے اہل بیت پر، مگر وہ شخص جس نے ظلم کیا ہو اور ہم اللہ کو حاضر ناظر جان کر عہد کرتے ہیں کہ خوبی اور پوری ذمہ داری کے ساتھ ان شرائط پر عمل کریں گے۔“

(۲۷) وان علی الیھود نفقتھم وعلی المسلمین نفقتھم

”اور یہ کہ یہود اپنے مصارف کے ذمہ دار ہوں گے اور مسلمان اپنے مصارف کے۔ (جو اس عہدنامے کی شرطوں کو پورا کرتے ہیں، کرنے پڑیں گے۔“

(۲۸) وان بینھم النصر علی من حارب اھل ھذہ الصحیفة

”اور یہ کہ جو فریق اس معاہدہ میں شریک ہیں وہ آپس میں ایک دوسرے کی مدد کریں گے ان کے

---

[1] بطانة الرجل اهله وخاصته وصاحبه (قاموس)

[2] ا۔ جب کہ توریت کا حکم تھا کہ زخم کے بدلہ میں اسی جیسا زخم، اس اصول کو ختم نہیں کیا جائے گا۔

مقابلہ میں جو ان معاہدہ کرنے والوں سے جنگ کرینگے۔"

(۲۹) وان بینهم النصح والنصیحة والبردون الاثم وانه لایاثم امرء بحلیفه و ان النصر للمظلوم۔

"اور یہ کہ اس معاہدہ کے تمام فریق آپس میں ایک دوسرے کی خیر خواہی کرینگے، ایک دوسرے کو اچھی باتوں کی ہدایت کرینگے، نیک کردار رہیں گے جرم اور گناہ نہیں کرینگے۔ اور یہ کہ کوئی شخص اپنے حلیف کے ساتھ مجرمانہ فعل نہیں کریگا۔ اور یہ کہ مظلوم مستحق۔ مدد ہوگا۔"

(۳۰) وان الیهود ینفقون مع المومنین ماداموا المحاربین

"اور یہ کہ جب تک کوئی جنگ ہو گی تو مسلمانوں کے ساتھ یہود بھی خرچہ جنگ برداشت کرینگے۔"

(۳۱) وان یثرب حرام جرفها لاهل هذه الصحیفة

"اور یہ کہ وہ پورا علاقہ جو حدود یثرب میں ہے ان سب کے لئے واجب الاحترام (محفوظ علاقہ) ہو گا جو اس عہد نامہ میں شریک ہیں۔"

(۳۲) وان الجار کالنفس غیر مضار ولا اثم

"اور یہ کہ پڑوسی کو خود اپنی جان کی برابر سمجھا جائے گا، نہ اس کو نقصان پہنچایا جائیگا نہ اس کے ساتھ کوئی مجرمانہ فعل کیا جائے گا۔"

(۳۳) وانه لاتجار حرمة الا باذن اهلها

"اور یہ کہ نہیں حفاظت اور پناہ میں لیا جائے گا کسی خاتون کو مگر اس کے اہل (ذمہ دار) کی اجازت سے"[1]

(۳۴) وانه ماکان بین اهل هذه الصحیفة من حدث او اشتجار یخاف فساده فان مرده الی الله والی محمد رسول الله ﷺ وان الله علی اتقی مافی هذه الصحیفة وابره

"اور یہ کہ اس عہد نامہ کے فریقوں کے درمیان جو کوئی نئی بات پیش آئے یا کوئی نزاع ہو جس سے فساد کا خطرہ ہو تو اس میں اللہ اور محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف رجوع کیا جائے گا اور یہ کہ ہم سب اللہ کو حاضر و ناظر جان کر عہد کرتے ہیں کہ جو کچھ اس عہد نامہ میں ہے اسکی پوری پابندی کرینگے اور اس کو نیکی اور بھلائی کے ساتھ پورا کرینگے۔"

(۳۵) وانه لاتجار قریش ولا من نصرها

"اور یہ کہ نہ قریش کو پناہ دی جائے گی نہ اس کو جو قریش کی مدد کرے۔"

(۳۶) وان بینهم النصر علی من دهم[2] یثرب

---

[1] مکہ کے مشرکین قریش اس معاہدہ میں داخل نہ تھے۔ لہذا جب صلح حدیبیہ کے بعد ان کی عورتیں مسلمان ہو کر مدینہ منورہ پہنچیں تو ان کو پناہ میں لے لیا گیا۔

[2] دھمک غشیک (القاموس)

"اور یہ کہ اس عہدنامہ کے تمام شریک ایک دوسرے کی مدد کریں گے، اس کے مقابلہ میں جو یثرب پر چڑھ آئے (حملہ کرے)"

(۳۷) وانہ اذادعوالی صلح یصالحونہ ویلبسونہ فانہم یصالحونہ ، ویلبسونہ، وانہم اذا دعوالی مثل ذلک فانہ لہم علی المومنین الامن محارب فی الدین

"اور یہ کہ اس عہدنامہ کے جملہ فریق جب (مسلمانوں کی طرف سے) ان کو کسی کے ساتھ صلح کرنے کی دعوت دی جائے گی وہ صلح کرینگے اور صلح پر عمل کرینگے اور یہ کہ جب مسلمانوں کو اسی جیسی صلح کی دعوت دی جائے تو وہ بھی صلح کرینگے۔ مسلمانوں پر یہ انکا حق ہو گا مگر یہ کہ کسی سے دین کے بارے میں جنگ ہو رہی ہو (مذہبی جنگ ہو)

(۳۸) علی کل اناس حصتہم من جانبہم الذی قبلہم

اور یہ کہ ہر فریق پر اس حصہ کی ذمہ داری ہے جو اس کی جانب میں ہے۔

وان یہودالاوس موالیہم وانفسہم علیٰ مثل مالاھل ھذہ الصیحفتہ مع البر المحض من اھل ھذہ الصحیفۃ وان البردون الاثم لایکسب کاسب الاعلی نفسہ وان اللہ علی اصدق ما فی ھذہ الصحیفۃ وابرہ۔

اور یہ کہ قبیلہ اوس کے یہود ان کے موالی (حلیف یا آزاد کردہ غلام) ان کو وہی حقوق ہونگے جو اس عہدنامہ کے تمام فریقوں کو ہونگے، پوری نیک کرداری اور مخلصانہ بھلائی کے ساتھ۔ نیک کرداری ہی ہمارا اصل اصول ہو گا۔ مجرمانہ فعل (سے کوئی تعلق نہیں ہو گا) ہر ایک عمل کرنے والا اپنے عمل کا ذمہ دار ہو گا (اس کے فعل کو کسی دوسرے پر نہیں ڈالا جاسکے گا) اور اللہ تعالیٰ کو ہم حاضر وناظر جان کر یہ عہد کرتے ہیں کہ جو کچھ اس دستاویز میں لکھا گیا ہے اس پر پوری سچائی سے اور نیک کرداری کے ساتھ عمل کرینگے۔

(۴۰) وانہ لایحول ھذا الکتاب دون ظالم واثم وانہ من خرج امن ومن قعد امن بالمدینۃ الامن ظلم واثم وان اللہ جار لمن بروالتقیٰ ومحمد رسول اللہ ﷺ

اور یہ کہ یہ تحریر کسی ظالم اور مجرم کیلئے آڑ نہیں بنے گی۔ جو مدینہ سے باہر ہو وہ بھی امن میں اور جو اندر رہے وہ بھی امن میں رہے گا۔ مگر یہ کہ وہ ظلم کرے یا مجرمانہ حرکت کرے۔ اللہ تعالیٰ اس کا محافظ ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ اس کے محافظ ہیں جو نیک کردار رہ کر پوری پابندی کے ساتھ اس پر عمل کرے۔

تحویل قبلہ، انقلاب عظیم

سب سے افضل امت۔ سب سے افضل قبلہ

جھنڈا قوم بناتی ہے۔ کسی قوم کی قومیت جھنڈے سے نہیں بنتی۔ البتہ جھنڈا نشان قومیت بن جاتا ہے۔ جھنڈے کے رنگ یا وضع قطع کا کوئی فطری تعلق قوم کی فطرت سے نہیں ہوتا۔ البتہ کچھ روایات کا لحاظ وضع اور رنگ کے انتخاب کے وقت رکھا جاتا ہے۔ پھر وہ جھنڈا خود پیکر روایات اور نشان عظمت بن جاتا ہے۔ اس کی سربلندی یا سرنگونی قسمت۔ قوم کا فیصلہ سمجھی جانے لگتی ہے۔

تقریباً یہی شان عبادت اور عبادت کرنے کے رخ قبلہ کی ہے۔ عبادت یعنی بندگی، نیاز مندی، عاجزی اور فروتنی کا تعلق، اندرونی احساس اور قلب و ضمیر سے ہے۔ نہ پورب [1] سے ہے نہ پچھم سے۔ نیکی [2] اور بھلائی شرافت، حسن اخلاق اور خوبی کردار کا نام ہے۔ نیکی یہ نہیں ہے کہ مشرق کی طرف منہ کرلیں یا مغرب کی طرف مگر یہ ایک عبادت گذار (حتیٰ کہ وہ بھی جو مانتا ہے) کہ جس کی وہ عبادت کر رہا ہے وہ کسی ایک رخ یا کسی ایک جگہ میں نہیں ہے وہ لامکان و لازمان ہے۔ ہر جگہ ہے، اور ہر طرف ہے۔ عبادت کے لئے ایک رخ مقرر کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ کیونکہ جس طرح عمل کی پابندی کے لئے وقت کا مقرر کرنا ضروری ہے ایسے ہی دل کے جماؤ اور توجہ کے ٹھہراؤ کیلئے بھی رخ کا مقرر کرنا ضروری ہے اور

---

[1] ارشاد خداوندی ہے وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ الآیتہ اللہ ہی کا ہے پورب اور اللہ ہی کا پچھم۔ جس طرف بھی رخ کرلو وہاں اللہ ہے۔ (سورہ بقرہ ۔۱۱۵)

[2] لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ (الآیتہ) یعنی نیکی اور بھلائی یہ نہیں کہ تم اپنے چہرے پھیر لو، پورب کی طرف یا پچھم کی طرف۔ ہاں نیکی اور بھلائی اور حسن کردار اس کا ہے جو ایمان لایا اللہ پر اور قیامت کے دن پر، فرشتوں پر، کتاب (وحی الٰہی) پر اور نبیوں پر، پھر اس ایمان کے تقاضے کو پورا کیا کہ جب کہ مال کی ضرورت تھی کہ وہ تندرست تھا، دنیاوی زندگی کا میدان اس کے سامنے تھا، اس نے اپنی ضرورت کو پس پشت ڈال کر دیا، مال رشتہ داروں کو، یتیموں کو، مسکینوں کو اور مسافر کو اور سائلین کو اور گردنوں کے (چھڑانے) میں۔ اور برپا کیا نماز کو (پوری شان کے ساتھ نماز باجماعت ادا کی) زکوٰۃ ادا کی اور وہ جو پورا کریں عہد جب عہد کرلیں اور جو صبر کرنے والے ہیں سختی اور شدت میں اور خوف وہراس کے وقت (آیت ۱۷۷ سورہ بقرہ)

افراد قوم میں یکجہتی بھی اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب سب کی عبادت ایک ہی طرف ہی رخ پر ہو۔ ❶

مکہ کے مشرک اگرچہ سر نیاز بتوں کے سامنے خم کرتے تھے۔ مگر ان کے تحت الشعور میں یہ تھا کہ ان کا قبلہ "کعبہ" ہے جس کی بنیاد حضرت آدم علیہ السلام نے رکھی تھی۔ جس کی تجدید حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے فرزند رشید حضرت اسماعیل علیہ السلام نے کی، جو ہمارے مذہبی پیشوا بھی ہیں اور خاندانی مورث اعلیٰ بھی ۔

اہل شرک اور بت پرستوں کے بالمقابل اہل کتاب (یہودی اور نصرانی) تھے جن کا قبلہ بیت المقدس یا بیت اللحم تھا۔ سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم عبادت کے لئے اٹھے تو اگرچہ کعبہ کو آپ نے نظر انداز نہیں فرمایا۔ مگر آپ نے قبلہ اس کو بنایا جو تقریباً ڈھائی ہزار سال سے انبیاء علیہم السلام کا قبلہ چلا آرہا تھا۔ حرم کعبہ میں آپ نماز پڑھتے تو کعبہ کے سامنے کھڑے ہو کر رخ شمال کی طرف کرتے تھے یعنی وہ قبلہ بھی آپ کے سامنے رہتا تھا۔ جو آل اسماعیل علیہ السلام کا قبلہ تھا اور وہ قبلہ بھی سامنے ہوتا جو بنی اسرائیل کا قبلہ تھا۔ لیکن جب آپ مدینہ منورہ تشریف لے آئے تو یہاں یہ اجتماع قبلتین ممکن نہیں تھا، کیونکہ مکہ یہاں سے جنوب میں تھا اور بیت المقدس شمال میں، لامحالہ آپ نے انبیاء علیہم السلام کے ڈھائی ہزار سالہ قبلہ ہی کو اختیار فرمایا۔ چنانچہ مسجد کی تعمیر کی تو اسی دیوار کو دیوار قبلہ قرار دیا جو بیت المقدس کی جانب تھی (شمالی دیوار)، لیکن سوال یہ تھا کہ اس دین کیلئے جو حق وباطل کے لئے فرقان عظیم ہے خالص اور نکھری ہوئی توحید جس کی بنیاد ہے، جس کی تعلیم میں یہ قوت ہے کہ کبھی اس کے منسوخ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آسکتی جو ابدالآباد تک باقی رہنے والا کامل و مکمل دین ہے اس کا قبلہ بھی بیت المقدس رہے جو اہل شرک کا قبلہ تو بیشک نہیں ہے۔ مگر جو اس سے وابستہ ہیں وہ خود اتحاد اور یک جہتی سے محروم دو ٹکڑوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ یہودی اور عیسائی ہر ایک ٹکڑی دوسرے کی تردید کر رہی ہے اور جہاں تک اخلاق و کردار کا تعلق ہے تو اخلاق و کردار میں اہل شرک کے ہمدوش ہیں، بلکہ کچھ آگے بڑھے ہوئے ہیں کہ قتل انبیاء کے دھبے بھی ان کے دامن پر نمایاں ہیں۔ اور اگر قبلہ بدلا جاتا تو قبلہ کا مسئلہ صرف ایک رخ کا مسئلہ نہیں بلکہ ایک مرکز کا مسئلہ بھی ہے۔ حضرت یعقوب (اسرائیل) علیہ السلام کے زمانہ سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور تک حق پرستی، توحید، دعوت الی اللہ، ہدایت وارشاد یعنی مذہبی اور روحانی رہنمائی کا فریضہ بنو اسرائیل کے سپرد رہا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے بیشمار انعامات ان پر ہوتے رہے۔ بنو اسرائیل کا دینی مرکز بیت المقدس تھا۔ اب سوال یہ بھی تھا کہ دعوت وارشاد کی مرکزیت، جس کو اصطلاحاً امامت، اور خلافت الٰہیہ کہا جاتا ہے کیا اسی قوم کے سپرد رہے گی یا اس میں تبدیلی ہوگی۔ اگر تبدیلی ہوگی تو کیوں اور تبدیلی کے بعد جس قوم کو یہ

---

❶ تفسیر فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ عرف تفسیر کبیر

امامت سپرد ہوگی تو کیا اس کا قبلہ بھی یہی رہے گا یا اس کو بھی بدلا جائے گا۔ اور اگر بدلا جائے گا تو کیوں؟

ان سوالات کے جوابات عقل و قیاس یا جذبات کی منطق سے نہیں دیئے جاسکتے تھے۔ کیونکہ کسی فرد یا قوم کو امامت نوع انسان کا درجہ خدا ہی کی طرف سے سپرد ہوتا ہے اور یہ کہ خدا پرست پرستش کے وقت اپنا رخ کس طرف کریں۔ یہ بھی وہی بتاسکتا ہے جس کی خوشنودی کے لئے پرستش کی جاتی ہے۔ لیکن ایک سربراہ کو انقلاب کے موقع پر جب مختلف سوالات (اور خصوصاً جب ایسے سوالات در پیش ہوں جن کا تعلق خود انقلاب اور مقصد انقلاب سے ہو) جو تردد اور تشویش ہو سکتی ہے، اس سے کہیں زیادہ تردد اس ہادی اعظم کو در پیش تھا جو اس لئے دنیا میں آیا تھا کہ طالبان حق کو ہدایت وارشاد کی آخری منزل طے کرائے اور ان کے لئے ایسا راستہ معین کردے کہ زمانہ کی کوئی بھی گردش اس میں کجی یا ناہمواری پیدا نہ کرسکے۔ اس لئے وہ بار بار اس سمت کی طرف نظر اٹھاتا جس سمت سے عقدہ کشائی کی توقع تھی۔ ہادئ برحق کے تردد کا عکس ان ❶ پر بھی پڑ رہا تھا جو اس کے لئے اس لئے وابستہ ہوئے تھے کہ ذہنی تشویش و تردد کو اطمینان سے بدلیں اور وہ نور حاصل کریں جو نہ صرف دنیا کی تاریکیوں میں بلکہ ظلمات محشر میں بھی ان کے لئے شمع راہ ہو۔

اشارے:

چند سال پہلے محمد رسول اللہ ﷺ کو وہ شرف اعظم حاصل ہو چکا تھا جو نہ صرف نوع انسان بلکہ حق یہ ہے کہ پوری کائنات میں نہ آج تک کسی کو میسر آیا تھا نہ آئندہ آنے والا تھا۔ یعنی آپ شب معراج میں اس بلند ترین مقام تک پہنچ چکے تھے جہاں تک نہ کسی نبی مرسل کی رسائی ہوئی تھی نہ کسی ملک مقرب کی۔ جبرئیل امین علیہ السلام اس سے بہت نیچے درماندہ رہ کر یہ معذرت کر چکے تھے۔

اگر یک سر موئے بالا پرم   فروغ تجلی بسوزد پرم

اس عروج و سیر میں آپ نے بیت معمور ملاحظہ فرمایا تھا جس کے گرد ہر روز ستر ہزار فرشتے مصروف طواف ہوتے ہیں۔ ❷ وہیں بانی ملت حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات ہوئی تھی کہ آپ بیت معمور سے تکیہ لگائے بیٹھے ہیں۔ ❸ اسی سیاحت قدسی میں پانچ نمازیں فرض ہوئیں پھر عرش معلیٰ کی اسی سیاحت سے واپسی میں یہ ہوا تھا کہ جب بیت المقدس میں نزول اجلال ہوا تو تمام انبیاء اور مرسلین صف

---

❶ صحابہ کرام کے تردد اور انتظار و اشتیاق کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ تبدیلی قبلہ کی خبر جس کو پہنچی اور جس حالت میں پہنچی فوراً عمل شروع کر دیا۔ جو صحابہ نماز پڑھ رہے تھے انہوں نے نماز میں خبر سنی تو فوراً نماز ہی میں اپنا رخ بلکہ امام سمیت پوری جماعت کا رخ شمال سے جنوب کو یعنی بیت المقدس کی جانب سے کعبہ کی سمت کو کر لیا۔ (بخاری شریف وغیرہ

❷ جن کا دوبارہ کبھی نمبر نہیں آتا (بخاری و مسلم حدیث معراج)

❸ مسلم شریف۔

آراستہ ہوئے اور امامت کے لئے اسی سید الثقلین علیہ الصلوٰۃ والسلام کو آگے بڑھایا گیا۔ ❶

پنج وقتہ نمازوں کا قبلہ یہ بیت المقدس ہو۔ جہاں مسجد اقصیٰ ہے جو ایک گذر گاہ ہے عرش بریں پر جانے والے کا۔ یا وہ کعبہ ہو جو نقطہ محاذات ہے۔ ❷ اس بیت معمور کا جس کا طواف ملائک کے جھمگٹ ہر وقت کرتے رہتے ہیں جو تکیہ گاہ ہے ابراہیم خلیل اللہ کا (علیہ وعلیٰ نبینا الصلوٰۃ والسلام) اس طرح کے مشاہدات اشارہ کر رہے تھے کہ امام الانبیاء اور اس کی امت خیر الامم کا قبلہ خانہ کعبہ ہونا چاہئے۔ مگر جہاں نص صریح اور قطعی فیصلہ کی ضرورت ہو وہاں اشاروں کو کافی نہیں سمجھا جاسکتا۔ البتہ یہ اشارے قطعی فیصلہ اور امر واضح کی توقع ضرور دلاسکتے تھے اور یہ توقع اشتیاق اور یہ اشتیاق اضطراب بن سکتا تھا اگر انتظار طویل ہوتا۔

یہی اشتیاق واضطراب وانتظار تھا جس کی وجہ سے آپ بار بار اس سمت کو نظر اٹھاتے تھے، جہاں سے مراد پوری ہونے کی توقع تھی۔ بالآخر انتظار ختم ہوا۔ جب ہجرت سے سوا سال بعد فرمان خداوندی نازل ہوا:

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا ۠ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ (البقرہ ۱۴۴)

"ہم دیکھ رہے ہیں کہ (حکم الٰہی کے شوق و طلب میں) تمہارا چہرہ بار بار آسمان کی طرف اٹھ رہا ہے تو یقین کرو ہم عنقریب تمہارا رخ ایک ایسے قبلہ کی طرف پھیر دینے والے ہیں جو تم چاہتے ہو اور اب کہ اس معاملہ کے ظہور کا وقت آگیا ہے تو چاہئے کہ تم اپنا رخ مسجد حرام (خانہ کعبہ) کی طرف پھیر لو۔ اور جہاں کہیں بھی تم ہو (نماز کے وقت) اسی طرف رخ پھیر لو" (آیت ۱۴۴)

وجوہات:

رب المشرقین والمغربین، خالق السمٰوٰت والارض، رب العرش الکریم کے کسی حکم کے متعلق وجہ دریافت کرنا بے ادبی ہے لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ (الانبیاء۔۲۳) (وہ جو کچھ کرتا ہے اس پر اس سے باز پرس نہیں کی جاسکتی) اور جبکہ مشرق و مغرب اسی کا ہے اور ہر جگہ اور ہر سمت میں اس کا جلوہ یکساں ہے تو بلاشبہ اس کو اختیار ہے کہ قبلہ کے لئے جو سمت چاہے مقرر کر دے۔ چون وچرا کی گنجائش کہاں ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ حکم جس کے پانچ کلمے ہیں فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (البقرہ۔۱۴۴) ایک انقلاب انگیز فیصلہ بھی ہے جو وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ (آل عمران۔۲۶) کی پوری شان اپنے اندر رکھتا ہے۔

---

❶ البدایہ والنہایہ ص ۱۱۳ ج ۳۔

❷ طبری و مسند اسحاق۔ فتح الباری ص ۲۳۵ ج ۲۔

کیونکہ اس کے معنٰی یہ ہیں کہ امامت عظمٰی اور خلافت اِلٰہِیّہ کا منصب جس پر تقریباً ڈھائی ہزار سال سے بنو اسرائیل فائز تھے اب وہ ان سے چھن کر بنو اسماعیل کے سپرد کیا جارہا ہے۔ وہی احکم الحاکمین جس کی بارگاہ عظمت تک کسی باز پرس کی رسائی نہیں ہوسکتی تھی اپنی شان یہ بیان فرماتا ہے کہ ذرہ برابر بھی ظلم اس سے صادر نہیں ہوتا۔ ❶

ناممکن اور محال ہے کہ جو رب ہے پالنے پوسنے والا ہے۔ وہ اپنے ہی پیدا کئے ہوئے بندوں پر کوئی ظلم کرے۔ ❷

بلاشبہ اس کی شان یہ ہے کہ تُعِزُّ مَنۡ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنۡ تَشَآءُ (جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلت دے) مگر اس مطلق العنان قدرت کے باوجود اس نے قوموں اور امتوں کی ذلت و عظمت کے لئے ضابطے مقرر کردیئے ہیں۔

(الف) جس قوم کو جو نعمت وہ عطا فرمادیتا ہے وہ اس میں انقلاب اور تبدیلی نہیں کرتا جب تک وہ قوم خود اپنے اندر تبدیلی نہ کرے۔ (آیت ۵۳ سورہ الانفال) (اور اپنی عظمت آفرین خصوصیات کو ختم نہ کردے۔) عروج کے بعد زوال اس ضابطہ کے بموجب ہوتا ہے اور ترقی کے لئے ضابطہ یہ ہے۔

(ب) جو حالت کسی قوم کی ہوتی ہے وہ قادر ذوالجلال اس میں تبدیلی نہیں کرتا جب تک وہ خود اپنے اندر تبدیلی نہ کرے۔ (آیت ۱۰ سورہ ۱۳ رعد)

بہرحال رب ذوالجلال نے اپنی شان اور اپنے ہی منظور فرمودہ ضابطہ کا یہ احترام فرمایا ہے کہ اس انقلاب آفریں حکم کی وجوہات بیان فرمائیں اور اس تفصیل سے بیان فرمائیں کہ شاید کسی اور حکم کی وجوہات اس تفصیل سے بیان نہیں فرمائیں۔

آپ قرآن مجید کی تلاوت شروع کیجئے سب سے پہلے آپ سورہ فاتحہ پڑھیں گے جو نرالے رنگ کی حمد و ثناء ہے جس میں بندوں کو نہایت جامع دعا کی تلقین بھی ہے اور عبرت آموز سبق بھی۔ پھر وہ سورت شروع ہوتی ہے جو قرآن پاک کی سب سے بڑی سورت ہے۔

اس میں مقصد قرآن حکیم کی وضاحت کے بعد ان تین جماعتوں کا ذکر اور ان کے کردار کا بیان ہے جو کسی بھی تحریک کے برپا ہونے پر ظہور پذیر ہو جاتی ہیں یعنی (۱) ماننے والے (۲) کھلے ہوئے مخالف اور منکر (۳) وہ اغراض پرست بزدل جن کے دلوں میں انکار بھرا ہوتا ہے اور ظاہر یہ کرتے ہیں کہ وہ موافق اور فرماں بردار ہیں۔ اس کے بعد عبادت رب کی ہدایت ہے اور اس رسول کا ذکر ہے جو طریقہ عبادت کی تعلیم دے رہا ہے جس کی تصدیق کے لئے وہ معجزہ پیش کیا گیا ہے جس کا نام قرآن ہے۔ پھر نوع انسان کی

---

❶ آیت ۴۰ سورہ ۴ النساء

❷ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِيۡدِ (حٰم سجدہ آیت ۴۶)

حیثیت بیان فرمائی گئی ہے کہ اس کو زمین پر اللہ تعالیٰ کی خلافت عطا ہوئی، اس کی شان ملائک سے بھی بلند ہے۔ اب خلافت اور امامت کا ذکر شروع ہوا تو بنو اسرائیل کو یاد دلایا گیا ہے کہ یہ نعمت عظمیٰ ان کو عطا ہوئی تھی۔

یہ سورہ بقرہ کی آیت ۴۰ ہے یہاں سے سورہ بقرہ کا پانچواں رکوع شروع ہوتا ہے۔ اس آیت سے لیکر آیت ۱۲۳ تک جو پندرھویں رکوع کے شروع میں ہے، بنو اسرائیل ❶ کا تذکرہ ہے۔ ان آیات میں ایک طرف اللہ تعالیٰ کے انعامات شمار کرائے گئے ہیں جو بنو اسرائیل کو وقتاً فوقتاً عطا ہوتے رہے۔ دوسری جانب اس کا تذکرہ ہے کہ باری تعالیٰ کے ان انعامات کو بنو اسرائیل نے کس طرح (معاذ اللہ) پامال کیا۔ اور کس طرح ان کی دھجیاں بکھیریں۔ ان تمام جرائم کی تفصیل تو بہت طویل ہے یہاں صرف ان جرائم کے عنوان پیش کئے جارہے ہیں جو اپنے اندر خاص اہمیت رکھتے ہیں جو ان تراسی آیتوں میں شمار کرائے گئے ہیں۔

۱۔ اللہ سے جو عہد ❷ کیا تھا۔ اس کو توڑ ڈالا۔ اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈالدیا (آیت ۱۰۰،۱۰۱)
۲۔ حیلہ بازی اور ٹال مٹول (آیت ۶۵ تا ۶۶)
۳۔ قبول حق سے گریز اور اس پر فخر (آیت ۸۷ تا ۹۳)
۴۔ سنگ دلی (آیت ۷۴ و ۸۸)
۵۔ کج بحثی (آیت ۶۸ و ۶۹)
۶۔ نسلی حسد (آیت ۸۹ و ۹۰ و ۱۰۹)
۷۔ پوری ڈھٹائی سے حقوق اللہ اور حقوق العباد کو پامال کرنا (آیت ۸۴ و ۸۵)
۸۔ داعیان حق سے عناد (آیت ۸۷) ان کا مذاق بنانا (آیت ۱۰۴)
۹۔ احکام خداوندی کو فروخت کرنا (آیت ۴۱ و ۷۹)
۱۰۔ عقائد میں تحریف ❸ (آیت ۸۰ و ۱۱۱)
۱۱۔ احکام خداوندی میں تحریف ❹ (آیت ۷۵)
۱۲۔ موت سے گریز، دنیاوی زندگی کی شدت حرص (آیت ۹۶)

---

❶ یعنی تراسی آیتوں میں جو دس رکوع ہیں پھیلی ہوئی ہیں۔

❷ طاعت الٰہی اور ایمان بانبیاء کا عہد۔ توریت میں بھی اس عہد کا ذکر جابجا ہے، مثلاً تو نے آج کے دن اقرار کیا ہے کہ خداوند میرا خدا ہے۔ اور میں اس کی راہوں پر چلوں گا اور اس کے شرعون اور اس کے حقوق اور اس کے حکموں کی محافظت کروں گا اور اس کی آواز کا شنوا ہوں گا۔ فقرہ ۱۸ باب۔ ۲ (استثناء)

❸ تم نے زندہ خدا رب الافواج کی باتوں کو بگاڑ ڈالا ہے یرماہ، باب ۲۳ فقرہ ۳۷

❹ جو اپنی زبان استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ فرماتا ہے۔ یرماہ باب ۲۳ فقرہ ۳۱ و ۳۲

۱۳۔ گوسالہ پرستی (آیت ۹۲)
۱۴۔ خدا کے بیٹا ماننا[1] (آیت ۱۱۶)
۱۵۔ انبیاء علیہم السلام کو قتل کر ڈالنا (آیت ۶۱ و ۹۱)
۱۶۔ جادو اور کہانت (آیت ۱۰۲ و ۱۰۳)
۱۷۔ گروہ بندی اور گروہ بندی کے ساتھ جنت کی ٹھیکہ داری کہ یہود کہتے تھے کہ جب تک انسان یہودی گروہ بندی میں داخل نہ ہو نجات نہیں پاسکتا اور عیسائی کہتے تھے کہ جب تک عیسائی گروہ بندی میں داخل نہ ہو جنت میں نہیں جاسکتا۔ (آیت ۱۱۱)

قرآن پاک کی محولہ بالا آیتوں میں ان جرائم کو شمار کرایا گیا ہے۔ پھر ان کی مثالیں اور شواہد پیش کئے گئے ہیں۔

اب ایک قدرتی سوال ہے کہ جس قوم کا یہ کردار ہو چکا ہے کیا وہ اس کی اہل ہے کہ منصب امامت کی حامل رہے اور اس کے قبلہ کو نوع انسان اور دین کامل کا قبلہ قرار دیا جائے اور اس میں تبدیلی نہ کی جائے۔

کلام اللہ کی نظر میں تبدیلی صرف مناسب ہی نہیں ہے بلکہ اتنی ضروری ہے کہ اس پر اعتراض وہی کرسکتے ہیں جو فہم و بصیرت سے محروم اور مضحکہ انگیز نادانی (سفاہت) میں مبتلا ہوں۔ چنانچہ تبدیلی قبلہ کے حکم کی تمہید اس طرح فرمائی گئی ہے:

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا (البقرہ آیت ۱۴۲)

"جو لوگ عقل و بصیرت سے محروم ہیں وہ کہیں گے کس بات نے ان (مسلمانوں) کو ہٹا دیا اس قبلہ سے جس پر وہ اب تک تھے۔"

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے رب ابراہیم کا وعدہ اور بنو اسرائیل کی محرومی کا سبب:

سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت اور اسکی عظمت بنو اسرائیل میں بھی مسلم تھی اور بنو اسماعیل میں بھی۔ دونوں[2] ان کو اپنا مورث اعلیٰ مانتے تھے۔ قرآن حکیم یہود کے جرائم شمار کرانے کے بعد خاتمہ کلام پر پھر یاد دلاتا ہے کہ "اے بنی اسرائیل یاد کرو میری وہ نعمتیں جو میں نے تم کو بخشیں اور میں نے تم کو

---

[1] یہود اور نصاریٰ دونوں ہی نے خدا کا بیٹا مان لیا تھا۔ یہود نے حضرت عزیر کو اور عسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو۔

[2] برہمن جس برہما کی تعظیم کرتے ہیں کیا عجب ہے وہ ابرہم یا ابراہام ہی ہو۔ عربوں نے اگر ابراہام کا ابراہیم کرلیا ہے تو اتنی تبدیلی کا حق تو بھارت کے آریوں کو بھی ہونا چاہئے کہ وہ ابرہم کا برہم اور برہما کرلیں جیسے آرین کو آریہ کرلیا۔ واللہ اعلم بحقیقۃ حال

دنیا جہان والوں پر فضیلت دی"۔ (آیت ۱۲۲)

اس یاد دہانی کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اسم گرامی لیکر وہ بشارت یاد دلاتا ہے جو حضرت حق جل مجدہ کی طرف سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دی گئی تھی:

اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (سورہ بقرہ۔۱۱۴)

"میں تمہیں انسانوں کے لئے امام بنانے والا ہوں"

پھر یاد دلاتا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دریافت کیا کہ یہ شرف میری اولاد کو بھی میسر آئے گا، تو بتادیا گیا تھا:

لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ (آیت ۱۲۴)

"نہیں پہنچتا میرا اقرار نافرمانوں کو"

یعنی جو ظلم و معصیت کی راہ اختیار کریں ان کا میرے اس عہد میں کوئی حصہ نہیں ہے۔

اس صغریٰ اور کبریٰ کا نتیجہ یہ نکلا کہ بنو اسرائیل خود اس بشارت کے بموجب جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دی گئی تھی اس کے مستحق ہیں کہ ان کو منصب امامت سے معزول کر دیا جائے کیونکہ وہ ظالم ہیں اور ظالم بھی ایسے کہ ان جرائم کے مرتکب ہوئے ہیں جن کو گزشتہ ۸۳ آیتوں میں بیان کیا گیا ہے۔

اب مستحق شرف کون؟:

قرآن حکیم یاد دلاتا ہے کہ ایک "بیت" خانہ وہ ہے جس کو شروع ہی سے مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا (البقرہ۔۱۲۵) بنایا گیا ہے (تمام انسانوں کا مرجع اور مرکز۔ امن و حریت کا مقام)

اس بیت سے متعلق ہدایت کر دی گئی تھی: وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى (البقرہ۔۱۲۵) "ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کی جگہ بنالو۔"

اس بیت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمایا تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے فرزند ارجمند اسماعیل کو حکم دیا تھا: طَهِّرَا بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَالْعٰكِفِیْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ (البقرہ۔۱۲۵)

"تم دونوں میرے گھر کو پاک صاف رکھو طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لئے۔"

پھر فرقان حمید یاد دلاتا ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہ السلام جب اس بیت کی بنیادیں (جو حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ کی تھیں) بلند کر رہے تھے تو ان کے دلوں کی گہرائیوں سے ان کی زبانوں پر یہ دعا بھی جاری تھی:

"اے پروردگار! ہمارا یہ عمل تیرے حضور قبول ہو۔ بلاشبہ تو ہی ہے جو دعاؤں کا سننے والا اور

(مصالح عالم) کا جاننے والا ہے۔ اے پروردگار! (اپنے فضل و کرم سے) ہمیں ایسی توفیق دے کہ ہم سچے مسلم (تیرے احکام کے فرمانبردار) بن جائیں اور ہماری نسل سے بھی ایسی امت پیدا کر جو تیرے حکموں کی فرمانبردار ہو۔ خداوند ہمیں ہماری عبادت کے طور وطریق بتادے اور ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرما اور اپنی عنایت سے نواز، بلاشبہ تیری ذات ہے جس کے درگذر کرنے کی کوئی انتہا نہیں جو رحم کرنے والی ہے"۔ (آیت ۱۲۷ـ ۱۲۸)

اسی سلسلہ میں ان کی دعا یہ بھی تھی:

"اے ہمارے رب! (اپنے فضل و کرم سے) ایسا کیجیو کہ اس بستی کے بسنے والوں میں تیرا ایک رسول پیدا ہو جو انہیں میں سے ہو۔ وہ تیری آیتیں پڑھ کر لوگوں کو سنائے، کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور اپنی پیغمبرانہ تربیت سے ان کے دلوں کو مانجھ دے۔" (آیت ۱۲۹)

اس کے بعد کلام الٰہی تنبیہ کرتا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کا مسلک تھا:

(۱) توحید خالص، خداواحد کی پرستش، جس میں کسی طرح کے شرک کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ (آیت ۱۳۲)

(۲) سپردگی اور فرمانبرداری۔ یعنی اپنے آپ کو خدا کے حوالے کر دینا اور اس کے احکام کی پوری طرح تعمیل کرنا۔ (آیت ۱۳۱)

یہی توحید خالص اور تسلیم ورضا تھی جس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو امام الناس بنایا اور یہی نعمت بنو اسرائیل کو عطا ہوئی تھی جس کی وجہ سے ان کو عالمین دنیا جہان پر فضیلت بخشی گئی تھی۔

ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اسی مسلک کی وصیت اپنی اولاد کو کی تھی، ان کی اولاد اور اولاد کی اولاد میں جس قدر نبی آئے سب نے اسی مسلک کو مضبوطی سے اختیار کیا۔ یہ تمہاری دھڑے بندی جس کا نام یہودیت اور نصرانیت ہے ان سب انبیاء علیہم السلام کا دامن اس سے پاک رہا۔ (آیت ۱۴۰) تمہاری اسی دھڑے بندی کا نتیجہ ہے کہ کسی نبی کو مانتے ہو کسی کو نہیں مانا یہاں تک کہ قتل بھی کر دیا۔ اسی دھڑے بندی نے تم کو منصب امامت سے محروم کیا۔ درجہ افضلیت سے نیچے گرا کر ذلت و مسکنت کے گڑھے میں ڈالا۔ غضب الٰہی کو تمہاری گردنوں کا طوق بنادیا۔ آج سب سے افضل وہ ہے جو اس دھڑے بندی سے بالاو برتر ہو کر مسلک ابراہیمی کو مضبوطی سے سنبھالے۔ خداءواحد کا پرستار حقیقی بن کر اپنے آپ کو خدا کے حوالہ کردے۔

آج یہ شرف محمد ﷺ اور آپ کی امت کو حاصل ہے۔ لہذا وہی افضل الناس اور امت وسط ہے اور اسی افضلیت کی بناپر یہ فیصلہ بھی کیا جارہا ہے۔ اس کا قبلہ وہ ہو گا جس کی حرمت و عظمت عہد قدیم سے چلی آرہی ہے جس کے معمار ابراہیم اور اسماعیل علیہ السلام تھے۔

پس منظر پر آپ نظر ڈال چکے۔ اب ان آیتوں کا مضمون مطالعہ فرمایئے جن میں تحویل قبلہ کا حکم ہے جس کا یہ پس منظر تھا۔

ترجمہ: ”جو لوگ عقل و بصیرت سے محروم ہیں وہ کہیں گے مسلمان جس قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے، کیا بات ہوئی کہ ان کا رخ اس سے پھر گیا۔ (اے نبی) تم کہو پورب ہو یا پچھم سب اللہ ہی کے لئے ہے (وہ کسی خاص مقام یا جہت میں محدود نہیں) وہ جس کسی کو چاہتا ہے سیدھی راہ چلا دیتا ہے۔

”اور (اے مسلمانو! جس طرح یہ بات ہوئی کہ بیت المقدس کی جگہ خانہ کعبہ قبلہ قرار پایا) اسی طرح یہ بات بھی ہوئی کہ ہم نے تمہیں امتہ وسط (نیک ترین، عادل اور معتدل) امت بنا دیا تا کہ تم گواہ رہو لوگوں پر (یعنی ایک بہتر نمونہ اور معیار کہ نوع انسان کی ہر امت کو اسی سانچہ میں ڈھلنا اور اسی معیار پر اترنا چاہیئے) اور رسول گواہ رہیں تم پر (وہ تمہارے لئے نمونہ اور معیار ہیں کہ امت اسلامیہ کو اس معیار پر پورا ہونا اور اس سانچہ میں ڈھلنا چاہیئے)۔ اور ہم نے تمہیں اس قبلہ پر جس کی طرف تم رخ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے اسی لئے رکھا تھا کہ وقت پر معلوم ہو جائے کہ کون لوگ واقعی اللہ کے رسول کی پیروی کرتے ہیں اور کون الٹے پاؤں پھر جاتے ہیں۔[1] یہ حکم بہت گراں (اور سخت آزمائش کا حکم ہے)۔ مگر ان لوگوں کو نہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے راہ دکھا دی ہے (اور وہ اطاعت رسول کے ذوق سلیم سے بہرہ ور ہیں) اللہ ایسا نہیں کہ ضائع ہو جانے دے تمہارے ایمان کو (کہ جو نماز میں بتقاضاء ایمان باللہ و ایمان بالرسول، بیت المقدس کی طرف رخ کر کے پڑھیں ان کو بیکار قرار دے)۔ بیشک اللہ تعالیٰ لوگوں پر بڑا شفیق ہے (خصوصاً ان پر جنہوں نے اللہ اور رسول کے حکم کی تعمیل میں کوئی کام کیا۔ اور تبدیلی قبلہ کے متعلق اس کا یہ حکم بھی سراسر شفقت ہی ہے)۔

”(اے پیغمبر!) ہم دیکھ رہے ہیں کہ حکم الٰہی کے شوق و طلب میں تمہارا چہرہ بار بار آسمان کی طرف اٹھ اٹھ جاتا ہے، تو یقین کرو ہم آپ کا رخ اسی قبلہ کی طرف پھیر دیں گے جس کو آپ چاہتے ہیں (اچھا) اب کر لیجئے اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف اور تم لوگ (آپ اور آپ کے ساتھی) جہاں بھی ہو اپنے چہرے پھیر لیا کرو اسی طرف، اور جن لوگوں کو کتاب مل چکی ہے (یہود اور نصاریٰ) وہ یقیناً جانتے ہیں کہ یہ معاملہ ان کے پروردگار کی طرف سے ایک امر حق ہے (کیونکہ ان کے مقدس نوشتوں میں اس کی پیشن گوئی موجود ہے)۔ اور اللہ بے خبر نہیں ہے ان کی کارروائیوں سے۔ اور اگر تم اہل کتاب کے سامنے دنیا جہان کی ساری دلیلیں بھی پیش کر دو جب بھی وہ تمہارے قبلہ کی پیروی کرنے والے نہیں ہیں، نہ یہ ہو سکتا ہے کہ (علم و بصیرت کی پوری روشنی حاصل ہونے کے بعد) تم ان کے قبلہ کی پیروی کرنے لگو اور نہ وہ آپس میں

---

[1] یعنی سپردگی اور حکم خدا کی تعمیل کے لئے سرتاسر اطاعت بن جانا جو ملت ابراہیم کی خصوصیت ہے کس میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے، کس میں نہیں پائی جاتی (واللہ اعلم)

ایک دوسرے کے قبلہ کو ماننے والے ہیں۔ (یہود کا قبلہ ہیکل بیت المقدس ہے اور نصاریٰ کسی عمارت یا مکان کو نہیں بلکہ سمت مشرق کو قبلہ بنائے ہوئے ہیں (ابن جریر وغیرہ)

(اور دیکھو) اگر تم نے ان لوگوں کی خواہشوں کی پیروی کی باوجود یکہ تمہیں اس بارے میں علم حاصل ہو چکا ہے (قبلہ کے متعلق وحی نازل ہو چکی ہے) تو تم بھی ان میں آجاؤ گے جو (نافرمانی کر کے اپنے اوپر) ظلم کرتے ہیں اور جن لوگوں کو ہم کتاب دے چکے ہیں وہ آپ [1] کو ایسا ہی پہچانتے ہیں جیسے اپنی اولاد کو جانتے پہچانتے ہیں لیکن اس پر ایک گروہ ان میں ایسا ہے جو جان بوجھ کر سچائی کو چھپاتا ہے (تحویل قبلہ کا یہ معاملہ) تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک امر حق ہے، پر ہرگز ہرگز ایسا نہ ہو کہ تم شک کرنے والوں میں سے ہو جاؤ۔"

---

[1] آنحضرت ﷺ کو۔

نکاح السیدہ فاطمۃ الزہراء (رضی اللہ عنہا)

ارشاد خداوندی ہے:

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ ۭ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿٣٢﴾

"نکاح کر دو ان کا جو تم میں بے نکاح ہوں اور اپنے غلاموں اور باندیوں کا بھی جو اس قابل ہوں اگر مفلس ہوں گے تو خداتعالیٰ ان کو اپنے فضل سے غنی کر دے گا۔ اور اللہ تعالیٰ وسعت والا ہے خوب جاننے والا۔" (سورہ النور ۳۲)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خاص طور سے ہدایت فرمائی:

"علی! تین کام ہیں ان میں تاخیر ہرگز نہ کرنا۔(۱) نماز جب اس کا وقت ہو جائے' (۲) جنازہ جب آجائے، (۳) بے نکاح جب اس کا کفو مل جائے [1]۔"

ہمارا طریقہ یہ ہے کہ ہم پہلے "غنا" چاہتے ہیں، پھر نکاح مگر فرمان خداوندی نے نکاح کو مقدم رکھا اور غنا کا خود وعدہ فرمایا۔

اس کی عجیب و غریب مثال حضرت علی اور سیدہ فاطمہ الزہرا رضی اللہ عنہا کا نکاح ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے والد خواجہ ابو طالب کی وفات کے وقت اگرچہ جوان تھے، تقریباً بیس سال کی عمر تھی، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بچپن ہی سے اپنی تربیت میں لے لیا تھا اور خواجہ ابو طالب کو ان کی طرف سے بے فکر کر دیا تھا۔

ابو طالب دولت مند نہیں تھے کہ ان کے وارث ان کے ترکہ سے دولت مند ہو جائے۔ اس کے علاوہ ہجرت کرنے والے بزرگ وہ تھے کہ دولت مند [2] بھی فقیر ہو گئے تھے۔ لہٰذا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس بھی جو

---

[1] ترمذی شریف باب ماجاء فی الوقت الاول من الفضل ص ۲۴

[2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ میں بھی مواخات (بھائی چارہ) قائم فرمایا تھا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ شرف حاصل ہوا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنے ساتھ شامل کیا اور اخ قرار دیا۔ مدینہ منورہ میں جو مہاجرین اور انصار کرام میں مواخات رشتہ

تھا وہ توکل کا سرمایہ تھا اور بس۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی عمر پندرہ سال کے قریب ہوئی تو رشتے آنے شروع ہو گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی مشورہ دیا گیا کہ وہ بھی خواستگاری پیش کر دیں۔ مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو احساس تھا کہ ان کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ یہی آپ نے مشورہ دینے والوں سے بھی کہا۔ مگر تہی دستی اور غربت کا عذر کسی نے بھی قابل التفات نہیں سمجھا۔ مشورہ دینے والوں نے یہی کہا کہ بارگاہ رسالت میں اس کی ضرورت نہیں کہ تمہارے پاس دولت ہو۔ اس کے علاوہ آنحضرت ﷺ آپ کے مشفق مربی ہیں۔ تمہارا گوشہ خاطر معلوم ہو جائے گا تو وہ خود منظور فرمالیں گے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں مجھ پر مشورہ دینے والوں نے اتنا اصرار کیا کہ بالآخر مجھے تعمیل کرنی پڑی۔ میں نے بڑی ہمت سے کام لیا۔ خدمت مبارک میں حاضر ہوا، مگر ایک طرف میری شرم وحیا، دوسری طرف ذات اقدس کا رعب و جلال۔ حاضر ہونے کو حاضر ہو گیا مگر زبان بند، طبیعت مجوب، خاموش بیٹھ گیا۔ آنحضرت ﷺ کی مربیانہ شفقت ہی کار فرما ہوئی۔ خود دریافت فرمایا: کیسے آئے ہو، کچھ کام ہے۔ اس کے جواب میں بھی خاموشی ہی تھی۔ پھر خود ہی فرمایا: فاطمہ سے رشتہ کے لئے آئے ہو۔

میں نے عرض کیا: "نعم"

فرمایا: پھر کیا دو گے؟

میں نے عرض کیا، میرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔

ارشاد ہوا: میں نے تمہیں زرہ دی تھی وہ کیا ہوئی۔ ❶

جیسے ہی آنحضرت ﷺ کا اشارہ سمجھ میں آیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے زرہ بیچنے کی نیت کر لی۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ ۴۸۰ درہم میں بیچ کر پوری رقم اپنے مربی و سرپرست آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش کر دی۔ اس میں سے تقریباً ایک تہائی خوشبو پر خرچ ہوئی باقی دوسری ضرورتوں پر۔

آپ نے احباب کو طلب فرمایا: اور نکاح پڑھ دیا۔

مکان کا انتظام:

دُلہن کو لانے کے لئے مکان کی ضرورت ہوئی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک مکان کرایہ پر لیا۔ دلہن

اخوت قائم فرمایا اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اسم گرامی نہیں آتا گویا آپ کی مواخات قائم رہی جو آنحضرت ﷺ سے مکہ معظمہ میں قائم ہو گئی تھی مقصد یہ کہ سلسلہ مواخات سے جو سہولت حضرات مہاجرین کو مل گئی تھی کہ رہنے اور کاشت وغیرہ کا انتظام ہو گیا تھا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ سہولت بھی نہیں ملی تھی۔

❶ مشورہ دینے۔ پھر حاضری اور گفتگو کی۔ یہ تمام تفصیل البدایہ والنہایہ سے ماخوذ ہے ص ۳۶۶ ج ۳

کو وہیں اتارا، پھر مستقل قیام کے لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا گیا کہ حضرت حارثہ بن نعمان کے مکان خالی پڑے ہیں، ان سے ایک مکان لے لو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خودداری نے مکان کی فرمائش کرنی مناسب نہیں سمجھی۔ کسی طرح حضرت حارث رضی اللہ عنہ کو معلوم ہو گیا تو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یارسول اللہ سارے مکان آپ کے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ جو پسند فرمائیں وہ اس مکان کی خوش بختی ہے۔ میں اسی مکان کو جس کو آپ لیں گے زیادہ محبوب (اور مبارک سمجھوں گا) بمقابلہ اس کے جو آپ کے کام میں نہیں آئے گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صدقت بارک اللہ (آپ نے سچ فرمایا: اللہ آپ کو برکت دے)۔ حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ دوسرے مکان میں منتقل ہو گئے اور حضرت علی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اپنے مکان میں لا کر اُتارا۔"

اللہ تعالیٰ اپنے پاکباز مقربین کو کس طرح محفوظ رکھتا ہے :

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب میں اپنی دلہن (فاطمہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (کو رخصت کرانے کا[1] ارادہ کیا تو میں نے بنی قینقاع کے ایک سنہار کی شرکت سے ایک کام کرنا چاہا۔ خیال یہ تھا کہ نفع ہو گا تو ولیمہ کر سکوں گا۔

صورت یہ تھی کہ غزوۂ بدر کے مال غنیمت سے مجھے ایک ناقہ ملی تھی اور ایک اونٹنی مجھ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عنایت فرمائی تھی۔ جب میرے پاس دو اونٹ ہو گئے تو میں نے قبیلہ بنی قینقاع کے ایک سنہار سے یہ طے کیا کہ ہم دونوں ان اونٹوں پر جنگل سے اذخر لے آیا کرینگے اور اس کو بازار میں بیچ دیا کرینگے۔ یہ معاملا نفع ہی کا تھا اس میں نقصان کا سوال ہی نہیں تھا لیکن خدا کو منظور نہیں تھا کہ امام الاولیا بے فکری سے ولیمہ کریں۔

یہ زمانہ وہ تھا اس وقت تک شراب حرام نہیں ہوئی تھی۔ حضرت علی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عم محترم حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ جنہوں نے غزوۂ احد میں شہید ہو کر سید الشہداء کا خطاب (لسان نبوت سے حاصل کیا) وہ جیسے بہادر تھے ایسے ہی منچلے بھی تھے۔ قیام گاہ پر کچھ احباب اکٹھے تھے۔ شراب کا دور چل رہا تھا۔ کسی نے کہا شراب کے ساتھ اونٹنیوں کے کوہان کے کباب بھی ہونے چاہئیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی یہ دونوں اونٹنیاں سامنے کھڑی تھیں۔ حضرت حمزہ فوراً اٹھے اور دونوں اونٹنیوں کے کوہان نکال لئے اور کوہیں چاک کر کے گردے وغیرہ نکال لئے۔ احباب کی فرمائش[2] پوری کر دی مگر ولیمہ کے متعلق سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا سارا منصوبہ ختم ہو گیا۔ اسی لئے کہتے ہیں "نزدیکاں رابیش بود حیرانی"

---

[1] بخاری شریف ص ۲۸۰

[2] بخاری شریف ص ۳۲۰ وص ۳۴۴ وغیرہ

نکاح سے کچھ عرصہ بعد رخصتی :

ایک روایت ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا نکاح پہلے ہو چکا تھا اور رخصتی نو ماہ[1] بعد ہوئی تھی۔ بخاری شریف کی مذکورہ بالا روایت سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔

جہیز:

تاجدار دوعالم شاہ کونین ﷺ نے اپنی لخت جگر سیدہ نساء اہل الجنۃ فاطمہ زہراء رضی اللہ عنہا کو جو جہیز دیا اس کی فہرست[2] یہ ہے:

لحاف:	ایک
چمڑے کا گدا جس میں کسی درخت کی چھال بھری ہوئی تھی:	ایک
چکیاں:	دو
مشکیزہ:	ایک،
مٹی کے گھڑے:	دو

صلوات اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین

---

[1] الاستیعاب والبدایہ ولنہایہ ص ۳۴۶ ج ۳

[2] الاصابہ والترغیب والترہیب، باب الترغیب فی الاذکار بعد الصلوٰت

مقاصد بعثت، فرائض نبوت اور تکمیل

دعاء اور قبولیت دعا

سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام جب بیت اللہ کی بنیادیں بلند کر رہے تھے تو دل کی تمناؤں کے ترجمان دعائیہ کلمات یہ تھے جو زبان مبارک پر جاری تھے:

رَبَّنَا وَابۡعَثۡ فِيۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَيُزَكِّيۡهِمۡ‌ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ (البقرہ۔ ۱۲۹)

"اے ہمارے رب! اٹھا ان میں سے ایک رسول انہیں میں کا۔ پڑھے ان پر تیری آیتیں اور سکھادے ان کو کتاب اور پکی باتیں اور ان کو سنوارے۔"

قبولیت دعا:

هُوَ الَّذِىۡ بَعَثَ فِى الۡاُمِّيّٖنَ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيۡهِمۡ وَيُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ

(سورہ الجمعہ۔ ۲)

"وہی ہے جس نے اٹھایا ان پڑھوں میں ایک رسول انہیں میں کا پڑھتا ان پاس اس کی آیتیں اور ان کو سنوارتا اور سکھاتا کتاب اور عقلمندی۔" (شاہ عبد القادرؒ)

لَقَدۡ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اِذۡ بَعَثَ فِيۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡ اَنۡفُسِهِمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيۡهِمۡ وَيُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ۔ "(سورہ آل عمران۔ ۱۶۴)

"اللہ نے احسان کیا ایمان والوں پر جو بھیجا ان میں رسول انہیں میں کا، پڑھتا ہے ان پر آیتیں اس کی اور سنوارتا ہے ان کو اور سکھاتا ہے ان کو کتاب اور کام کی بات (شاہ عبد القادرؒ)

"و مے آموزو آن را کتاب و علم" (شاہ ولی اللہؒ)

دعاء اور قبولیت دعا کے الفاظ پر دوبارہ نظر ڈال لیجئے۔ حاصل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مبارکہ کے مقاصد یہ تھے:

تلاوت آیات اللہ، تعلیم کتاب اللہ، تعلیم الحکمہ، تزکیہ

تشریح

تلاوت اٰیات اللہ:

یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ کا ترجمہ یہی کیا گیا ہے۔ "پڑھتا ہے ان پر آیتیں"۔ لیکن پڑھنے ہی کے لئے لفظ قرأت بھی آتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کو حکم ہوا کہ پڑھو تو قرأت کا لفظ ہی لایا گیا: اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ مگر یہاں دعا میں بھی یَتْلُوْا ہے اور قبولیت دعا میں بھی "یَتْلُوْا" ہی ارشاد ہوا ہے یعنی تلاوت کرتا ہے تو کیا قرأت اور تلاوت میں کچھ فرق ہے؟

واقعہ یہی ہے۔ تلاوت اور قرأت میں فرق ہے۔ تلاوت کے معنی [1] صرف پڑھنے کے نہیں ہیں بلکہ تلاوت میں عمل بھی ملحوظ ہوتا ہے۔ پھر عمل بھی ایسا کہ تسلسل کے ساتھ ہوتا رہے۔ یعنی تلاوت میں صرف قول نہیں ہوتا بلکہ "قول مع [2] سعی پیہم" یعنی جس طرح آپ آیتیں سنائیں گے ساتھ ساتھ عمل اور عمل کے تسلسل کا بھی مشاہدہ کرا دیں گے، یعنی جس طرح یہ ایک معجزہ ہے کہ "ایک اُمی محض" جس نے عمر عزیز کے چالیس دور اس طرح گذارے کہ پڑھنے پڑھانے سے نا آشنا تھا اس کو "اقرأ" کا حکم ہو رہا ہے اور وہ قرأت کر رہا ہے اسی طرح اس معجزہ کے ساتھ ایک عجیب و غریب مشاہدہ بھی ہے کہ پڑھ کر سنانے والا جو کچھ پڑھتا ہے وہ خود اس کی عملی تصویر بن جاتا ہے۔ یعنی پڑھنے کے ساتھ ایسا کردار بھی پیش کرتا ہے کہ آپ اس کے عمل سے بھی اس کو پڑھ سکتے ہیں۔

ایک مثال ملاحظہ فرمائیے۔

ارشاد ربانی ہے:

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ﴿۷۸﴾ وَ مِنَ الَّيْلِ

---

[1] یہ مقصد نہیں ہے کہ تلاوت قراءت اور پڑھنے کے معنی میں نہیں آتا۔ قرآن شریف میں بہت جگہ محض پڑھنے کے معنیٰ میں بھی آیا ہے: وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ (مائدہ۔۲۷) اور نَتْلُوْا عَلَيْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰى وَ فِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ (القصص۔۳) وغیرہ۔ مگر جب ماخذ کا لحاظ کیا جائے تو صرف قرأت کے معنی نہیں ہوتے بلکہ کچھ اضافہ بھی ہوتا ہے۔ تفصیل دوسرے حاشیہ میں ملاحظہ فرمائیے۔

[2] تلاوت کا ماخذ "تلو" ہے جس کے معنی ہیں اتباع کرنا، پیچھے چلنا، اس طرح کہ آپ میں اور جس کے پیچھے چل رہے ہیں اس کے درمیان کوئی اور چیز حائل نہ ہو۔ تلاہ، تبعه متابعة ليس بينهم ماليس منها۔ وذٰلك يكون تارة بالجسم وتارة بالاقتداء في الحكم ومصدره تلو وتلو وتارة بالقراءة او تدبر المعنى مصدره تلاوة والقمر اذا تلاها اراد به هٰهنا الاتباع على سبيل الاقتداء والمرتبة وذلك انه يقال ان القمر هو يقتبس النور من الشمس وهو لها بمنزلة الخليفة (ثم قال) والتلاوة تختص باتباع كتب الله المنزلة تارة بالقراءة وتارة بالارتسام لما فيها من امر ونهي وترغيب وترهيب او ما يتوهم فيه ذلك وهو اخص من القراء فكل تلاوة قراءة وليس كل قراءة تلاوة لايقال تلوت رفعتك وانما يقال في القراٰن في شيء اذا قرأته وجب عليك اتباعه (المفردات فی غریب القراٰن)

فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴿۷۹﴾ (سورہ اسراء۔۷۸،۷۹)

شاہ صاحبان کے الفاظ میں اردو اور فارسی ترجمہ ملاحظہ فرمائیے۔

"کھڑی رکھ نماز سورج کے [1] ڈھلنے سے، رات کی اندھیری تک اور قرآن پڑھنا فجر کا۔ بیشک قرآن پڑھنا فجر کا ہوتا ہے روبرو [2] ۔ اور کچھ رات جاگتا رہ۔ اس میں۔ یہ بڑھتی ہے تجھ کو۔ شاید کھڑا کرے تجھ کو تیرا رب تعریف کے مقام [3] میں" (شاہ عبدالقادر صاحب رحمتہ اللہ)

"برپادار نماز را، وقت زوال آفتاب۔ تا ہجوم تاریکی شب، ولازم گیر قرآن خواندن فجر را، ہر آئینہ قرآن خواندن فجر را حاضر میشوند فرشتگان ۔ ودر بعض شب بیدار باش بقرآن شب خیزی زیادہ شد برائے تو۔ نزدیک است کہ ایستادہ کند ترا پروردگار تو بمقام پسندیدہ" (شاہ ولی اللہ صاحب رحمتہ اللہ)

وحی الٰہی کے کلمات کو شمار کیجئے جو ان آیتوں میں ہیں۔ کل تیس لفظ ہیں مگر آنحضرت ﷺ کے عمل اور کردار پر نظر ڈالئے تو دفتر بے پایاں ہے۔ پانچ فرض ان کے اجزاء ترکیبی، قیام، رکوع، سجدہ وغیرہ ۔ ان کے اوقات، پڑھنے کا انفرادی اور جماعتی طریقہ پھر ہر ایک کے ساتھ سنتیں، نفلیں، ان کے آداب اور طریقے جو احادیث کے سینکڑوں صفحات میں پھیلے ہوئے ہیں، یہ سب تلاوت کے معنی واضح کر رہے ہیں ۔

فریضہ نماز عام مسلمانوں کے لئے:

چار وقت کی وہ نمازیں جن کا سلسلہ آفتاب ڈھلنے کے وقت سے شروع ہو کر اندھیری رات گئے تک رہتا ہے اور پانچویں وقت کی نماز (صبح کی نماز) جس میں قرآن شریف پڑھنے کی خاص تاکید ہے، کیونکہ یہ "مشہود" ہوتا ہے۔ یعنی اس وقت دن اور رات کے کارگزار فرشتوں کا اجتماع ہوتا ہے ۔ یہ پانچ نمازیں آنحضرت ﷺ کی طرح تمام مسلمانوں پر فرض ہیں۔

آنحضرت ﷺ کی خصوصیت :

---

[1] یعنی کواکب پرستوں کے طریقہ کے برخلاف کواکب پرست طلوع آفتاب کے وقت آفتاب کی پوجا کرتے ہیں تو خدا پرستوں کی عبادت طلوع آفتاب سے پہلے ہوتی ہے یا زوال آفتاب کے بعد۔ واللہ اعلم بالصواب

[2] یعنی دن اور رات کے کارپرداز فرشتے اس وقت جمع ہوتے ہیں۔ وہ قرأت سنتے ہیں کیونکہ وہ قرأت نہیں کرسکتے ان کا وظیفہ تسبیح و تحمید ہوتا ہے۔ (واللہ اعلم)

[3] وہ تعریف کا مقام ہے شفاعت کا جب کوئی نہ بول سکے گا تب حضرت عرض کر کر خلق کو چھڑا دینگے تکلیف سے (موضح القرآن)

لیکن آنحضرت ﷺ کی خصوصیت یہ ہے کہ ان پانچ نمازوں کے علاوہ آپ کے لئے ایک اور حکم بھی ہے "فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ" (بنی اسرائیل۔۷۹) جس کے معنی حضرت شاہ عبد القادرؒ نے یہ کئے ہیں: "کچھ رات جاگتا رہ اس میں (نماز پڑھنے میں) یہ بڑھتی ہے تجھ کو"۔ یعنی یہ خاص طور پر آپ کے حق میں اضافہ ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے ترجمہ کیا ہے۔ "شب خیزی زیادہ شد برائے تو" گویا نماز تہجد بھی آپ پر فرض ہے۔ یہ فرض امت پر نہیں۔ امت کے حق میں صرف سنت ہے، نہ پڑھیں تو کوئی گناہ نہیں۔ مگر آپ کے حق میں فرض ہے۔

اس خصوصیت کی علت اور حکمت بھی بیان کر دی گئی کہ آپ کو مقام محمود کا منصب عالی عطا کرتا ہے۔عَسٰۤى اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (بنی اسرائیل۔۷۹) (قریب ہے کہ تمہارا پروردگار تمہیں ایسے مقام پر پہنچائے جو عالمگیر اور دائمی ستائش کا مقام ہو، جس کی ہر طرح تعریف کی جائے)

جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے:

یہ ایک عام اصول ہے یہاں یہی ظاہر کرنا ہے کہ سرور کائنات ﷺ کا جس طرح یہ مقام عالی ہے کہ "بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر" اسی طرح آپ کے فرائض میں بھی اضافہ [1] ہے اور ایسا اضافہ کہ عام انسانوں کو یہ حوصلہ نہیں ہے کہ اس اضافہ کو برداشت کر سکیں۔ یہ حوصلہ بھی رب محمد نے صرف محمد ہی کو عطا فرمایا تھا۔ جس نے اس اضافہ کو برداشت [2] کیا۔

---

[1] مگر یہ اضافہ عجیب قسم کا ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: یارسول اللہ آپ تو معصوم و مغفور ہیں پھر یہ ریاضت کیوں کہ پائے مبارک پر ورم آجاتا ہے تو آپ نے جواب دیا۔ افلا اکون عبدا شکوراً "کیا میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں" بخاری شریف ص ۱۷۶ یعنی عام اہل ایمان کے لئے فرضیت اس لئے ہے کہ گناہوں کا کفارہ ہو اور آپ کے لئے فرضیت بربناء شکر ہے۔ اسی لئے نفلیں جو شکر ادا کرنے کے لئے ہوتی ہیں وہ آپ کے حق میں فرض ہیں (واللہ اعلم بالصواب)

[2] برداشت کرنے کی صورت ملاحظہ فرمایئے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ نیت باندھنے میں آپ نے تین دفعہ اللہ اکبر فرمایا، پھر فرمایا: ذوالملکوت والجبروو الکبریاء والعظمۃ (مالک ملک، اقتدار اعلیٰ کا مالک، بڑائی اور عظمت والا) پھر قرأت شروع کی تو پوری سورہ بقرہ نہایت اطمینان سے پڑھی پر اسی کے مناسب بہت طویل رکوع کیا۔ پھر اتنا ہی طویل قیام کیا پھر اتنا ہی طویل سجدہ کیا، سجدہ کے بعد بڑے اطمینان سے دیر تک بیٹھے رہے۔ پھر دوسرا سجدہ کر کے کھڑے ہوئے تو سورہ آل عمران پوری پڑھی۔ تیسری رکعت میں سورہ نساء مکمل چوتھی رکعت میں سورہ مائدہ یا سورہ الانعام پوری پڑھی۔ صحابی کے بعد کے راوی شعبہ کو شک ہے کہ کونسی سورت کا نام لیا تھا۔ (ابوداؤد باب مایقول فی الرکوع) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آنحضرت ﷺ ایسا بھی کرتے تھے کہ تین دفعہ میں تہجد پڑھا کرتے تھے یعنی ایک مرتبہ اٹھے وضو کیا مسواک کی، نفلیں پڑھیں پھر آرام فرمایا، تھوڑی دیر تک سوتے رہے پھر اٹھے اس طرح تین دفعہ سوئے پھر اٹھے اور نوافل پڑھتے تھے (مسلم شریف) ظاہر ہے بار بار اٹھنا کتنا شاق ہوتا ہے۔ پھر تلاوت کی صورت حضرت عائشہ اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے یہ بیان فرمائی کہ ایک ایک حرف الگ الگ کھینچ کر (بخاری شریف، ابوداؤد، ترمذی وغیرہ)

بسلسلہ عبادت آنحضرت ﷺ کی خصوصیات

نماز کے سلسلہ میں صرف یہی نہیں کہ تہجد آپ پر فرض تھا بلکہ تہجد کے علاوہ بھی اور نوافل آپ کے حق میں فرض کا درجہ ❶ رکھتی تھیں۔

روزہ :

نماز کے علاوہ روزے کے بارے میں خصوصیت یہ تھی کہ چند روز کا مسلسل روزہ کہ بیچ میں افطار قطعاً نہ ہو، امت کو اس کی اجازت نہیں۔ مگر آنحضرت ﷺ کا معمول تھا۔

ایک مرتبہ صحابہ کرام نے اصرار کر کے اجازت ❷ حاصل کی اور مسلسل روزہ رکھنا شروع کیا مگر صرف دو روز بعد ہی اندازہ ہو گیا۔

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن   کہ جاہا سپر باید انداختن

حضرات علماء نے روزے کے تین درجے قرار دیئے ہیں:

(۱) عوام کا روزہ یعنی فقہی قاعدوں کے مطابق کھانے پینے وغیرہ سے رکنا، اور مکروہات و محرکات یعنی غیبت، جھوٹ، خیانت، حسد، مکر و فریب وغیرہ سے اجتناب و احتیاط۔

(۲) خواص کا روزہ، یعنی صرف مکروہات و محرکات سے اجتناب نہیں بلکہ ایسی جائز چیزوں سے بھی احتیاط برتی جائے جو یاد خدا سے غافل کر دیں۔ مثلاً شعر شاعری، یا شکار وغیرہ

(۳) اخص الخواص کا روزہ۔ اللہ کے سوا ہر چیز سے یکسوئی اور بر طرفی اور صرف ذات حق جل مجدہ ، میں محویت اور اس کی ذات و صفات میں ایسی مشغولیت کہ وہی جملہ توجہات کا محور ہو۔

آنحضرت ﷺ کے روزے کی یہی شان ہوتی تھی اور یہ شان نقطہ عروج پر پہنچ جاتی تھی جب آخری عشرہ میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آخر میں آپ تہجد کی نماز بیٹھ کر ادا فرماتے تھے مگر صورت یہ ہوتی تھی کہ پہلے بیٹھ کر پڑھتے رہتے جب تیس چالیس آیتیں رہ جاتیں تو کھڑے ہو کر پڑھتے، پر رکوع کیا کرتے تھے۔ (بخاری شریف ص ۱۲۵ و ص ۱۵۱ وغیرہ)

❶ مثلاً ظہر کی سنتیں اگر وقت پر نہ پڑھی جائیں تو ان کی قضا نہیں ہے۔ لیکن ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ کی ظہر کی سنتیں رہ گئیں تو آپ نے نماز عصر کے بعد ان کو پڑھا۔ بخاری شریف ص ۱۶۴ و ۱۶۵ پھر ان کو معمول بنا لیا۔ بخاری شریف ص ۸۳ حالانکہ نماز عصر کے بعد سے غروب آفتاب تک اور نماز صبح کے بعد سے طلوع آفتاب تک نوافل سے آنحضرت ﷺ نے ممانعت فرمائی ہے۔ بخاری شریف ص ۸۳ مگر چونکہ آپ کے حق میں نوافل فرض کا درجہ رکھتی تھیں لہذا آپ نے عصر کے بعد یہ نفلیں پڑھیں (واللہ اعلم بالصواب)

❷ بخاری شریف ص ۲۶۳ باب التنکیل لمن اکثر الوصال۔

آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے[3]:

الخلق عیال اللہ فاحب الخلق الی اللہ من احسن الی عیالہ

ترجمہ: "مخلوق، اللہ کا کنبہ ہے، بس خلق خدا میں اللہ تعالیٰ کو زیادہ محبوب وہ ہے جو اللہ کے عیال پر احسان کرے۔"

عجیب و غریب بات یہ ہوتی تھی کہ جس طرح توجہ الی اللہ اور ذات حق میں انہماک بڑھتا تھا اتنا ہی اس کی مخلوق کے حق میں رحم و کرم اور جود و سخا کا درجہ بڑھتا تھا یعنی پروردگار کی محبت اس کی پروردہ مخلوق پر لطف و احسان کی صورت میں جلوہ گر ہوتی تھی۔ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی شہادت ملاحظہ فرمایئے۔

کان رسول اللہ ﷺ اجود الناس وکان اجود مایکون فی رمضان حین یلقاہ جبرئیل وکان یلقاہ فی کل لیلۃ من رمضان فیدارسہ القران فلرسول اللہ ﷺ اجود بالخیر من الریح المرسلۃ[1]

"(یعنی) رسول اللہ ﷺ سب سے زیادہ سخی تھے اور آپ کی بے پناہ سخاوت کا زیادہ ظہور رمضان میں ہوتا تھا۔ جب حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ سے ملاقات کیا کرتے تھے اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کی ملاقات رمضان شریف کی ہر ایک رات میں ہوتی تھی۔ وہ آپ سے قرآن شریف کا دور کیا کرتے تھے۔ بس واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی سخاوت اور بخشش جو سال بھر نسیم صبح رہتی تھی اس زمانہ میں وہ آندھی سے زیادہ تیز ہو جاتی تھی جس کے جھونکے کسی رکاوٹ کے پابند نہیں ہوتے ہر طرف پہنچتے ہیں اور ہر ایک کو متاثر کرتے ہیں۔

زکوٰۃ:

امت کے لئے ایک نصاب معین کیا گیا کہ اس سے کم پر زکوٰۃ ہی واجب نہیں ہوتی، اور جب واجب ہو جاتی ہے تو صرف چالیسواں حصہ دینا ہوتا ہے۔ باقی سب مال حلال و مباح بلکہ پاکیزہ اور طیب۔ مگر آنحضرت ﷺ کا دستور العمل پہلے گزر چکا ہے کہ آپ نے طے فرمالیا تھا کہ کاشانہ نبوت سونے چاندی سے پاک رہے گا۔ دینار تو دینار درہم کی بھی مجال نہیں تھی کہ وہ دولت کدہ پاک میں رات گزار سکے۔ ★

جہاد:

جہاد کے سلسلہ میں عام مسلمانوں کے لئے زحف عن القتال (یعنی جنگ کے وقت میدان جنگ سے

---

[3] مشکوٰۃ شریف از شعب الایمان للبیہقی باب الشفعہ والرحمۃ علی الخلق۔

[1] بخاری شریف ص ۲ و ص ۲۵۵ وغیرہ

★ اس سلسلہ میں مفصل بحث پہلے گزر چکی ہے کہ کس طرح سب کچھ خرچ کر کے فاقہ اختیار کیا جاتا تھا (محمد میاں)

بھاگ جانا) حرام ہے، لیکن آنحضرت ﷺ کی شان یہ تھی کہ ابھی دولتکدہ سے بھی نہیں نکلے صرف ہتھیار سجائے ہیں۔ اس وقت ہر ایک مسلمان کے لئے جائز ہے کہ وہ اسلحہ اتار دے اور موقع ہو تو ارادہ جنگ بھی ملتوی کردے۔ لیکن آنحضرت ﷺ ہتھیار سجانے کے بعد جائز نہیں سمجھتے تھے[1] کہ اسلحہ اتار دیں جب تک فیصلہ کن جنگ نہ کرلیں۔

غرض یہ کردار تھا جس کو پیش کرتے ہوئے آپ آیات اللہ کی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ جو قرآن نہیں پڑھ سکتے تھے وہ آپ کے عمل سے آیات اللہ کی تلاوت کیا کرتے تھے۔

خلاصہ کلام :

تلاوت آیات اللہ کی تشریح کو ہم تبرکاً شہید وفا عبداللہ[2] بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے اشعار پر ختم کرتے ہیں۔

۱۔ وفینا رسول اللہ یتلوکتابہ	اذانشق معروف من الفجر ساطع
۲۔ ارانا الھدی بعدالعمی فقلوبنا بہ	موقنات ان ماقال واقع
۳۔ یبیت یجافی جنبہ عن فراشہ	اذا استثقلت بالمشرکین المضاجع

(بخاری شریف ص ۱۵۵)

”ترجمہ: (۱) ہمارے بیچ میں اللہ کے رسول ہیں) ﷺ (جو کتاب اللہ کی تلاوت اس وقت کرتے ہیں جب کہ وہ معروف اور جانی پہچانی شئ جو روشن ہوتی ہے جس کو فجر کہتے ہیں۔ شق ہوتی ہے (پو پھٹتی ہے) (۲) اس اللہ کے رسول نے ہمیں نابینائی (گمراہی) کے بعد ہدایت کا راستہ دکھایا۔ پس ہمارے قلوب اس کا یقین رکھتے ہیں کہ آپ جو کچھ فرماتے ہیں وہ ہو کر رہے گا۔ (۳) یہ اللہ کے رسول اس طرح رات گذارتے ہیں کہ آپ کا پہلو بستر سے الگ رہتا ہے (خاص) اس وقت جبکہ مشرکین (بستر پر دراز ہوتے ہیں اور) بستر ان کے جثوں سے بوجھل ہوتے ہیں۔

تعلیم الکتاب

یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ:

ہزاروں فتاویٰ اور فیصلے جن سے ملت اسلامیہ کے اہل علم حضرات فقہاء استدلال کرتے ہیں اور

---

[1] البدایہ والنہایہ ص ۱۳ ج ۴

[2] وہ جاں نثار اور فداکار جو غزوہ موتہ میں شہید ہوئے۔

غیر مسلم فضلاء کے لئے شمع بصیرت ہیں وہ انہیں غیر متمدن اور پس ماندہ کاشتکاروں یا چرواہوں کے ارشاد فرمودہ ہیں جن کی پس ماندگی کا شاہ ایران مذاق اڑایا کرتا تھا اور خود مکہ کے سردار ان کو حقیر سمجھتے تھے، یہاں تک کہ ابوجہل کو جانکنی کے وقت صدمہ تھا تو یہ کہ اس کو مدینہ کے کسانوں نے مارا۔ یا ان کے ارشادات وفرمودات ہیں جو مکہ کے معمولی دوکاندار تھے اور تحقیق کی جائے تو ان میں کچھ وہ بھی تھے جو رہزنی کیا کرتے تھے اور کچھ وہ تھے کہ بقول علامہ حالی:

تعیش تھا، غفلت تھی، دیوانگی تھی غرض ہر طرح کی حالت بری تھی

ان حضرات نے نہ کسی کالج یا یونیورسٹی میں تعلیم پائی تھی نہ کسی دارالعلوم یا دارالافتاء سے استفادہ کیا تھا۔ ان کی تعلیم گاہ وتربیت گاہ اسی ہادی اعظم کی خس پوش مسجد تھی جس کو رب العرش نے تعلیم کتاب کے لئے مبعوث فرمایا تھا۔

پھر ان میں سے ۲۳ سالہ دور نبوت کے رفقاء تو چند ہی تھے جن کی تعداد چالیس بھی نہیں تھی۔ مدینہ طیبہ کا دس سالہ دور بھی سب کو نصیب نہیں ہوا۔ بہت [1] سے وہ تھے جن کو دو تین سال اور بعض وہ بھی تھے جن کو چندماہ ہی میسر آئے مگر اخذ واستنباط کی وہ غیر معمولی بصیرت نصیب ہوگئی کہ یونیورسٹیوں اور دارالعلوموں کے تعلیم یافتہ فضلاء ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ بصیرت کے ساتھ جو وسعت ذہن میسر آئی وہ بھی پیغمبرانہ تربیت کی برکت تھی۔ یعنی جس طرح وہ خود اخذ واستنباط سے کام لیتے تھے وہ بھی یقین رکھتے تھے کہ اسی طرح اخذ واستنباط کا حق دوسرے کو بھی ہے۔ وہ جس طرح اپنی رائے کا احترام کرتے تھے دوسرے کے فیصلہ کا بھی اسی طرح احترام کرتے تھے۔

چنانچہ جن اجتہادی مسائل میں آج اختلاف ہے حضرات صحابہ کے دور میں بھی یہ اختلاف تھا۔ اسی لئے ہر ایک فریق کے پاس جس جس طرح آنحضرت ﷺ کی کوئی حدیث ہے کسی صحابی کا قول، یا فیصلہ بھی، وہ اپنے خزینہ یادداشت میں محفوظ رکھتا ہے، مگر باہمی تصادم سے یہ حضرات محفوظ تھے۔ اور سبق آموز بات یہ ہے کہ نہ باہمی رشک وحسد تھا، نہ شوق تعلی نہ جذبہ برتری، تحقیق مسئلہ کے وقت کھلے طور پر تنقید اور جرح، مگر وقت نماز آگیا تو جماعت میں سب شریک، بسا اوقات امام وہی بنا جو نشانہ اختلاف تھا۔

یہ تھا تعلیم الکتاب کا ایک رخ اور حضرات صحابہ پر اس کا اثر۔ دوسری صورت ملاحظہ فرمایئے۔

(۱) قرآن حکیم میں تغییر خلق اللہ یعنی اللہ کی بنائی ہوئی صورت میں تبدیلی پیدا کرنے کو شیطانی فعل فرمایا گیا ہے۔ [2] مگر تغییر خلق اللہ کا لفظ عام ہے۔ جس طرح مردوں کا خصی کرنا تغییر خلق اللہ ہے اور حرام ہے، ختنہ کرنا بھی تغییر خلق اللہ ہے۔ علیٰ ہذا بدن کے کسی حصے کے بال منڈوانا یا کٹوانا۔ یا اکھاڑنا،

---

[1] جیسے حضرت ابوہریرہ ابوموسیٰ اشعری، خالد بن ولید، عمرو بن العاص، عدی بن حاتم رضی اللہ عنہم

[2] سورہ نساء آیت ۱۱۹

ناخون تراشنا یا گدھوانا، یا عورتوں کے سر کے بال مصنوعی طور پر بڑھانا یا چہرے کے بال نوچنا، دانتوں میں مصنوعی طور پر کشادگی پیدا کرنا، ان باتوں میں خدا کی بنائی ہوئی صورت میں تبدیلی ہوتی ہے۔ پس جس کو اللہ تعالیٰ نے تعلیم الکتاب کے لئے مبعوث فرمایا تھا اس نے ان تمام کی تفصیل فرمائی۔ بعض تغیرات کو مستثنیٰ فرمایا۔ مثلاً ارشاد فرمایا:

الفطرۃ خمس، الختان والاستحداد، وقص الشارب و تقلیم الاظفار ونتف الابط ❶

یعنی یہ پانچ چیزیں، اگرچہ ان میں تغییر خلق اللہ ہے مگر یہ تغییر بتقاضاء فطرت ہے، یہ تغییر حرام نہیں ہے بلکہ فطرت ہے۔ ختنہ کرانا، موئے زیر ناف کو صاف کرنا، مونچھیں کٹوانا، ناخون کتروانا، بغل کے بال اکھیڑنا۔

اس کے مقابل دوسرا ارشاد یہ ہوا:

خالفوا المشرکین۔ وفروا اللحی واعفوا الشوارب ❷

"مشرکین کے خلاف یہ طریقہ اختیار کرو کہ داڑھی بڑھاؤ اور مونچھوں کو خوب باریک کترواؤ"

عورتوں کے متعلق ارشاد ہوا:

لعن اللہ الواشمات والمتوشمات والمتنمصات والمتفلجات للحسن المغیرات لخلق اللہ۔ ❸

ترجمہ: "ان عورتوں پر خدا کی لعنت جو گودتی ہیں جو گدواتی ہیں جو بال نوچتی ہیں جو خوبصورتی پیدا کرنے کے لئے دانتوں میں کشادگی کراتی ہیں جو خدا کی بنائی ہوئی صورت کو بدلتی ہیں۔"

خلاصہ یہ کہ تغییر خلق اللہ کی تفسیر و تشریح کہ بعض کو جائز اور مستحسن قرار دیا اور بعض کو ممنوع اور حرام۔ یہ فریضہ نبوت تھا جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انجام دیا۔

(۲) ارشاد ربانی ہے

وَأَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (سورہ البقرہ۔ ۲۷۵)

"اللہ تعالیٰ نے خرید و فروخت (تبادلہ) کو حلال قرار دیا اور ربوا (ایسی زیادتی جو بدل سے زیادہ ہو) کو حرام قرار دیا۔"

اب قرض کی صورت میں اگر پانچ روپیہ کے بجائے چھ روپیہ وصول کئے جاتے ہیں تو ظاہر ہے یہ ایک روپیہ بدل سے زائد ہے۔ ربوا یعنی سود ہے۔ لیکن اگر ایک تولہ چاندی کو دو تولہ چاندی، یا ایک سیر گیہوں کو دو سیر گیہوں کے بدلہ میں فروخت کیا جائے۔ تو کیا یہ بیع جائز ہو گی؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس

---

❶ بخاری شریف ص۸۷۵،
❷ بخاری شریف ص۸۷۵،
❸ بخاری شریف ص۸۷۹

کو بھی حرام فرمایا۔ اور نہ صرف چاندی اور گیہوں بلکہ اس طرح [1] کی اور چیزوں کے متعلق بھی نہایت سختی کے ساتھ ہدایت فرمائی کہ اگر ہم جنس سے تبادلہ ہے مثلاً سونے کی بیع سونے کی کسی چیز سے ہو رہی ہے تو اس میں بھی مساوات اور نقد ہونا ضروری ہے، نہ کم و بیش جائز ہے نہ ادھار۔ [2]

ان دو مثالوں میں سے ایک کا تعلق خرید و فروخت سے ہے دوسرے کا تعلق آرائش بدن سے۔ ان کے علاوہ ہزاروں مسائل ہیں جن کا تعلق عبادات، معاملات، معاشرت، اقتصاد، امور خانہ داری، آداب مجلس یا ملکی سیاست یا بین الاقوامی تعلقات سے ہے۔ قرآن حکیم نے ان کے متعلق اصولی تعلیم دی ہے اور کہیں صرف اشارہ کر دیا ہے۔

ارشادات رسول اللہ ﷺ جو کتب حدیث کے ہزاروں صفحات میں محفوظ ہیں ان کی توضیح اور تشریح کرتے ہیں۔ پھر حضرات ائمہ مجتہدین نے ان سے اصول اخذ کر کے پیش آنے والے معاملات کو ان اصول کے معیار پر جانچ کر احکام مرتب کئے جو کتب فقہ میں منضبط ہیں۔

ارشادات رسول اللہ ﷺ کی تصدیق حضرت حق جل مجدہ نے فرمادی کہ ارشاد ہوا:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (النجم آیت ۳و۴)

"اپنی چاہ اور اپنے نفس کی خواہش پر آپ کچھ نہیں کہتے، آپ جو کچھ فرماتے ہیں وہ وحی ہوتی ہے جو آپ پر نازل کی جاتی ہے۔"

نیز حضرت حق جل مجدہ کا ارشاد ہے:

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (حشر۔ ۷)

جو کچھ تمہارے سامنے پیش کریں رسول، اس کو لے لو، اور جس سے منع کریں اس سے رک جاؤ۔"

آنحضرت ﷺ نے جب حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا حاکم اعلیٰ بنا کر بھیجا تو آپ نے

---

[1] حدیث میں ایسی چھ چیزیں شمار کی گئی ہیں جن کا تبادلہ اگر ہم جنس سے ہے تو زیادتی اور ادھار حرام ہے۔ تبادلہ برابر سرابر اور ہاتھ در ہاتھ ہونا چاہئے۔ چاندی، سونا، گیہوں، جو، کھجور اور نمک۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے یہ اصول اخذ کیا کہ ایسی تمام چیزیں جو وزن کر کے یا صاع یا رطل جیسے پیمانہ سے ناپ کر بیچی جائیں اگر ان کا تبادلہ ہم جنس سے کیا جائے تو ان میں مساوات اور ہاتھ در ہاتھ ہونا ضروری ہے لہذا چاول، جوار، مکی وغیرہ کا تبادلہ اگر ہم جنس سے کیا جائے مثلاً چاول کی بیع چاول سے کی جائے تو مساوات اور ہاتھ در ہاتھ ہونا ضروری ہے نہ اضافہ جائز ہے نہ ادھار، کیونکہ یہاں جنس کا بھی اتحاد ہے اور قدر بھی متحد ہے کہ دونوں وزنی ہیں وزن کر کے بیچی جاتی ہیں۔ واللہ اعلم

[2] پانچ سیر گیہوں کی قیمت ایک روپیہ بھی لگا سکتے ہیں اور ایک ہزار روپیہ بھی۔ یہ بائع اور مشتری کی باہمی رضامندی پر ہے کہ وہ پانچ سیر گیہوں کو ایک روپیہ کی برابر قرار دیں یا ایک ہزار کے برابر۔ لیکن ہم جنس میں یعنی گیہوں کی بیع گیہوں سے ہو تو وہاں پانچ سیر گندم کو دس سیر گندم کے برابر قرار دینا غلط ہوگا۔ البتہ جو جنس ایسی ہے کہ وہ کیل یا وزن کر کے نہیں بیچی جاتی، گزوں سے ناپ کر یا مثلاً شمار کر کے بیچی جاتی ہے جیسے کپڑا، وہاں امام ابو حنیفہ کے مسلک کے مطابق یہ جائز ہے کہ ایک گز کپڑے کو ایک ہزار گز کپڑے کے عوض میں بیچا جائے مگر نقد۔

دریافت فرمایا:

کوئی مقدمہ آپ کے سامنے آئے گا تو آپ کس طرح فیصلہ کرینگے۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: کتاب اللہ کے مطابق اور اگر کتاب اللہ میں اس معاملہ کے متعلق کوئی صراحت نہیں ہو گی تو رسول اللہ کی سنت کے بموجب۔ اور اگر سنت رسول اللہ یعنی آپ کے جو ارشادات یا واقعات میرے علم میں ہیں ان میں اس کی کوئی نظیر نہیں ہو گی تو اپنے اجتہاد سے کام لوں گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے سینہ پر دست مبارک رکھ کر فرمایا: الحمد لله وفق رسول رسول الله لما یرضی به رسول الله

"الحمد للہ، اللہ تعالیٰ نے رسول کے رسول (فرستادہ) کو اس کی توفیق فرمائی جس کو اللہ کا رسول پسند کرتا ہے۔"

اس ارشاد گرامی نے حضرات مجتہدین کے اجتہاد کی تصویب اور تائید فرمادی۔

تعلیم الحکمہ

یعلمهم الکتب والحکمة:

سکھاتے ہیں ان کو (علماء امت کو) کتاب اور حکمت [1] یعنی کتاب اللہ کی تعلیم کے ساتھ آپ ایسے اصول کی تعلیم بھی دیتے ہیں جن پر قانونی عدل اور دستور و آئین کی حسین اور شاندار عمارت سر بفلک کی جاسکے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبات ملاحظہ فرمایئے: وہ ایسے ہی اصول کا مجموعہ ہیں یہاں خطبات کے علاوہ چند حدیثوں کا ترجمہ پیش کیا جارہا ہے:

ارشاد ہوا۔ حلال بھی واضح ہے حرام بھی واضح ہے۔ لیکن دونوں کے درمیان کچھ ایسے امور ہیں

---

[1] قرآن حکیم میں یہ الفاظ تین جگہ آئے ہیں۔ سورہ بقرہ، سورہ آل عمران اور سورہ جمعہ، حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے حکمت کا ترجمہ سورہ بقرہ اور آل عمران میں علم کیا ہے اور سورہ جمعہ میں دانش۔ شاہ عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ نے (علی الترتیب) تین ترجمے کئے ہیں: پکی باتیں، کام کی بات، عقلمندی۔ مگر ظاہر ہے یہ سب ترجمے تشریح طلب ہیں۔ احقر نے اپنے الفاظ میں اس کی تشریح کردی ہے۔ جہاں تک حضرات مفسرین کا تعلق ہے تو ان کے ارشادات یہ ہیں۔ مایکمل نفوسهم من المعارف والاحکام وقیل هی السنته وقیل هی القضاء وقیل الفقه (ص ۱۳۱ تفسیر مظہری ج ۱) الحکمة العلوم الحقة المستحکمة التی یستفیدها الحکیم من الحکیم بلا توسط (کتاب ولا بیان تفسیر مظہری ص ۱۶۶ ج ۳۲) الحکمة الشریعة المحکمة المطابقة بشرائع الانبیاء فی الاصول المشهود علیها بالکتب السماویة بالقبول ایضاً (تفسیر مظہری ص ۲۷۵ ج ۹) اصابة الحق بالعلم والعقل قضیه صادقه (المفردات فی غریب القرآن)

جن میں کچھ مشابہت حلال کی ہے کچھ مشابہت حرام کی۔ پس جس نے ایسے مشتبہ امور سے تقویٰ اختیار کیا اور احتیاط برتی۔ اس نے اپنے دین کو بھی اعتراض سے بری کر لیا اور اپنی آبرو بھی بچالی اور جو ان مشتبہ امور میں پڑ گیا اس کی مثال اس چرواہے کی ہے جو اپنے مویشی سرکار کی محفوظ چراگاہ کے پاس چرارہا ہے قریب ہے کہ وہ مویشی کو اس چراگاہ میں اتار دے۔

"یادرکھو ہر ایک سرکار کی چراگاہ ہوتی ہے۔ یادرکھو (احکم الحاکمین) اللہ تعالیٰ کی چراگاہ حرام امور ہیں۔ یادرکھو بدن میں ایک گوشت کا ٹکڑا ہے وہ ٹھیک رہتا ہے تو بدن ٹھیک رہتا ہے۔ وہ بگڑ جائے تو بدن بگڑ جاتا ہے۔ یادرکھو یہ گوشت کا ٹکڑا وہ ہے جس کو "دل" کہا جاتا ہے۔"[1]

اس ارشاد گرامی نے بہت سے اصول کی تعلیم دیدی۔ مثلاً یہ کہ[2] ایسے تمام امور جن کے جواز اور عدم جواز میں کلام ہو۔ تقویٰ یہ ہے کہ ان کو نہ کیا جائے۔ اصطلاح فقہ میں ایسے امور کو مکروہ کہا جاتا ہے جو درجہ بدرجہ تنزیہی، تحریمی، پھر تحریمی قریب بحرام ہوتا ہے۔

یا مثلاً یہ کہ عقائد وخیالات کی اصلاح سب سے مقدم ہے۔ عقائد خراب ہوتے ہیں تو دل کے جذبات بھی خراب ہوتے ہیں، جو عمل کو خراب کر دیتے ہیں۔

(۲) اسی حدیث میں یہ اضافہ بھی ہے۔[3]

"پس جو شخص مشتبہ کام کو چھوڑ دے وہ غیر مشتبہ حرام کو بدرجہ اولیٰ چھوڑ دیگا اور مجرمانہ جرأت کر کے مشتبہ کام کرنے لگے تو وہ عنقریب حرام میں بھی مبتلا ہو جائے گا۔"

(۳) حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں[4] ۔ ایک روز آنحضرت ﷺ تشریف فرماتھے۔ ہم بھی مجلس مبارک میں حاضر تھے۔ ارشاد ہوا:

"اپنے بعد مجھے تمہارے متعلق جس بات کا خطرہ ہے وہ دنیا کی وہ رونق وزینت ہے جو پوری زیبائش کے ساتھ تمہارے سامنے آئے گی۔"

ایک شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ کیا خیر بھی شر کو لاسکتا ہے؟ (یعنی جب یہ رونق وزینت حلال اور جائز راستہ سے آئے گی تو پھر اس سے خطرہ کیوں ہے)۔ راوی بیان کرتے ہیں کہ اس سوال پر آنحضرت ﷺ نے خاص توجہ فرمائی۔ آپ خاموش ہو گئے اور دیر تک خاموش رہے۔ ہمیں خیال ہوا کہ

---

[1] بخاری شریف ص ۱۳

[2] اس اصول کو سامنے رکھ کر فاتحہ، سوئم، چہارم، چہلم، برسی، شب برات، بی بی فاطمہ کی صحنک و محفل میلاد قیام وغیرہ پر نظر ڈالئے۔

[3] بخاری شریف ص ۲۷۵

[4] بخاری شریف ص ۱۹۸

شاید وحی نازل ہو رہی ہے۔ اس کے بعد آپ نے پسینہ پونچھا اور دریافت فرمایا: "سائل کہاں ہے"۔ گویا اس سوال کو آپ نے معقول قرار دیا۔ پھر فرمایا: "بیشک خیر شر کو نہیں لاتا بشرطیکہ خیر کے تقاضوں کو پورا کرتے رہو"۔ (یعنی دولت کی بنا پر جو حقوق ہوتے ہیں ان کو ادا کرتے رہو)۔ پھر آپ نے مثال دیتے ہوئے فرمایا: "دیکھو موسم بہار میں جو سبزہ پیدا ہوتا ہے اگر جانور اس کو کھائے چلا جائے تو وہ سبزہ (جو نہایت عمدہ ہے اور سراسر خیر ہے) جانور کو مار ڈالتا ہے یا نیم جان کر دیتا ہے۔ ہاں وہ جانور جو سبزہ کھا کر ساتھ ساتھ ہضم بھی کرتا رہے اور سبزہ سے شکم سیر ہونے کے تقاضے کو پورا کرتا رہے، مثلاً یہ کہ یہی مویشی جب سبزہ سے شکم سیر ہو جائے اور اس کی کہیں تن جائیں تو گھومے پھرے، دھوپ میں بیٹھے۔ پھر فضلہ خارج کرے (اس کے بعد کھائے تو مفید ہو گا) پھر ارشاد ہوا: دیکھو یہ مال ہرا بھرا اور شیریں ہے۔ پس وہ اس مسلمان کا بہت اچھا دوست ہے جو مسکینوں، یتیموں، مسافروں اور ضرورت مندوں کو فراموش نہ کرے، ان کو بھی آسودہ کرتا رہے۔ اور دیکھو جو شخص بلا استحقاق کے مال لیتا ہے (مثلاً سوال کر کے) تو اس کی مثال ایسی ہے کھاتا رہتا ہے پیٹ نہیں بھرتا۔"

تزکیہ

ویزکیھم:

ان کو مانجھتا ہے	(مولانا ابوالکلام آزاد)
ان کو سنوارتا ہے	(حضرت شاہ عبد القادر)

ظاہر ہے یہ دوسرا ترجمہ زیادہ حاوی [1]، جامع اور واقعہ اور حقیقتِ حال کے زیادہ مطابق ہے۔

کیونکہ آنحضرت ﷺ نے اہل ایمان کو صرف مانجھا ہی نہیں بلکہ ان کو آراستہ بھی کیا ہے ان کو حسین اور جمیل بھی بنایا ہے۔ یعنی مانجھنے کے بعد سنوار ا بھی ہے۔ جس طرح یہ عمل بہت مشکل ہے کیونکہ یہ ایک کیمیا ہے اور کیمیا بھی وہ جو کانسی یا پیتل کو نہیں بلکہ زیر پا گرد و خس و خاشاک کو سونا بناتا ہے اسی طرح اسکی وسعت بھی اتنی زیادہ ہے کہ ہزاروں صفحات کے دامن بھی اس کو نہیں سمیٹ سکتے کیونکہ انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کو سنوارنے کی ضرورت نہ ہو۔ اور جو حسین و جمیل بننے کی

---

[1] لغت سے بھی قریب تر یہی ترجمہ ہے یعنی سنوارتا ہے۔ کیونکہ لفظ زکوٰۃ کے معنیٰ صرف پاک کرنا نہیں ہیں بلکہ خوشگوار اور تروتازہ بنانے کے ہیں۔ زکی الرجل صلح و تنعم فھو زکی (قاموس) والزکوٰۃ لغۃ الطھارۃ والنماء والبرکۃ المدح (مجمع البحار) الزکوٰۃ النمو الحاصل من برکۃ اللہ تعالیٰ (الی ان قال) وبزکاء النفس وطھارتھا یصیر الانسان بحیث یستحق فی الدنیا الاوصاف المحمودۃ وفی الاخرۃ الاجر المثوبۃ (المفردات فی غریب القرآن)

صلاحیت نہ رکھتا ہو۔

فرد میں بھی خرابی ہوتی ہے۔ جماعت میں بھی، ظاہر میں بھی، باطن میں بھی، مرد میں بھی اور عورت میں بھی، پھر اندرون خانہ، بیرون خانہ، حلقہ درس و تلقین، محفل طرب ونشاط، بزم شعر و سخن، انجمن خورد و نوش، بازار، تجارتی کاروبار، بارگاہ عدل وانصاف یا ایوان سیاست اجتماعی مطالبات اور ان سے متعلق خواص کے نظریات، عوام کے جذبات، طرح طرح کی تحریکات، سیاسی چالیں، شاطرانہ حرکتیں، میدان جنگ، جشن فتح یا صلح کانفرنس وغیرہ۔ قدرتی بات ہے کہ ان میں خرابیاں بھی ہوتی ہیں اور خوبیاں بھی۔ خرابیوں کو دور کر کے خوبیاں پیدا کرنا۔ خرابیوں کے عوامل اور محرکات کو پہچان کر دلوں کو ان سے پاک کرنا اور ان کے بر خلاف خدا پرستی، صدقات ہمدردی، اخلاص اور ان کے جذبات کو دلوں کے نہان خانوں میں جلوہ گر کرنا ان سب کا نام "تزکیہ" ہے۔ [1]

ان تمام وسعتوں کے ساتھ "تزکیہ" کو فرائض نبوت میں شمار کرایا گیا۔ یہ بھی ظاہر کر دیا گیا کہ ★ خاتم الانبیاء والمرسلین ﷺ نے اس فریضہ کو حسن وخوبی اور کامیابی کے ساتھ انجام دیا۔ مگر کس طرح انجام دیا اور آئندہ کے لئے کیا کیا۔ ہدایتیں فرمائیں ان کی تفصیلات کے لئے آپ حدیث، تفسیر، فقہ، سیر و مغازی۔ تہذیب اخلاق، تصوف واحسان کی کتابیں ملاحظہ فرمائیں۔ اس مختصر مجموعہ میں ان کا مختصر بیان بھی ممکن نہیں ہے۔ یہاں صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ ان تمام فرائض میں جو پہلے بیان کئے گئے (تلاوت آیات اللہ۔ تعلیم الکتاب تعلیم الحکمہ) تزکیہ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ گویا نصب العین تزکیہ ہی ہے اور تمام امور اس کے مقدمات اور ابتدائی مراحل ہیں۔

تزکیہ کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ نہ صرف عبادات واخلاق اور احسان وسلوک کی بنیاد تزکیہ پر ہے بلکہ اسلام نے معاشرت، معیشت، سیاسی نظام اور اس کے لئے مالی نظام انتہا یہ کہ جنگ اور صلح کی بنیاد بھی تزکیہ پر ہی رکھی ہے۔ مقاتلہ ومبارزہ، دشمن کو تباہ کرنا، اس کے ملک کو برباد کرنا "جہاد فی سبیل اللہ" اسی وقت ہو گا جب لڑنے والے وہ ہوں جو اپنا تزکیہ کر چکے ہوں۔ تزکیہ کے بغیر یہ قتل وقتال فساد فی الارض ہے۔ یہی تزکیہ ہے۔ جو زندگی کے ہر ایک شعبہ میں کار فرما ہے۔ مثلاً

۱۔ معاشرت اور سماجی زندگی میں سب سے پہلی چیز نکاح اور ازدواج ہے۔ وحی الٰہی کی ہدایت

---

[1] مثلاً صرف مرض بخل رفع نہیں کیا بلکہ سیر چشمی، وسعت نظر اور جذبات ہمدردی خلق خدا سے ان کو آراستہ بھی کیا۔ (محمد میاں)

★ ملاحظہ فرمایئے آیت ۱۶۴ سورہ آل عمران و آیت ۲ سورہ جمعہ جو قبولیت دعا کے سلسلہ میں ص ۳۶۹ پر گزری اور اس سے بڑھ کر کامیابی کیا ہو سکتی ہے کہ حضرات صحابہ کو کتاب اللہ نے الرشدون کی سند عطا فرمادی اور انہیں کو رشد وھدیٰ کا معیار قرار دیا أُولَٰئِكَ هُمُ الرَّاشِدُونَ ۝ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَنِعْمَةً (سورہ حجرات ۔۸)

ہے۔ قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَ يَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ؕ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۝۳۰ (سورہ نور۔ ۳۰)

"کہہ دیجئے مسلمانوں سے، نیچی رکھیں اپنی نگاہیں اور حفاظت کرتے رہیں اپنی شرمگاہوں کی۔ یہ ان کے لئے زیادہ تزکیہ (صفائی اور پاکی) کی بات ہے بیشک اللہ تعالیٰ کو سب خبر ہے جو کچھ لوگ کیا کرتے ہیں"۔

اس تزکیہ کو سامنے رکھ کر آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

یامعشر الشباب من استطاع منکم الباءۃ فلیتزوج فانہ اغض للبصر واحصن للفرج ومن لم یستطع فعلیہ بالصوم فانہ لہ وجاء ❶

نوجوانو! جو ازدواجی زندگی کی ضروریات پورا کرنے کی استطاعت اور گنجائش رکھے وہ ازدواجی زندگی اختیار کرے ❷ کیونکہ اس سے نگاہ پوری طرح نیچی ہوتی ہے اور فرج کی پوری حفاظت ہوتی ہے اور جس میں یہ گنجائش نہ ہو اس کے لئے لازم ہے کہ وہ روزے رکھے جو شہوانی رجحانات کو مفلوج اور مضمحل کردیتے ہیں۔

ایک دوسرے کے مکان میں جانے کے لئے وحی الٰہی نے استیذان کو ضروری قرار دیا کہ پہلے اجازت حاصل کرو۔ استیذان کے ساتھ سلام بھی کرو۔ پھر ارشاد ہوا:

وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ (سورہ نور۔ ۲۸)

"اور اگر تم سے کہا جائے کہ واپس ہو جاؤ تو واپس ہو جایا کرو۔ یہی تمہارے لئے صفائی اور ستھرائی (تزکیہ) کی بات ہے اور جو تم کرتے ہو۔ اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتا ہے۔" ❸

۲۔ معیشت اور کاروبار کے سلسلہ میں تجارت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے لیکن تاجر کے لئے

---

❶ بخاری شریف ص۷۵۸

❷ اسلام تجرد کو پسند نہیں کرتا۔ تجرد رہبانیت ہے اور سادھوپنا ہے جو نصب العین نہیں بن سکتا۔ کیونکہ زندگی کی دلچسپیوں کو ختم کردیا جائے تو ترقیات کی طرف بڑھنے والے قدم بوجھل ہو جائیں، دنیا اپنی رونق کو کھو بیٹھے اور معاشرہ انسانی کی چہل پہل ختم ہو جائے۔ اسلام ارتقاء اور تعمیر کا حامی ہے۔ وہ کسی گوشہ میں بھی تخریب کو پسند نہیں کرتا صرف اس تخریب کو جائز قرار دیتا ہے جو تعمیر کے لئے ہو۔

❸ شروع سے پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے "اے ایمان والو مت جایا کرو گھروں میں اپنے گھروں کے سوا۔ جب تک ان سے اجازت نہ لے لو اور (اجازت لینے سے پہلے) ان کے رہنے والوں کو سلام نہ کرلو (مثلاً یہ کہو: السلام وعلیکم! کیا حاضر ہو سکتا ہوں) یہی تمہارے لئے بہتر ہے۔ توقع ہے کہ تم اس کا پورا خیال رکھو گے۔ پھر اگر ان گھروں میں تم کو کوئی آدمی معلوم نہ ہو تب بھی ان گھروں میں نہ جاؤ جب تک تم کو اجازت نہ دیدی جائے۔ اور اگر تم سے کہا جائے کہ واپس جاؤ تو واپس ہو جاؤ۔ یہی تمہارے لئے صفائی ستھرائی کی بات ہے۔

ضروری ہے کہ "الصدوق الامین" (پوری طرح سچا معاملا کرنے والا امانت دار) ہو۔ خیانت اور غلط بیانی وغیرہ سے تزکیہ کر چکا ہو۔

ہر طرح کے کاروبار کے سلسلہ میں ارشاد ہوا: اللہ تعالیٰ طیب (پاک صاف ستھرا) ہے وہ پاکی اور ستھرائی کو پسند کرتا ہے اور پاک اور ستھری چیز ہی قبول کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بھی ان باتوں کا حکم فرمایا جن کا حکم انبیاء علیہم السلام کو فرمایا تھا۔ انبیاء علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اے گروہ پیغمبران! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو"۔ [1]

اسی طرح مسلمانوں کو خطاب فرمایا: اے ایمان والو! کھاؤ وہ پاکیزہ چیزیں جو ہم نے تم کو دی ہیں" اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے اس شخص کا ذکر کیا جو لمبا سفر کرتا ہے، پراگندہ سر، گرد سے اٹا ہوا اپنے ہاتھ آسمان کی طرف پھیلا کر دعا کرتا ہے: یارب! یارب اور حالت یہ ہے کہ اس کی خوراک حرام، اس کا پانی حرام (ناجائز طریقہ سے حاصل کیا ہوا) اس کا لباس حرام، حرام غذا سے اس کا نشو و نما ہوا۔ ایسے شخص کی دعا کیا قبول ہو سکتی ہے؟ (ترمذی شریف تفسیر سورہ البقرہ ص ۱۲۳ ج ۲)

حرص، طمع، خود غرضی، بخل، نفع اندوزی، ناپاک خصلتیں ہیں جن سے تزکیہ ضروری ہے۔ یہی خصلتیں ربوا اور سود کی علت پیدا کرتی ہیں۔ لہٰذا نہ صرف سود حرام ہے بلکہ ہر ایسا کاروبار اور ہر ایسا معاملہ حرام جس میں سود کا شبہ ہو۔

سیاسی نظام میں چوٹی کا فرد یعنی سربراہ وہ ہونا چاہئے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔ یعنی تزکیہ نفس میں سب سے بڑھا ہوا ہو۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ (سورہ حجرات۔ ۱۳)

"اللہ کے یہاں سب سے زیادہ مستحق احترام وہ ہے جو سب سے زیادہ خدا ترس اور پرہیز گار ہو۔"

حکومت کیا ہے:

اسلام نے نماز اور روزہ کی طرح حفاظت جان و مال، عصمت اور آبرو کی حفاظت، تعلیم و تربیت، امر بالمعروف، نہی عن المنکر یعنی اچھی باتیں بتانا ان پر عمل کرانا، بری باتوں سے خود رکنا اور دوسروں کو بھی روکنا، عدل و انصاف، غریبوں کی پرورش، کمزوروں کی مدد، مظلوموں کی فریاد رسی، بیمار کی تیمارداری، ملک اور قوم کی حفاظت وغیرہ کو بھی افراد کے فرائض قرار دیا ہے یعنی ہر ایک مسلمان کا خود اپنا فرض ہے کہ اپنی پوری طاقت و استطاعت ان فرائض کو انجام دینے میں مصروف کرے، ورنہ وہ عند اللہ جوابدہ ہو گا

---

[1] ایسے تاجر کا حشر انبیاء علیہم السلام اور صدیقین اور شہداء امت کے ساتھ ہو گا (ترمذی و ابن ماجہ وغیرہ) اس کے برخلاف جو تاجر خیانت کرے (اچھا نمونہ دکھا کر برا مال دے یا ملاوٹ کرے، وغیرہ) اس کے متعلق ارشاد ہوا کہ اس کو مسلمان کہنا درست نہیں (من غش فلیس منا۔ ترمذی شریف ص ۱۵۷) چور بازاری کرنے والا ملعون ہے (المحتکر ملعون۔ ابن ماجہ وغیرہ)

۔ لیکن جب تک باہمی تعاون نہ ہو بہت [2] سے فرائض ایسے ہیں جو انجام نہیں پاسکتے۔ اسی باہمی تعاون کے وسیع نظام کا نام نظام حکومت ہے اس کے سربراہ کو خلیفہ المسلمین کہا جاتا ہے یعنی تمام مسلمانوں کا نائب اور ان کا قائم مقام۔

مالی نظام:

سیرۃ مبارکہ کا دامن اس جبر و قہر سے پاک ہے جو ٹیکسوں کے وصول کرنے کے لئے عمل میں لایا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نظام حکومت کی مالی ضرورتوں کے پورا کرنے کے لئے جو مالیہ وصول کیا جائے اسلام نے اس کی بنیاد بھی تزکیہ پر رکھی ہے۔

خود غرضی، حرص و طمع، حب مال اور بخل وہ ناپاک خصلتیں ہیں جن سے نفس مومن کا پاک ہونا ضروری ہے۔ یہ نفس کی خباثت ہے کہ دولت و ثروت کی محبت قومی اور ملی ضرورتوں سے اس کی آنکھ بند کردے۔

جس طرح نماز روزہ فرض ہے ایسے ہی جہاد بھی فرض ہے، جو مال سے بھی ہوتا ہے اور جان سے بھی، جو اسلام اور ایمان کا دعویٰ کرتا ہے۔ اس کی بیداری یہ ہے کہ مسلسل [1] جہاد کرتا رہے۔ صاحب مال جہاد بالمال بھی کرے گا۔ یہ جہاد درحقیقت خود اپنے نفس سے ہوگا۔ وہ نفس جو بارگاہ بخل [2] اور دربار حرص و طمع میں ہر وقت حاضر رہتا ہے اس کو مجبور کرنا ہوگا کہ وہ اس ظلمت کدہ سے نکلے۔ خود غرضی

---

[2] مثلاً عدل و انصاف اور مظلوموں کی فریادرسی کے لئے پنچائتوں یا عدالت کا قیام، غریبوں اور کمزوروں کے وظائف، تعلیم و تربیت کے لئے تعلیمی اور اصلاحی ادارے، بیماروں کی تیمارداری کے لئے ہسپتال اور شفاخانے، ملک و قوم کی حفاظت کیلئے قوت دفاع یعنی فوج اور سامان جنگ وغیرہ۔

[1] مقصد یہ ہے کہ تمام فرائض جو حکومت کے فرائض قرار دیئے جاتے ہیں اسلام نے ان کو اہل ایمان کے شخصی اور ذاتی فرائض قرار دیا ہے۔ اسلامی تعلیم کے بموجب اگر ان فرائض کا احساس ہوگا تو اس کا مبارک نتیجہ یہ ہوگا کہ حکومت کوئی ہےئت جابرہ اور چیرہ دست طاقت نہیں ہوگی جو قانون کے ذریعے اپنی چیرہ دستی کا مظاہرہ کرے بلکہ نظام حکومت ذریعہ تعاون اور امداد باہمی کا ایک رابطہ ہوگا جس میں ہر ایک فریق دوسرے کا مددگار، احسان مند اور دعاگو ہوگا۔ قوم اپنے سربراہ اور اس کے کارپردازوں کی شکرگذار اور احسان مند اس لئے ہوگی کہ ان کے ذریعہ اس کے ذاتی فرائض حسن و بخوبی سے انجام پارہے ہیں۔ سربراہ اور اس کے اعمال قوم کے شکرگذار اس لئے ہونگے کہ قوم کے تعاون نے ان کی ذمہ داری کی مشکلات کو آسان کردیا۔ آنحضرت ﷺ کے ایک ارشاد کا ترجمہ پیش کیا جارہا ہے جو اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ترجمہ یہ ہے: ”تمہارے بہترین سربراہ وہ ہیں کہ تم ان سے محبت کرو وہ تم سے محبت رکھیں۔ تم ان کو دعائیں دو وہ تم کو دعائیں دیں اور بدترین سربراہ وہ ہونگے کہ تم ان سے بغض رکھو وہ تم سے بغض رکھیں۔ تم ان پر لعنت بھیجو وہ تم پر لعنت بھیجیں۔(مسلم شریف ص۱۲۹ج۲) اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ (التوبہ۔۱۱۱)

[2] وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ (النساء۔۱۲۸)

کی غلاظت سے اپنا دامن پاک کرے۔ [3]

ہنگامی اور غیر معمولی ضرورتوں کے لئے جو امداد حاصل کی جائے قرآن حکیم نے اس کو انفاق فی سبیل اللہ یا قرض کا عنوان دیا ہے۔ لیکن ایک مقررہ چندہ جو صاحب نصاب پر سال بہ سال فرض ہوتا ہے اس کا نام زکوٰۃ ہے کیونکہ اس کا مقصد تزکیہ ہے۔ یعنی نفس مومن کو بخل کی آلودگی سے پاک کرنا۔ اس تمہید کے بعد ارشاد ربانی کے مضمرات پر گہری نظر ڈالئے۔

ارشاد ربانی ہے:

خُذۡ مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمۡ وَتُزَكِّيۡهِمۡ بِهَا وَصَلِّ عَلَيۡهِمۡ ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمۡ (توبہ،۱۰۳)

ترجمہ: "اے رسول! ان لوگوں کے مال سے صدقہ (زکوٰۃ) وصول کرو (یہ اس لئے کہ) تم ان کو (بخل اور حب مال کی پلیدی سے) پاک کرو اور ان کا تزکیہ کرو (ان کو سدھاؤ اور ان کی تربیت کرو کہ ہمدردی خلق خدا، سیر چشمی، داد و دہش اور امداد باہمی وغیرہ کے وہ عادی ہو جائیں اور یہ باتیں ان کی طبعیت ثانیہ بن جائیں) اور ان کو دعا دو۔ بیشک آپ کی دعا ان کے دلوں کے لئے راحت و سکون ہے۔

حب مال سے صحابہ کرام کے مبارک قلوب کس درجہ پاک ہوئے، حضرات مہاجرین اور حضرات انصار کی قربانیاں اس کی مثال پیش کرتی ہیں۔ حضرات مہاجرین کے پاس جو کچھ تھا وہ انہوں نے مکہ میں خرچ کیا اور اس حالت میں مدینہ پہنچے کہ قرآن حکیم نے ان کے لئے لفظ فقراء [1] استعمال کیا۔

حضرات انصار کی قربانیاں آپ اسی کتاب میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ تمام جائیدادیں نصف نصف تقسیم کر چکے۔ پھر بھی ان کی آرزو رہتی تھی کہ راہ خدا میں زیادہ سے زیادہ خرچ کریں۔ آنحضرت ﷺ نے بحرین کی جائیدادوں سے ان کے نقصانات کی کچھ تلافی کرنی چاہی تو اس کو لینے سے معذرت کر دی کہ پہلے مہاجرین کو آپ عنایت فرمائیں۔ تب یہ جائیدادیں لیں گے ورنہ ہمیں ضرورت نہیں ہے۔

حب جان سے تزکیہ کا اندازہ کرنے کے لئے اس بے پناہ شوق شہادت پر نظر ڈالئے جو ان حضرات کے مبارک دلوں اور سینوں میں بھر دیا گیا تھا۔

"فزت و رب الکعبہ" (میں کامیاب ہو گیا ہوں خدا کی قسم) کسی مجاہد نے دشمن کے قتل کرنے پر نہیں کہا تھا۔ حرام بن ملحان کے جب دھوکہ سے نیزہ مارا گیا اور خون کا فوارہ ابل پڑا تو اس خون شہادت سے وضو [2] کرتے ہوئے آپ نے نعرہ لگایا تھا:

---

[3] وَمَنۡ يُّوۡقَ شُحَّ نَفۡسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ (الحشر۔۹)

[1] لِلۡفُقَرَآءِ الۡمُهٰجِرِيۡنَ الَّذِيۡنَ اُخۡرِجُوۡا مِنۡ دِيَارِهِمۡ وَاَمۡوَالِهِمۡ (سورہ حشر۔۸)

[2] قال بدمِ ھٰکذا فنضحه علی وجهه و راسه ثم قال فزت و رب الکعبه (بخاری شریف ص۵۸۷) اشارہ کر کے بتایا کہ خون کو اس طرح چلّو میں لیا اور اس کو چہرہ پر ڈالا سر پر چھڑکا اور کہا فزت ورب الکعبہ

"فزت ورب الکعبہ" (رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا)

(میں اپنی مراد کو پہنچ گیا) یہ پرتو تھا اس آرزو شہادت کا جس کے لئے سید الانبیاء کا قلب مبارک بیتاب رہا کرتا تھا۔ آپ فرمایا کرتے تھے میری تمنا ہے کہ راہ خدا میں قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں۔ [1]

حضرت عبد اللہ بن حبشی رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا: سب سے افضل جہاد کون سا ہے؟

ارشاد ہوا: "مذا هريق دمه و عقر جواده [2]" جس کا گھوڑا بھی مارا گیا اور خود اس کا خون بھی بہا دیا گیا۔

تزکیہ کا عجیب و غریب طریقہ:

مرض کے علاج کی یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ کسی مقوی خمیرہ سے بدن کی اصل طاقت کو بڑھا دیا جائے تو قوت غریزیہ مرض کو دور کر دیگی۔ شراب جو عرب کی گھٹی میں پڑی تھی اس کے انسداد کے لئے یہی طریقہ اختیار کیا گیا۔

وحی الٰہی ناطق ہوئی:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ (نساء۔ ۴۳)

"مسلمانو! (ایسا نہ کرو کہ تم نشہ کی حالت میں ہو اور نماز پڑھنی شروع کر دو) نشہ کی حالت میں تو نماز کے پاس بھی نہ جاؤ (نماز کے لئے ضروری ہے کہ) تم ایسی حالت میں ہو کہ جو کچھ زبان سے کہو ٹھیک طور پر اسے سمجھتے ہو۔"

یہ ارشاد ربانی خمیرہ مقوی تھا۔ نماز اور اپنے خالق کی بارگاہ میں سر نیاز خم کرنے کی عادت ہو چکی تھی ۔ شوق نماز نے شوق نشہ کو کافور کر دیا۔ شراب سے وحشت ہونے لگی۔ محفل میں دور اب بھی چلتا تھا۔ مگر دلوں کا سرور ختم ہو چکا تھا۔ اچانک حرمت شراب کا اعلان ہو گیا۔ تو نہ شراب باقی رہی نہ محفل شراب ۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ حضرت ابو عبیدہ بن الجراح، حضرت ابی بن کعب، حضرت ابو طلحہ (رضی اللہ عنہ) جیسے اکابر کی مجلس تھی۔ شراب کا دور چل رہا تھا۔ ساقی میں خود تھا۔ میں عمر میں بھی سب سے کم تھا۔ منادی کی آواز کانوں میں پڑی۔ مجھ کہا گیا: باہر نکل کر دیکھو آواز کیسی ہے۔ میں نے آواز سنی اور آکر کہا۔ اعلان ہو رہا ہے:

---

[1] بخاری شریف ص ۳۹۲،

[2] ابو داؤد شریف باب بعد باب فی فضل التطوع فی البیت ص ۲۱۱ و ص ۲۱۲۔ مجتبائی

"الاان الخمر قد حرمت" (آگاہ ہو جاؤ، شراب حرام کر دی گئی ہے)

میزبان محفل صاحب خانہ ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے فوراً فرمایا: "جاؤ مٹکے اندھا دو"

میں نے تعمیل کی۔ اب پورے مدینہ کی حالت یہ تھی کہ شراب گلیوں میں بہہ رہی تھی۔ جیسے ہی اعلان کانوں میں پڑا مٹکے اوندھے کر دیئے گئے، کسی نے اس تحقیق کی بھی ضرورت نہیں سمجھی کہ اعلان کون کر رہا ہے، کس بنا پر کر رہا ہے۔ ❶

تزکیہ کا عجیب و غریب نمونہ جینا وبال جان :

ایک مومن کامل ❷ سے زنا سرزد ہو گیا۔ دوسرے موقع پر یہی حرکت ایک مومنہ سے بھی سرزد ہو گئی۔ تلافی کا ایک راستہ یہ بھی تھا کہ پورے اخلاص کے ساتھ توبہ کر لیتے۔ ناامیدی کی کوئی وجہ نہیں تھی جب کہ ارشاد ربانی کا سہارا موجود تھا:

"اے میرے بندو، جنہوں نے زیادتی کی اپنے اوپر (گناہ کئے) ناامید مت ہو اللہ کی رحمت سے اللہ تعالیٰ سب گناہ بخش دیتا ہے۔" (الزمر۔ ۵۳)

مگر آئینہ کو مانجھنے سے بہتر یہی ہے کہ آئینہ ہی کو توڑ دیا جائے۔ وہ آئینہ ہی کیا جس پر دھبہ پڑ گیا۔ غور فرمایئے اس سے زیادہ تزکیہ کیا ہو سکتا ہے کہ خود اپنی جان وبال ہونے لگے۔ یہ صاحب ان کا نام ماعز تھا۔ ابن مالک۔ خدمت مبارک میں حاضر ہوئے۔ فریاد کر رہے تھے:

"یارسول اللہ طھرنی" (یارسول اللہ مجھے پاک کر دیجئے)

ارشاد ہوا: "ویحك ارجع فاستغفر اللہ وتب الیه" (بندہ خدا! جاؤ، استغفار کرو، توبہ کر لو)

یہ ارشاد سن کر کچھ چلے۔ مگر دل مضطر کا اضطراب ختم نہیں ہوا، پھر لوٹ کر آئے فریاد کرتے ہوئے:

"یارسول اللہ طھرنی" (یارسول اللہ مجھے پاک کر دیجئے)

آنحضرت ﷺ نے پھر واپس کر دیا۔ تین مرتبہ اسی طرح ان کو واپس کیا۔ مگر ان کے اضطراب نے ہر مرتبہ انہیں لوٹنے پر مجبور کیا تب چوتھی مرتبہ فرمایا: کس ناپاکی سے پاک کر دوں۔ عرض کیا یارسول اللہ میں نے زنا کیا ہے ❸۔ پھر آپ نے باقاعدہ چار مرتبہ اقرار کیا اس کے بعد رجم کا حکم صادر کیا گیا

---

❶ بخاری شریف ص ۶۶۴ و ص ۸۳۷،

❷ مسلم شریف ص ۶۷ ج ۲

❸ آپ نے یہ بھی فرمایا؛ تمہیں جنون تو نہیں ہو گیا ہے۔ تمہیں شراب کا نشہ تو نہیں ہے۔ حضرت ماعز نے انکار کیا اور اپنے اعتراف پر قائم اور پاک کرنے کے اصرار کرتے رہے۔ حضرت ماعز پھر بھی مرد تھے۔ ان سے زیادہ حیرت انگیز اور سبق

۔ چنانچہ ان کو سنگسار کر دیا گیا۔ مگر یہ جو پاک ہونے کے لئے مضطرب تھے اب ان کی پاکی ملاحظہ فرمایئے۔ انہیں ماعز کے متعلق آنحضرت ﷺ نے بشارت دی کہ ایسی توبہ کی ہے کہ اگر پوری امت پر بانٹ دی جائے تو سب کے لئے کافی ہو جائے۔

تزکیہ۔ جو بعثت مبارکہ کا اہم مقصد تھا اس کو کس طرح عمل کے پیرایہ میں جلوہ گر فرمایا: اس کی وضاحت کے لئے چند مثالیں کافی ہیں ان سے یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ یہ مقصد کس درجہ ہمہ گیر ہے۔

اس کتاب میں یا کسی ایک کتاب میں اس کے تمام شعبے بیان نہیں کئے جاسکتے۔

لہذا یہ کوشش لاحاصل ہے۔ البتہ اتنی تفصیل بیان کر دینی ضروری ہے جس سے شب و روز کی زندگی میں تزکیہ کا نقشہ اور تزکیہ والے کی ایک تصویر سامنے آجائے۔

رات دن میں جو کام انسان عادۃً کرتا ہے اور سونے جاگنے، کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے میں جو حالات سامنے آتے رہتے ہیں۔ اور گزرتے رہتے ہیں ان کے آداب کیا ہیں جن کی آنحضرت ﷺ نے تعلیم فرمائی۔ اور بندہ اور اس کے خالق کے تعلق کو کس طرح نمایاں فرمایا۔

آموز واقعہ قبیلہ غامد کی ایک خاتون کا ہے۔ اس نے آکر اسی طرح اعتراف کیا اور یہی اصرار کیا۔ طھرنی۔ مجھے پاک کر دیجئے۔ یہ حاملہ تھی۔ آپ نے فرمایا: پہلے ولادت سے فارغ ہو لو۔ جب بچہ ہو گیا تو پھر آئی اور اصرار کیا طھرنی۔ مجھے پاک کر دیجئے۔ آپ نے فرمایا: ابھی بچہ کو دودھ پلاؤ۔ دودھ چھوٹنے کے بعد پھر آئی۔ بچہ گود میں اور اسکے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا۔ اور یہی اصرار کہ مجھے پاک کر دیجئے۔ فرمایا: بچہ کا ذمہ دار کون ہو گا۔ ایک انصاری نے بچہ کا ذمہ لیا تب اس کو رجم کیا گیا۔ (مسلم شریف ص ۶۸ ج ۲) حیرت انگیز اور قابل قدر یہ ہے کہ یہ معاملہ خود اس کے اقرار پر تھا، شہادتوں سے اس کا ثبوت نہیں ہوا تھا تو جس مرحلہ پر بھی اعتراف کرنے والا مجرم اپنے جرم کا انکار کر دے اس پر حد نہیں جاری ہو گی۔ آنحضرت ﷺ نے یہ سوال کر کے کہ تمہیں جنون تو نہیں ہو گیا، تم نے نشہ تو نہیں پی رکھا۔ بار بار موقع دیا کہ وہ کسی طرح اپنے جرم کا انکار کر دے۔ اس خاتون کو ولادت پر دودھ پلانے تک کی مہلت دیکر انکار کر دینے کا موقع دیا۔ مگر حیرت ہوتی ہے ان کا ایمان اور اپنے ناپاک ہو جانے کا یقین اتنا مضبوط تھا کہ کسی صورت سے بھی اس میں جنبش نہیں ہوئی اور جس طرح پہلے اعتراف کے وقت اپنی زندگی کو وبال جان سمجھ رہے تھے، آخر تک وہ ان کو وبال ہی معلوم ہوتی رہی۔ مگر اس ایمان محکم کا یہ نتیجہ تھا کہ آنحضرت ﷺ نے جس طرح حضرت ماعز رضی اللہ عنہ کی توبہ کی تعریف کی تھی اس خاتون کے متعلق بھی فرمایا کہ ایسی توبہ کی ہے کہ بڑے سے بڑا ظالم بھی ایسی توبہ کرے تو بخشا جائے۔